MAHS103CCT

تاریخ نویسی

(قدیم اور وسطی عہد کی دنیا)

Historiography

(Ancient and Medieval World)

فاصلاتی اور روایتی نصاب پر مبنی خود اکتسابی مواد

ایم۔اے۔(پہلا سمسٹر)

تیسرا پرچہ

نظامت فاصلاتی تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

حیدر آباد، تلنگانہ، انڈیا - 032 500

© Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
Course: Historiography: Ancient and Medieval World
ISBN: 978-93-95203-34-0
Edition: December 2022

Publisher	:	Registrar, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
Publication	:	2022
Copies	:	1000
Copy Editing	:	*Vidya Vachaspati* Shaik Mahaboob Basha, History Programme Coordinator, DDE, MANUU, Hyderabad Dr. Syed Meer Abul Hussain, DDE, MANUU, Hyderabad Mr. Mohd Aasim, DDE, MANUU, Hyderabad
Cover Designing	:	Dr. Mohd Akmal Khan, DDE, MANUU, Hyderabad
Printer	:	Print Time and Bussiness Enterprises, Hyderabad

M.A. History

Historiography
(Ancient and Medieval World)
1st Semester

On behalf of the Registrar, Published by:
Directorate of Distance Education
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad-500 032 (Telangana State), India
Director: dir.dde@manuu.edu.in *Publication:* ddepublication@manuu.edu.in
Phone number: 040-23008314 Website: manuu.edu.in

© All rights reserved. No part of this publication may be reproduced or transmitted in any form or by any means, electronically or mechanically, including photocopying, recording or any information storage or retrieval system, without prior permission in writing from the publisher (registrar@manuu.edu.in).

مدیر اعلیٰ

Chief Editor

Prof. S.M. Azizuddin Husain
Former Head, Department of History & Culture
Jamia Millia Islamia, New Delhi
&
Maulana Azad Chair Professor
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad

پروفیسر سید محمد عزیزالدین حسین
سابق صدر، شعبہ تاریخ وثقافت
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی &
مولانا آزاد چیئر پروفیسر
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
حیدرآباد

مدیر

Editor

***Vidya Vachaspati* Shaik Mahaboob Basha**
Programme Coordinator – History
Directorate of Distance Education
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad

ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا
پروگرام کوآرڈی نیٹر — تاریخ
نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
حیدرآباد

مدیر زبان

Language Editor

Dr. Mohd Akmal Khan
Assistant Professor of Urdu (C) / Guest Faculty
Directorate of Distance Education
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad

ڈاکٹر محمد اکمل خان
اسسٹنٹ پروفیسر اردو (عارضی)/ گیسٹ فیکلٹی
نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
حیدرآباد

مجلس ادارت

Editorial Board

Prof. Perwez Nazir
Centre for Advanced Studies
Department of History
Aligarh Muslim University, Aligarh

پروفیسر پرویز نظیر
سینٹر فار ایڈوانسڈ اسٹڈیز، شعبہ تاریخ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

Prof. Alauddin Khan
Head, Department of History
Shibli National College, Azamgarh

پروفیسر علاؤالدین خان
صدر، شعبہ تاریخ
شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ

***Vidya Vachaspati* Shaik Mahaboob Basha**
Programme Coordinator – History
Directorate of Distance Education
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad

ودیاواچسپتی شیخ محبوب باشا
پروگرام کوآرڈی نیٹر – تاریخ
نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

Dr. Ahmad
PGT (History)
MANUU Model School
Hyderabad

ڈاکٹر احمد
پی جی ٹی (تاریخ)
مانو ماڈل اسکول، حیدرآباد

Dr. Syed Meer Abul Hussain
Assistant Professor of History (C) / Guest Faculty
Directorate of Distance Education
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad

ڈاکٹر سید میر ابوالحسین
اسسٹنٹ پروفیسر تاریخ (عارضی)/گیسٹ فیکلٹی
نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

Mr. Mohd. Aasim
Assistant Professor of History (C) / Guest Faculty
Directorate of Distance Education
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad

جناب محمد عاصم
اسسٹنٹ پروفیسر تاریخ (عارضی)/گیسٹ فیکلٹی
نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

پروگرام کوآرڈی نیٹر

ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا
اسسٹنٹ پروفیسر (تاریخ)، نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
حیدرآباد

مصنفین	اکائی نمبر
• جناب محمد عاصم	1،3،11
• ڈاکٹر سید میر ابوالحسین	2
• ڈاکٹر رمیز	4
• ڈاکٹر فیضان احمد	5،6
• ڈاکٹر محمد تعظیم	7،9،10،13
• جناب سعید احمد	8،15
• ڈاکٹر احمد	16
• ڈاکٹر اکرام الحق	12,14

پروف ریڈرس:

1. جناب محمد عاصم
2. ڈاکٹر سید میر ابوالحسین
3. ودیا واچسپتی شیخ محبوب باشا

فہرست

پیغام	وائس چانسلر	7
پیغام	ڈائرکٹر	8
کورس کا تعارف	پروگرام کوآرڈی نیٹر	9
بلاک – I	**قدیم تاریخ نویسی**	
اکائی 1	یونانی تاریخ نویسی	13
اکائی 2	رومی تاریخ نویسی	30
اکائی 3	چینی تاریخ نویسی	44
اکائی 4	کلہن کی راج ترنگنی کے حوالے سے قدیم ہندوستانی تاریخ نویسی	58
بلاک – II	**عہد وسطیٰ کی تاریخ نویسی**	
اکائی 5	عرب تاریخ نویسی	68
اکائی 6	فارسی تاریخ نویسی	87
بلاک – III	**عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ نویسی: دہلی سلطنت**	
اکائی 7	منہاج سراج: طبقات ناصری	106
اکائی 8	حسن نظامی اور عصامی	121
اکائی 9	امیر خسرو	134
اکائی 10	ضیاءالدین برنی	153
اکائی 11	علاقائی سلطنتوں کی تاریخ نویسی	170

بلاک – IV مغل تاریخ نویسی: مغل سلطنت

اکائی12	ابوالفضل	182
اکائی13	نظام الدین احمد	198
اکائی14	عبدالقادر بدایونی	212
اکائی15	شاہی خود نوشت سوانح عمریاں	227
اکائی16	مغل دور کے سفر نامے	241

نمونہ امتحانی پرچہ 268

پیغام

مولاناآزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی 1998 میں وطنِ عزیز کی پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت قائم کی گئی۔اس کے چار نکاتی مینڈیٹس یہ ہیں۔(1)اردو زبان کی ترویج و ترقی(2)اردو میڈیم میں پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم کی فراہمی(3)روایتی اور فاصلاتی تدریس سے تعلیم کی فراہمی اور(4)تعلیم نسواں پر خصوصی توجہ۔یہ وہ بنیادی نکات ہیں جو اِس مرکزی یونیورسٹی کو دیگر مرکزی جامعات سے منفرد اور ممتاز بناتے ہیں۔قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں بھی مادری اور علاقائی زبانوں میں تعلیم کی فراہمی پر کافی زور دیا گیا ہے۔

اُردو کے ذریعے علوم کو فروغ دینے کا واحد مقصد و منشا اُردو داں طبقے تک عصری علوم کو پہنچانا ہے۔ایک طویل عرصے سے اُردو کا دامن علمی مواد سے لگ بھگ خالی رہا ہے۔کسی بھی کتب خانے یا کتب فروش کی الماریوں کا سرسری جائزہ اس بات کی تصدیق کر دیتا ہے کہ اُردو زبان سمٹ کر چند ''ادبی'' اصناف تک محدود رہ گئی ہے۔یہی کیفیت اکثر رسائل و اخبارات میں دیکھنے کو ملتی ہے۔اردو میں دستیاب تحریریں قاری کو کبھی عشق و محبت کی پُر پیچ راہوں کی سیر کراتی ہیں تو کبھی جذباتیت سے پُر سیاسی مسائل میں اُلجھاتی ہیں، کبھی مسلکی اور فکری پس منظر میں مذاہب کی توضیح کرتی ہیں تو کبھی شکوہ و شکایت سے ذہن کو گراں بار کرتی ہیں۔تاہم اُردو قاری اور اُردو سماج دور حاضر کے اہم ترین علمی موضوعات سے نابلد ہیں۔چاہے یہ خود ان کی صحت و بقا سے متعلق ہوں یا معاشی اور تجارتی نظام سے، یا مشینی آلات ہوں یا ان کے گرد و پیش ماحول کے مسائل ہوں، عوامی سطح پر اِن شعبہ جات سے متعلق اردو میں مواد کی عدم دستیابی نے عصری علوم کے تئیں ایک عدم دلچسپی کی فضا پیدا کر دی ہے۔یہی وہ مبارزات (challenges) ہیں جن سے اُردو یونیورسٹی کو نبرد آزما ہونا ہے۔نصابی مواد کی صورت حال بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔اِسکولی سطح پر اُردو کتب کی عدم دستیابی کے چرچے ہر تعلیمی سال کے شروع میں زیر بحث آتے ہیں۔چوں کہ اُردو یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اُردو ہے اور اس میں عصری علوم کے تقریباً سبھی اہم شعبہ جات کے کورسز موجود ہیں لہٰذا اِن تمام علوم کے لیے نصابی کتابوں کی تیاری اِس یونیورسٹی کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔انہیں مقاصد کے حصول کے لیے اردو یونیورسٹی کا آغاز فاصلاتی تعلیم سے 1998 میں ہوا تھا۔

مجھے اِس بات کی بے حد خوشی ہے کہ اس کے ذمہ داران بشمول اساتذہ کرام کی انتھک محنت اور ماہرین علم کے بھرپور تعاون کی بنا پر کتب کی اشاعت کا سلسلہ بڑے پیمانے پر شروع ہو گیا ہے۔فاصلاتی تعلیم کے طلباء کے لیے کم سے کم وقت میں خود اکتسابی مواد اور خود اکتسابی کتب کی اشاعت کا کام عمل میں آ گیا ہے۔پہلے اور دوسرے سمسٹر کی کتب شائع ہو کر طلباء و طالبات تک پہنچ چکی ہیں۔تیسرے سمسٹر کی کتابیں بھی جلد طلباء تک پہنچیں گی۔مجھے یقین ہے کہ اس سے ہم ایک بڑی اردو آبادی کی ضروریات کو پورا کر سکیں گے اور اِس یونیورسٹی کے وجود اور اِس میں اپنی موجودگی کا حق ادا کر سکیں گے۔

پروفیسر سید عین الحسن

وائس چانسلر

پیغام

فاصلاتی طریقۂ تعلیم پوری دنیا میں ایک انتہائی کار گر اور مفید طریقۂ تعلیم کی حیثیت سے تسلیم کیا جاچکا ہے اور اس طریقۂ تعلیم سے بڑی تعداد میں لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی نے بھی اپنے قیام کے ابتدائی دنوں ہی سے اردو آبادی کی تعلیمی صورت حال کو محسوس کرتے ہوئے اِس طرزِ تعلیم کو اختیار کیا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا آغاز 1998 میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم اور ٹرانسلیشن ڈِویژن سے ہوا اور اس کے بعد 2004 میں باقاعدہ روایتی طرز تعلیم کا آغاز ہوا اور بعد ازاں متعدد روایتی تدریس کے شعبہ جات قائم کیے گئے۔ نو قائم کردہ شعبہ جات اور ٹرانسلیشن ڈِویژن میں تقرریاں عمل میں آئیں۔ اس وقت کے اربابِ مجاز کے بھرپور تعاون سے مناسب تعداد میں خود مطالعاتی مواد تحریر و ترجمے کے ذریعے تیار کرائے گئے۔

گزشتہ کئی برسوں سے یو جی سی۔ ڈی ای بی UGC-DEB اس بات پر زور دیتا رہا ہے کہ فاصلاتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات کو روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات سے کماحقہ ہم آہنگ کر کے نظامتِ فاصلاتی تعلیم کے طلبا کے معیار کو بلند کیا جائے۔ چوں کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی فاصلاتی اور روایتی طرزِ تعلیم کی جامعہ ہے، لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لیے یو جی سی۔ ڈی ای بی کے رہنمایانہ اصولوں کے مطابق نظامتِ فاصلاتی تعلیم اور روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات کو ہم آہنگ اور معیار بلند کر کے خود اکتسابی مواد SLM از سرِ نو بالترتیب یو جی اور پی جی طلبا کے لیے چھ بلاک چوبیس اکائیوں اور چار بلاک سولہ اکائیوں پر مشتمل نئے طرز کی ساخت پر تیار کرائے جا رہے ہیں۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم یو جی، پی جی، بی ایڈ، ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ کورسز پر مشتمل جملہ پندرہ کورسز چلا رہا ہے۔ بہت جلد تکنیکی ہنر پر مبنی کورسز بھی شروع کیے جائیں گے۔ متعلمین کی سہولت کے لیے 9 علاقائی مراکز بنگلورو، بھوپال، دربھنگہ، دہلی، کولکاتا، ممبئی، پٹنہ، رانچی اور سری نگر اور 5 ذیلی علاقائی مراکز حیدرآباد، لکھنؤ، جموں، نوح اور امراوتی کا ایک بہت بڑا نیٹ ورک تیار کیا ہے۔ ان مراکز کے تحت سرِ دست 155 متعلم امدادی مراکز (Learner Support Centre) کام کر رہے ہیں، جو طلبا کو تعلیمی اور انتظامی مدد فراہم کرتے ہیں۔ نظامت فاصلاتی تعلیم نے اپنی تعلیمی اور انتظامی سرگرمیوں میں آئی سی ٹی کا استعمال شروع کر دیا ہے، نیز اپنے تمام پروگراموں میں داخلے صرف آن لائن طریقے ہی سے دے رہا ہے۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم کی ویب سائٹ پر متعلمین کو خود اکتسابی مواد کی سافٹ کاپیاں بھی فراہم کی جا رہی ہیں، نیز جلد ہی آڈیو۔ ویڈیو ریکارڈنگ کا لنک بھی ویب سائٹ پر فراہم کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ متعلمین کے درمیان رابطے کے لیے ایس ایم ایس کی سہولت فراہم کی جا رہی ہے، جس کے ذریعے متعلمین کو پروگرام کے مختلف پہلوؤں جیسے کورس کے رجسٹریشن، مفوضات، کونسلنگ، امتحانات وغیرہ کے بارے میں مطلع کیا جاتا ہے۔

امید ہے کہ ملک کی تعلیمی اور معاشی حیثیت سے پچھڑی اردو آبادی کو مرکزی دھارے میں لانے میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم کا بھی نمایاں رول ہوگا۔

پروفیسر محمد رضاءاللہ خان
ڈائرکٹر، نظامت فاصلاتی تعلیم

کورس کا تعارف

عزیز متعلمین ! ''قدیم اور عہد وسطیٰ کی دنیا میں تاریخ نویسی'' کورس کے مطالعے میں خوش آمدید۔ تاریخ نویسی، تاریخ لکھنے کا طریقہ اور سائنس ہے۔ دنیا کی مختلف تہذیبوں نے اپنے اپنے انداز میں ماضی کا احساس پیدا کیا اور انہوں نے مختلف ذرائع اور وسائل سے تاریخ کو دستاویزی شکل دی۔ اس کورس میں آپ سمجھیں گے کہ یونانیوں، رومیوں اور چینیوں نے قدیم دور میں کس طرح تاریخ لکھی اور آپ ان میں یکسانیت اور اختلافات کو پہچانیں گے۔ برطانوی نوآبادیاتی حکمراں اس غلط فہمی میں تھے کہ ہندوستانیوں میں تاریخ کا احساس ہی نہیں تھا۔ یہ الزام سراسر غلط ہے اور ایک تہذیب کے طور پر ہندوستان، 'راج ترنگنی' سے بہت پہلے ہی تاریخ کا اپنا نظریہ اور زاویہ فکر تیار کر چکا تھا اور اس کورس میں اس بات کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔ آپ یہ سیکھیں گے کہ تاریخ نویسی کی عرب اور فارسی روایات کیسے ابھریں اور دہلی سلاطین اور مغلوں کے دور میں ہندوستان میں تاریخ کیسے لکھی گئی اور کیسے اسے دستاویزی شکل دی گئی۔ ساتھ ہی یہ کہ عہد وسطی میں لکھی گئی خود نوشت سوانح عمریاں کس حد تک تاریخ پر مشتمل تھیں۔

حالیہ دور تک، تاریخ کو بادشاہوں اور شہنشاہوں کے عظیم کارناموں/بداعمالیوں کے طور پر سمجھا جاتا تھا۔ ملکائیں بھی زیادہ تر اپنے عظیم مردوں کے تعلق کی وجہ سے ظاہر ہوئیں۔ دوسرے لفظوں میں، تاریخ کو بادشاہوں اور ریاستوں، شہنشاہوں اور سلطنتوں، کے ناموں کی ایک لمبی فہرست سمجھا جاتا تھا۔ اس میں ان کے ذریعے لڑی جانے والی جنگوں اور ان کی محبوباؤں وغیرہ کا تذکرہ بھی شامل تھا۔ مختصراً، تاریخ کا مطلب سیاسی تاریخ تھا اور بدقسمتی سے یہ سوچ عام لوگوں کے ذہنوں پر ابھی بھی حاوی ہے۔ عام لوگ، محنت کش عوام، جو اصل تاریخ ساز تھے، شاید ہی کبھی تاریخ کے ڈرامے میں نظر آئے۔ لیکن، اب تاریخ کے بارے میں نقطہ نظر بڑی حد تک تبدیل ہو چکا ہے اور اسی لیے تاریخ لکھنے کا طریقہ بھی بدل گیا ہے۔ عام لوگ بشمول مرد و خواتین، نے تاریخ میں اپنے حصے کا دعویٰ کرنا شروع کر دیا ہے۔ اب تاریخ کی توجہ حکمرانوں سے رعایا کی طرف منتقل ہو رہی ہے۔ جیسا کہ تیلگو شاعر سری سری (سری رنگم سری نواس راؤ) نے اپنی نظم میں مناسب طریقے سے بیان کیا ہے، اب مورخین اس کی کھوج کرنا چاہتے ہیں اور "تاریخ کے اندھیرے میں دبی پڑی سب کہانیوں پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ وہ پوچھنے لگے کہ دریائے نیل کی تہذیب میں عام زندگی کیسی تھی اور تاج محل کی تعمیر میں پتھر ڈھونے والے قلی کون تھے اور سلطنتوں کے باہمی جنگوں میں عام لوگوں کی بہادری کیسی تھی۔ نا وہ ڈولی گنتی کی تھی چڑھ بیٹھا جس پر راجا، اس کے واہک کلی کون تھے؟'' یہ بے حد ضروری ہے کہ تاریخ کا مطالعہ عام لوگوں کے نقطۂ نظر سے کیا جائے۔ مشہور ادیب جارج اورویل نے تاریخ کو مختصر الفاظ میں بیان کرتے ہوئے کہا کہ: "جو ماضی کو قابو کرتے ہیں وہی مستقبل کو قابو کرتے ہیں: جو حال کو قابو کرتے ہیں وہی ماضی کو قابو کرتے ہیں۔" ممتاز مورخ پروفیسر کے ایس شیشن نے زور دیا کہ "تاریخ کا معاشرے سے وہی رشتہ ہے جو یادداشت کا فرد سے ہے۔ ودیاواچسپتی ایس ایم باشا کے مطابق جو ماضی کو اچھے سے سمجھتے ہیں، وہ حال کو بہترین طریقے سے سمجھ سکتے ہیں؛ اور اسی طرح ماضی کو اچھے ڈھنگ سے سمجھنے کے لیے حال کا گہرا علم ضروری ہے۔

UGC-DEB کی ہدایات کے مطابق، نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے سیلف لرننگ مٹیریل لکھنے کے لیے بہترین مصنفین کو راغب کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ امید ہے کہ یہ نہ صرف آپ کی تعلیمی کارکردگی کے لیے کارآمد ثابت ہوگا بلکہ مختلف مسابقتی امتحانات کو اعتماد کے ساتھ دینے کے قابل بھی بنائے گا۔ ہم شعبہ تاریخ، نظامت فاصلاتی تعلیم میں، آپ کی خدمت کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔ کورس میں ایک بار پھر خوش آمدید اور میں آپ کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرتا ہوں۔

ودیاواچسپتی شیخ محبوب باشا

پروگرام کوآرڈی نیٹر

تاریخ نویسی

(قدیم اور وسطی عہد کی دنیا)

Historiography

(Ancient and Medieval World)

اکائی 1۔یونانی تاریخ نویسی

(Greek Historiography)

اکائی کے اجزا

1.0 تمہید

1.1 مقاصد

1.2 ماقبل کلاسیکی یونان اور تاریخ نویسی کا پس منظر

1.3 کچھ اہم ماقبل کلاسیکی یونان کے مفکرین

1.3.1 ہومر

1.3.2 زنوفنیس

1.3.3 ہیکاٹس

1.3.4 ہیلنکس

1.4 یونانی تاریخ نویسی پر اثرات

1.4.1 فکری منتقلی کا دور

1.4.2 ایونیا کی برتری

1.4.3 ایک نسلی جغرافیائی ادب کی ارتقا

1.4.4 مختصر وقائع نگار

1.4.5 جنگی عوامل

1.5 تاریخ نویسی کا آغاز اور کلاسیکی یونان کے مورخین

1.5.1 ہیروڈوٹس

1.5.2 تھوسی ڈائڈیز

1.5.3 زینوفون

1.5.4 افیورس

1.5.5 تھیوپومپوس
1.5.6 پولی بیس
1.5.7 پلوٹارک
1.6 اکتسابی نتائج
1.7 کلیدی الفاظ
1.8 نمونہ امتحانی سوالات
1.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
1.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
1.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
1.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1.0 تمہید (Introduction)

کلنگ ووڈ نے مشاہدہ کیا کہ زندگی اور علم کے بارے میں یونانی رویے میں ایک اہم تاریخ نواز عنصر موجود تھا جس نے یونانی مابعد الطبیعیات کے تاریخ مخالف رجحان کو تاریخ نویسی کے قابل بنایا۔ یونانی ایسے دور میں رہتے تھے جب تاریخ غیر معمولی تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی اور ایک ایسے ملک میں جہاں غیر معمولی تشدد کے ساتھ زلزلوں اور زمین کے کٹاؤ نے زمین کا چہرہ بدل دیا تھا۔ تیز رفتار تبدیلیوں کے اس سلسلے نے یونانی فکر کو 'تاریخ کے لیے ایک عجیب حساسیت' عطا کی۔ یونانی جانتے تھے کہ ماضی میں ایسی تبدیلیاں ضرور آئی ہوں گی جنہوں نے حال کو وجود میں لایا تھا۔ اگرچہ یونانی فلسفہ ابدیت کی تلاش میں مصروف تھا، لیکن اس میں دنیاداری کا واضح احساس موجود تھا۔

قدیم یونانیوں نے مزید سوچا کہ انسانی زندگی میں تبدیلیاں اور خود تاریخ میں ایک خاص روش کی پیروی کرتی ہیں۔ ہربرٹ بٹر فیلڈ لکھتے ہیں کہ یونانیوں نے تاریخ کو ایک خاص نقطے تک ترقی پاکر عروج پر پہنچتے ہوئے اور پھر زوال یا خاتمے کے طور پر تصور کیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح کے بہت سے اتار چڑھاؤ آئے ہوں گے کہ تہذیب کو بار بار تقریباً ابتدا ہی سے شروع ہونا پڑا۔ اسی وجہ سے یونانی فلسفے نے آسانی سے تاریخ کے گردشی نظریے کو تسلیم کر لیا۔

تاریخ کا 'گردشی نظریہ' تاریخ مخالف ہے کیونکہ یہ مانتا ہے کہ تاریخ نے اپنے آپ کسی طرح دہرایا ہے۔ یونانیوں میں یہودیوں کی طرح اس احساس کی کمی تھی کہ پوری کائنات کسی عظیم انجام کی طرف بڑھ رہی ہے، نہ ہی وہ اس جدید احساس سے واقف تھے کہ وقت خود ہی ترقی کا باعث ہے۔

گردشی نقطہ نظر سے شاید قدیم یونانیوں نے تاریخ کی اپنی عملی قدر کا تصور کیا۔ عملی نقطہ نظر میں تاریخ مثالوں یا اسباق کا ایک ذخیرہ ہے جو حال اور مستقبل میں کارآمد ثابت ہو سکتی ہے کیونکہ تاریخ اپنے آپ کو کافی حد تک دہراتی ہے۔ کوئی بھی چیز جو دہرائی جاتی ہے اس کی پیشین گوئی کی جاسکتی ہے (مثال کے طور پر، ایک حادثہ) اور اس سے بچا جاسکتا ہے۔ یونانیوں میں انسانی زندگی کی ایک خاص قدر تھی۔ قابل ذکر واقعات کی تاریخ اندازوں کی بنیاد پر لکھی جاتی ہے، جو سائنس کی طرح یقینی نہیں بلکہ ممکن ہے۔ یہ نہیں کہ کیا ہوگا بلکہ کیا ہونے کا امکان ہے۔

تاریخ کا ایسا تصور، کلنگ ووڈ کے مطابق، جبری نہیں بلکہ انسان دوست ہے۔ یونانیوں نے تاریخ کے دھارے کو لچکدار سمجھا اور انسانی مضبوط عزم کے ذریعے اسے تبدیلی کے لیے کھلا رکھا۔ ان کے نزدیک کچھ بھی ناگزیر نہیں تھا۔ یونانیوں کے پاس انسان کی اپنی تقدیر کو کنٹرول کرنے کی طاقت کا ایک جاندار اور واقعی سادہ احساس تھا اور وہ اس طاقت کو صرف اپنے علم کی حد تک محدود سمجھتے تھے۔ انسان کے بارے میں یہ نظریہ کہ وہ اپنی تقدیر کو خود ڈھالنے کے قابل ہے، انسان پرستی ہے جبریت پسندی نہیں۔

یونانیوں سے پہلے سب سے قدیم یادداشتیں مصریوں بابلیوں اشوریوں اور عبرانیوں کی ہیں۔ تاریخ کی ان کتابوں کا انداز ناصحانہ تھا۔ یونانیوں کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے دوسروں سے علم حاصل کر کے اس میں تحقیق و تفتیش کی اور اسے آگے بڑھایا اور اس میں کمال حاصل کیا۔ تاریخ کے میدان میں یونانی مورخوں کا انداز مشرق کے ان وقائع نگاروں سے بالکل جداگانہ تھا۔ اس عہد کے چین، مشرق بعید اور ہندوستانی اقوام کی تاریخ نویسی کے بارے میں ہماری معلومات بہت محدود ہیں۔ ہندوستان میں تو یقیناً سیاسی تاریخ نویسی کا آغاز سکندر کے ہندوستان پر حملے کے بعد ہوا مگر یہودیوں کے یادداشت لکھنے کا دور اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ اہل یونان کی تاریخ نویسی کا ہے۔ البتہ فن تاریخ نویسی میں تحقیق کا عنصر یونانیوں کی دین ہے۔

1.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- ماقبل کلاسیکی یونان میں تاریخ نویسی کے پس منظر کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- رزمیہ نظموں، داستانوں اور اساطیروں کے بارے میں جان سکیں گے۔
- لوگو گرافرس کون تھے اور یونانی تاریخ نویسی پر ان کے اثرات کا جائزہ لے سکیں گے۔
- کلاسیکی یونان میں تاریخ نویسی کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- ہیلینی دور کے یونان کی تاریخ نویسی کو سمجھ سکیں گے۔
- یونانی تاریخ نویسی کے خاتمے اور رومی تاریخ نویسی کے آغاز کو نشان زد کر سکیں گے۔

1.2 ماقبل کلاسیکی یونان کی تاریخ نویسی کا پس منظر

(Background to Pre-Classical Greek Historiography)

ہربرٹ بٹر فیلڈ (Herbert Butterfield) نے مغرب میں قبل کلاسیکی زمانے میں بنیادی طور پر تین قسم کی تصانیف کو تذکرہ کیا ہے جن کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ کسی نہ کسی قسم کی تاریخی معلومات پر مشتمل ہے: 1۔ بلاڈ اور تاریخی داستانیں 2۔ حکمرانوں کی یادگاری تاریخیں 3۔ عبرانی صحیفے۔ حیوانوں کے درمیان صرف انسان ہی اپنے ماضی کے تجربے کو یاد کرتا ہے اور اسے یادداشت میں محفوظ کرتا ہے۔ لیکن ایک معاشرہ، ایک فرد کے برعکس، نامیاتی یادداشت نہیں رکھ سکتا۔

ایک قدیم معاشرے کا اپنے ماضی کے تجربات کے بارے میں علم صرف اس کے اپنے ارکان کے درمیان سنائی جانے والی کہانیوں کے ذریعے ہوتا تھا۔ ایسی کہانیاں، جب دہرائی جاتی رہیں تو وہ قبیلے کی روایت بن گئی تھیں اور انہیں مقامی بلاڈ میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ طویل عرصے تک اس طرح کی داستانوں کی زبانی ترسیل سے ان میں افسانوی مادے کے اضافہ ہوا اور تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ کچھ بلاڈ کو ایک داستان میں ترتیب دیا گیا، جیسے قدیم بابلیوں میں گلگامیش یا یونانیوں میں ایلیاڈ۔ پیشہ ور کہانی سنانے والوں یا گویوں کے ذریعے منتقل کیا جانے والے بلاڈ اور عظیم رزمیے ہماری موجودہ سمجھ کے مطابق اگرچہ تاریخ نہیں ہیں لیکن انہوں نے ماضی میں دلچسپی پیدا کرنے اور ایک بیانیہ تکنیک فراہم کرنے کا کام کیا۔

قدیم زمانے میں تاریخی ساخت کی ایک اور قسم مصری، ہٹی اور اشوری جیسی عظیم سلطنتوں کے حکمرانوں کے لیے تیار کردہ تاریخی وقائع ہیں۔ محلات اور مندروں کی دیواروں پر کندہ یہ وقائع ہمیں بادشاہوں کی مختلف سرگرمیوں کے بارے میں بتاتے ہیں لیکن بنیادی طور پر یہ ان کی فوجی کامیابیوں سے متعلق ہیں۔ اس طرح کی تاریخیں یادگاری قسم کی تاریخ کی نمائندگی کرتی ہیں جن میں حطیوں کے وقائع ہی سب سے ممتاز تھے۔

تاریخ کی ایک زیادہ مستند قسم قدیم سمیریوں اور مصریوں کی شاہی خاندانوں کی فہرستیں ہیں۔ اگرچہ یادگاری دستاویزات میں مبالغہ آرائی بڑی حد تک موجود ہو سکتی ہے، لیکن حکمرانوں کی فہرستوں میں گھٹانے بڑھانے کی گنجائش کافی کم ہوتی ہے۔ پہلی بابلی سلطنت کی فہرست میں سالوں کا نام، ہر سال کے لیے ایک واقعے کے طور پر کسی نہ کسی واقعے کے نام پر رکھا گیا۔ اس طرح کی 'تاریخ وار فہرستوں' کو قرون وسطی کے تاریخی روزنامچوں کا پیشرو سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ قدیم آشوری خوبصورت اور عالیشان ابھری ہوئی نقشی تصاویر (relief) تصاویری تاریخ کی بہترین مثالیں پیش کرتے ہیں۔

تمام قدیم قبائل کی طرح، قدیم عبرانیوں نے صدیوں سے اپنے بچوں کو کہانیاں سنائیں، گانے گائے اور متعلقہ عہد کے مشہور افسانے سنائے۔ اس طرح، کم از کم حضرت داؤدؑ کے زمانے (1000 قبل مسیح) سے ایک مسلسل زبانی روایت دکھائی دیتی ہے جس میں افسانہ اور تاریخ کے درمیان کچھ واضح تقسیم کی جاسکتی ہے۔ یہی زبانی روایت، قدیم عبرانیوں کی کتاب توراۃ (پرانا عہد نامہ) کی بنیاد بنی۔ بھلے ہی بنیادی طور پر یہ

تاریخی مقاصد کے لیے نہیں ہیں مگر اس کے باوجود ان میں تاریخی معلومات کی ایک بہت بڑی مقدار موجود ہے۔ عبرانی صحیفوں کی 39 کتابوں میں سے، 17 میں واضح طور پر تاریخی معلومات درج ہے اور پانچ بڑی اور بارہ چھوٹی پیغمبروں کی سوانح بڑی حد تک ایسی ہی ہیں۔ قدیم عبرانیوں نے سب سے پہلے قومی تاریخ کی طرز کی تصنیف چھوڑی اور نسل انسانی کی تاریخ کو ابتدائے آفرینش سے بیان کرنے کی کوشش کی جسے وہ 'تخلیق' سمجھتے تھے. انہوں ہی سب سے پہلے عالمگیر تاریخ کا تصور بھی پیش کیا تھا۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان تصانیف (بلاڈاور عظیم داستانیں، تاریخی وقائع اور شاہی خاندانی فہرستیں اور عبرانی صحیفوں) کو تاریخ کے طور پر شمار کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔

آر جی کلنگ ووڈ کا کہنا ہے کہ حقیقی تاریخ میں چار خصوصیات ہونی چاہیے۔

- پہلی یہ کہ تاریخ ایک سائنس ہے۔ سائنس ایسی چیزوں کو دریافت کرنے پر مشتمل ہے جو ہم نہیں جانتے۔ مثال کے طور پر سورج کی شعاعوں کی کیمیائی ساخت کینسر کی وجہ ہے۔ اس لحاظ سے تاریخ ایک سائنس ہے کیونکہ اس کا آغاز معلوم حقائق سے نہیں ہوتا بلکہ ان کو دریافت کرنے کی کوششوں سے ہوتا ہے، مثلاً انگلینڈ میں پارلیمنٹ کی ابتدا یا ہندوستان میں ذات پات کے نظام کی ابتدا۔
- تاریخ کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسان دوست ہے اور ہر علم کا چونکہ کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے، اسی طرح علم تاریخ کا مقصد انسانوں کے ماضی میں کیے گئے اعمال کا پتہ لگانا ہے۔
- تیسری یہ کہ ہر علم میں تحقیقات کا طریقہ کار ہوتا ہے۔ تاریخ دستاویزی شکل میں ثبوتوں کی وضاحت کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتی ہے۔
- چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ ہر انسانی کوشش کے پیچھے ایک مقصد ہوتا ہے اور علم تاریخ کا مقصد انسان کا خود کو پہچاننا ہے۔

تاریخ کی قدر یہ ہے کہ وہ ہمیں سکھاتی ہے کہ انسان نے کیا کیا؟ اور اس طرح جو انسان ہے وہ ''تاریخ ہے'' جیسا کہ ڈورسن (Doryson) کے مطابق ''انسانیت کا اپنے بارے میں علم'' تاریخ ہے۔

کلنگ ووڈ کا خیال ہے کہ موجودہ دور کے نقطہ نظر سے چار ہزار سال پہلے مثال کے طور پر سمیریوں میں حقیقی تاریخ کا وجود نہیں تھا۔ سمیریوں کے تقریباً 2500 سال ق م کے ایک سرکاری کتبے کی مثال دیتے ہوئے، اس کا دعویٰ ہے کہ

درج شدہ حقائق، اگرچہ بعض اعتبار سے تاریخ سے مشابہت رکھتے ہیں، تاہم وہ تاریخ نہیں سمجھے جاتے، کیوں کہ یہ درج شدہ حقائق باقاعدہ علم یا سائنس کی خصوصیات سے محروم ہیں کیونکہ وہ متعدد سوالات کے واضح جوابات فراہم نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ یہ حقائق انسانی اعمال سے متعلق نہیں ہیں، بلکہ دیوتاؤں کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ اس میں استعمال شدہ طریقہ کار غیر تاریخی ہے، کیونکہ اس میں شواہد کی کوئی تشریح نہیں کی گئی ہے۔ بہر کیف دستاویز کو اس کے استعمال یا قدر کے لحاظ سے تاریخی قرار نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ اس کا مقصد انسان کے بارے میں انسان کا علم نہیں ہے، بلکہ انسان کا دیوتاؤں کے بارے میں جاننا ہے۔ کلنگ ووڈ کے مطابق ''قدیم سمیریوں نے اپنے پیچھے ایسا کچھ بھی نہیں چھوڑا جسے ہم تاریخ کہنا چاہیے۔ اگر ان کے پاس تاریخی شعور جیسی کوئی چیز تھی تو انہوں نے اس کا کوئی بھی ریکارڈ نہیں چھوڑا۔'' ان کا کہنا ہے کہ دستاویز میں درج حقائق کو نیم تاریخ (quasi-History) کہا جاسکتا ہے، کیونکہ وہ ماضی کے بارے بیانات کے سبب تاریخ سے

مشابہت رکھتے ہیں۔اس قسم کی تاریخ الوہی تاریخ (Theocratic History) کہلاتی ہے۔

نیم تاریخ کی ایک اور قسم ہے جسے اساطیری داستان (Myth) یا 'دیومالا' کہا جاتا ہے۔اس کی مثالیں بھی ہمیں میسوپوٹامیائی، مصری، چینی اور ہندوستانی ادب میں ملتی ہیں۔دیومالاؤں کا انسانی اعمال سے کوئی تعلق نہیں ہے۔یہ الوہی یا دیوتائی نوعیت کی ہیں، جس کی اچھی مثال تخلیق سے متعلق بابل کی نظم ہے۔اس طرح دیکھا گیا کہ ماقبل کلاسیکی تصنیفات جیسے بلاڈ، تاریخی وقائع اور شاہی خاندانوں کی فہرستیں اور عبرانی صحیفوں کا تعلق نیم تاریخ کی دو اقسام الوہی تاریخ یا دیومالاؤں میں سے ایک سے ہے۔کلنگ ووڈ لکھتا ہے کہ یونان کے عروج تک ان دو قسموں کا پورے مشرق وسطیٰ پر غلبہ رہا۔نویں صدی قبل مسیح کا موآبی پتھر، الوہی تاریخ کی ایک بہترین دستاویز ہے جو کہ ظاہر کرتا ہے کہ اس طویل وقفے کے دوران بہت کم تبدیلی واقع ہوئی تھی۔

1.2.1 یونانیوں کی مشکلات (Difficulty of the Greeks)

مغرب میں تمام تاریخی تحریروں کی بنیاد ہیروڈوٹس اور تھوسی ڈائڈیز کی تصنیفات سے پڑی ہے جن کے ذریعے الوہی تاریخ اور دیومالاؤں سے حقیقی تاریخی ادب کی طرف فیصلہ کن تبدیلی واقع ہوئی۔ان کی تصانیف کے ذریعے تاریخ نویسی کی راہ میں دو بڑی رکاوٹوں کا بھی خاتمہ ہوا۔ان میں پہلی رکاوٹ سابقہ تاریخ کے بارے میں تقریباً مکمل لاعلمی تھی اور دوسری غیر تاریخی مابعد الطبیعیات یا دیومالائی داستانیں تھی۔کلاسیکی یونانیوں سے پہلے ہومر کے عہد سے بھی پہلے ایک شاندار تہذیب تھی جسے ہم مائیسینی (Mycenaen) تہذیب کہتے ہیں لیکن اس تہذیب کے بارے میں یونانیوں کو بہت کم علم تھا۔یونانی تاریخ کے بارے میں ٹرائے کی جنگ سے وہ شاید ہی کچھ جانتے تھے اور انہوں نے کوئی بھی دستاویز تیار کرنے میں حیران کن طور پر دیر کر دی۔یہودی مصنف جوزیفس نے پہلی صدی عیسوی میں یونانیوں کو ان کمیوں کے لیے سخت سست کہا تھا۔مزید یہ کہ جیسا کہ کلنگ ووڈ بیان کرتے ہیں، قدیم یونانی فکر، مجموعی طور پر تاریخی فکر کی نشوونما کے لیے مناسب نہیں تھی، کیونکہ یہ سختی سے غیر تاریخی مابعد الطبیعات پر مبنی تھی۔

تاریخ ایک ایسا علم ہے جو ماضی میں انسانی اعمال سے متعلق ہے۔ماضی میں انسانی اعمال کا تعلق تبدیلی کی دنیا سے ہے، ایک ایسی دنیا جہاں چیزیں بنتی ہیں اور ختم ہو جاتی ہیں۔اس طرح کی چیزیں، مروجہ یونانی دیومالائی نظریے کے مطابق جاننے کی کوئی ضرورت نہیں اور اس لیے تاریخ نویسی ناممکن ہو جاتی ہے۔

حقیقی علم کی چیز متعین، مستقل اور اس کا اپنا ایک کردار ہونا چاہیے۔یہ حقیقت پسندی (Substantialism)، تاریخ نویسی سے ایک دم مخالفت رکھتی تھی۔جو چیزیں عارضی ہوتی ہیں ان میں درج بالا خصوصیات نہیں ہوتیں۔چونکہ ماضی میں انسانی اعمال کا تعلق بدلتی ہوئی عارضی چیزوں سے ہے اس لیے ذہن کو سمجھنے کے لیے ان میں کوئی اہم بات نہیں رہ جاتی۔حقیقی علم کو نہ صرف یہاں اور اب، بلکہ ہمیشہ اور ہر جگہ اچھا ہونا ضروری ہے اور علم تاریخ اس کردار میں حصہ نہیں لے سکتا۔

1.3 کچھ اہم ماقبل کلاسیکی یونان کے دانشور (Some Pre-Classical Greek Scholars)

1.3.1 ہومر (Homer)

نویں صدی ق م میں ہومر دنیا کا سب سے بڑا رزمیہ شاعر تھا۔ افلاطون کا کہنا ہے لوگ اس کو 'یونان کے استاد' کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ ہومر کی 'الیاڈ' (Iliad) اور 'اوڈیسی' (Odyssey) یونانی ادب کی اولین مثالوں میں شامل ہیں۔ ان دونوں کتابوں کا اسلوب سادہ اور وسیع ہے۔ نوعیت اور لب ولہجہ کے اعتبار سے 'الیاڈ' ایک تاریخی نظم ہے۔ وہ ایک مربوط اور نہایت منظم رزمیہ داستان ہے۔ اس کے مقابلے میں 'اڈیسی' سحر و جادو گری، عشقیہ حکایات اور اخلاق اور توہمات سے بھرپور ہے اور سماجی زندگی کی بہتر ترجمانی کرتی ہے۔ یہ تصنیفات تہذیب و شائستگی کی ایک برتر منزل اور شہری زندگی کے آغاز کو ظاہر کرتی ہے۔ دونوں کتابوں کا انداز بیان ایک ہے اور ان میں قدیم یونانی تمدن کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔ ان کی بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ لوہے کے ہتھیاروں کا زمانہ تھا۔ یہ یونانی تہذیب و شائستگی کے اس دور سے متعلق ہیں جس کو ماقبل تاریخ زمانے کا آخری حصہ سمجھا جاتا ہے۔

ہومر کی رزمیہ نظموں کو دراصل تاریخ کی ابتدائی شکل تصور کرنا چاہیے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہیروڈوٹس اور تھیوی ڈائڈیز جیسے کلاسیکی مورخین نے ہومر کا ذکر ایک تاریخ نویس ہی کی حیثیت سے کیا ہے۔ ویسے بھی جوں جوں ہماری موجودہ تحقیقات کا دائرہ وسیع ہوتا جارہا ہے ان کی بدولت ہومر کے قدیم شہر 'ٹرائے' اور ہومری دور کے مقامات کے بارے میں ہمارے علم میں اضافہ ہو رہا ہے اسی اعتبار سے الیاڈ اور اڈیسی کی قدر و قیمت بھی بڑھتی جارہی ہے۔ ان سے قدیم یونانی باشندوں کے بارے میں اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ہومر کی شاعری سے ہمیں تاریخ کا لمس ملتا ہے۔ اس عہد کے تمدن، رسم و رواج عقائد، فن طب، جراحت، مختلف امراض یا جڑی بوٹیوں (ادویات) کا علم، دھاتوں اور دستکاریوں کا پتہ چلتا ہے۔ اگرچہ یہ کوئی تحقیقی کام نہیں ہے بلکہ ایک ادبی رزمیہ داستاں ہے۔ عہد اول کی تاریخ ادب سے لبریز تھی اور دلچسپ قصے کہانیاں اس کا حصہ تھے۔ اس قسم کی اولین نیم تاریخی تصنیفات میں تحقیق کا کوئی کردار نہیں تھا۔

1.3.2 زنوفنیس (Xenophanes)

انسانی سرگرمیوں کو تاریخی عمل میں ڈھالنے کا کام چھٹی صدی قبل مسیح میں زنوفنیس نے کیا۔ وہ ایونیا کا باشندہ تھا اور اس نے مقامی اور علاقائی واقعات، وقائع، نسب نامے نہایت تحقیق و تنقید سے تحریر کیے۔ یہ مواد نصف واقعات اور نصف اساطیری داستانوں پر مشتمل تھا اور اس میں غلطیوں کا بہت امکان تھا۔ زنوفنیس کی تصانیف اس قدر مشہور تھیں کہ وہ پانچویں اور چوتھی صدی قبل مسیح میں مورخین اور ادبی شخصیات کی توجہ کا اہم مرکز رہیں۔

1.3.3 ہیکاٹس (Hecataeus)

ہیکاٹس وہ پہلا یونانی وقائع نگار ہے جس نے چھٹی صدی ق م میں تاریخ یونان کے واقعات کو دیوی دیوتاؤں، مافوق الفطرت ہستیوں سے الگ کر کے ان کی صحیح حالات کے مطابق لکھنے کی کوشش کی۔ وہ پہلا وقائع نگار ہے جس نے تاریخ کی تاویل عقل کے مطابق کی۔ اس نے

پہلی مرتبہ یونانی اقوام کو تاریخ و جغرافیہ سے روشناس کرایا اور اس موضوع پر اپنی کتاب 'نقشہ عالم' (A Map of the World) تحریر کی جو جغرافیہ سے زیادہ تاریخ کی کتاب ہے۔ چنانچہ ہیکاٹس وہ پہلا مورخ ہے جس نے جغرافیائی سائنس دریافت کی۔ اس لیے اسے بابائے جغرافیہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس نے اپنی کتاب میں مختلف ممالک، مقامات، باشندے ان کے باہمی تعلقات اور خصوصیات کا عمیق مطالعہ پیش کیا ہے۔ پہلی مرتبہ اہل یونان کو تاریخ مشرق اور مشرقی اقوام سے متعارف کرایا۔ اس کے علاوہ تاریخی ترتیب (Dates) کے ساتھ اشوری، ایرانی اور ایشائے کوچک کے بادشاہوں کے حالات و واقعات پیش کیے۔ یہاں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہیکاٹس وہ پہلا وقائع نگار ہے جس نے بین الاقوامی تاریخ لکھنے کا آغاز کیا۔ اس نے قدیم تاریخ یونان بھی تحریر کی جس میں وہ بیان کرتا ہے کہ ''میں جو کچھ لکھ رہا ہوں وہ میرے نزدیک صحیح ہے۔ اگرچہ یونانیوں کے افسانے بے شمار ہیں اور میرے خیال میں وہ بیہودہ ہیں۔''

1.3.4 ہیلنکس (Hellanicus)

ہیلنکس (397۔482ق م) نے اولمپک کھیلوں کے فاتحین، مقامی روایات اور ایتھنز کے مختلف قصے اور واقعات بیان کیے ہیں۔ تھوسی ڈائیڈیز نے ہیلنکس کے مواد کو ناقص قرار دیا ہے اور اس پر بہت تنقید کی ہے۔ اس کی تحریریں کمیوں کے باوجود وہ تاریخ کے لیے خام مال اور براہ راست معلومات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ قابل غور ہے کہ ہیلنکس کی تحریریں مکمل طور پر نہیں بلکہ جزوی طور پر دستیاب ہیں۔

1.4 یونانی تاریخ نویسی پر اثرات (Influences on Greek Historiography)

1.4.1 فکری منتقلی کا دور (Age of Transition of Ideas)

چھٹی صدی قبل مسیح یونان میں فکری تبدیلی کا دور تھا۔ ایک اہم ترقی یا تبدیلی شاعری کے ساتھ ساتھ نثری روایت کا ارتقا تھا جس کی وجہ سے یونانی ذہن پہلے زیادہ عکاس اور کم تخیلاتی ہونے لگا۔ نئے فکری رویے نے شاعرانہ افکار میں پائی جانے والی تخیلاتی پرواز کی روک تھام کی۔ اس طرح جغرافیہ اور تاریخ دھیرے دھیرے الگ ہو گئے اور پہلا فلسفہ اور سائنس ظاہر ہوا۔

1.4.2 ایونیا کی برتری (Supremacy of Ionia)

اس فکری منتقلی میں ایونیا (Ionia) نے باقی یونان کی قیادت کی۔ ایونیا، الیاڈ کا گھر تھا اور یہ یونانی نثر، فلسفہ اور سائنس کا گھر بن گیا۔ وہاں جو سائنسی ماحول پیدا ہوا، اسی کو تاریخ نویسی پر بھی لاگو کیا گیا۔

1.4.3 نسلی جغرافیائی ادب کی ارتقا (Development of Ethno-graphical Literature)

جغرافیائی طور پر، ایونیا تمام مشرقی بحر روم کی تہذیبوں کا سنگم تھا۔ یونانی تاریخی نویسی کا ارتقا کافی حد تک پڑوسی لوگوں جیسے لیڈیائی اور فارسی سلطنت کو بیان کرنے اور سمجھنے کی کوششوں کے ذریعے ہوا۔ ان کی بیرونی تجارت اور سفر کے نتیجے میں، خاص طور پر فارسی سلطنت کے اندر، اہل ایونیا نے ایک نسلی جغرافیائی ادب تیار کیا۔

1.4.4 مختصر و قائع نگار(Logographer)

ہمسایہ لوگوں کے بارے میں جاننے کی کوششوں کے دوران، یونانیوں نے پہلی بار براہ راست جانچ پڑتال کی اہمیت کو تسلیم کیا، جو کہ علم تاریخ کی بنیاد ہے۔اس طرز کے مصنفین، جنہیں 'لوگو گرافرس' یعنی مختصر و قائع نگار کہا جاتا تھا، شہروں، لوگوں، حکمرانوں، مندروں وغیرہ کی ابتدا سے متعلق زبانی روایات اور افسانوں کو سادہ نثر میں پیش کرتے تھے۔لوگو گرافروں میں زیادہ اہمیت کے حامل 'ہیکاٹس' (Hecataeus)، 'ہیلانکس'(Hellanicus، 'شرون'Charon اور 'ڈایونیسیس' Dionysius تھے۔لوگو گرافر قصے کہانیوں سے تاریخ کی طرف عبور کو نشان زد کرتے ہیں۔ان کا موضوع مقامی تاریخ تھیاور ان کی معلومات کا ذریعہ مقامی افسانے تھے۔پھر بھی انہوں نے ان خرافات سے خارج کر دیا جو کہ سراسر ناقابل یقین تھا۔ہیکاٹس نے اپنی نسبی کہانیوں میں جن کو مضحکہ خیز سمجھا ان کا تذکرہ نہیں کیا۔لوگو گرافروں کی بیانیہ تخلیقات جزوی طور پر تیوہار کے موقعوں سامعین کا دل بہلانے کے لیے عوامی طور پر پڑھی جاتی تھیں۔بیانیہ تاریخ، تاریخ کی قدیم ترین قسم ہے اور ہمیشہ رہنے والی ہے، کیوں کہ ماضی کے واقعات کا بیان ہی تاریخ کا اصل مادہ ہے۔تاریخی واقعات کا بیان تاریخی واقعات کی یاد کو محفوظ رکھنے کی مستقل ضرورت کو پورا کرتا ہے۔پانچویں صدی قبل مسیح میں ہیروڈوٹس اور تھوسی ڈائڈیز کی تخلیقات کے ذریعے لوگو گرافی تاریخ میں تبدیل ہو گئی۔

1.4.5 جنگی عوامل (Stimulus of War)

جنگوں نے ہمیشہ تاریخ لکھنے کے محرک کے طور پر کام کیا ہے۔ہیکاٹس اور ہیروڈوٹس کو یونان و فارس کی جنگوں (499-479ق م) نے لکھنے پر ابھارا تھا اور بعد میں اسی صدی میں تھوسی ڈائڈس (Thucydides) کو پیلوپونیشیائی جنگ (431-404) نے منتقل کر دیا تھا۔جنگ، ہمارے اپنے دور تک تاریخ کی تحریر کے لیے ایک محرک رہی ہے۔

1.5 تاریخ نویسی کا آغاز اور کلاسیکی یونان کے مورخین

(Beginning of Historiography and Historians of the Classical Period)

رزمیہ نظموں، اساطیری داستانوں کے بعد مختصر و قائع نگاروں (Logographers) کا دور آیا۔ مختصر و قائع نگاروں کا سب سے اہم کارنامہ داستانوں سے قابل یقین واقعات کو الگ کرنا تھا۔حالانکہ وہ ابھی تک واقعات کی تحقیق اور جانچ پڑتال تک نہیں پہنچے تھے۔ان کے اس ادھورے کام کو کلاسیکی مورخین جیسے ہیروڈوٹس اور تھوسی ڈائڈس نے پورا کیا۔ان کی تحریروں سے باقاعدہ تاریخ نویسی کا آغاز ہوتا ہے۔ہم ان کے بارے میں تفصیل سے جاننے کی کوشش کریں گے۔

1.5.1 ہیروڈوٹس(Herodotus)

ہیروڈوٹس (484۔425ق م) کی ولادت یونانی جزیرے ہیلی کارناسس میں ہوئی۔جنوبی اٹلی کے شہر تھُری میں وفات پائی۔وہ

پہلا اور اولین مورخ جس نے اپنی کتاب میں علم اور فن کا امتزاج بڑی خوبی سے کیا۔ ہیروڈوٹس کی تاریخ 4 فصلوں پر مشتمل ہے۔اس میں فارس اور یونان کی لڑائیوں کا حال نہایت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ چونکہ یورپ اور ایشیا کے متعدد حصوں کا اس نے خود سفر کیا تھا لہذا اس کی تصنیف میں جن قوموں اور ملکوں کا ذکر آیا ہے ان میں بیشتر کا تعلق اس کے ذاتی مشاہدات سے ہے جو کہ کافی حد تک صحیح معلومات پر مبنی ہیں۔ ہیروڈوٹس کا طرز تحریر اگرچہ موجودہ علم تاریخ کے نقطہ نظر سے تنقیدی نہیں تھا لیکن وہ رعایت اور جانب داری سے بچتا تھا۔اس کی تاریخ میں اہم نسلی اور جغرافیائی معلومات ہے لہذا اس کی قدر و قیمت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ شاید پہلی کتاب ہے جس میں زمانہ ما قبل تاریخ کے قدیم گاؤں کا چشم دید حال ملتا ہے۔

ہیروڈوٹس نے مصر کے حالات میں نہایت تفصیل اور خوبی سے قلم اٹھایا اور دریائے نیل سے متعلق بحث کی۔ وہ خود بھی دیکھ چکا تھا کہ دریائے نیل کی سیلاب کے ذریعے بہا کر لائی گئی زرخیز مٹی ہر سال کناروں پر خشکی میں پھیل جاتی ہے گویا اسے معلوم تھا کہ مصر نیل کا عطیہ ہے۔اسی طرح جب اس کو زیریں مصر کی پہاڑیوں پر پتھر بنے ہوئے گھونگے نظر آئے تو اس نے یہ نتیجہ قائم کیا کہ یہاں کبھی سمندر بہتا تھا۔

تاریخ کو محتاط رویے، درست واقعات، صحت مند روایات اور معقولیت کے ساتھ پیش کرنے والا پہلا مورخ ہیروڈوٹس ہے۔اسے بابائے تاریخ محض طرز تحریر کی بنیاد پر نہیں بلکہ تاریخ میں حقیقت پسندی، تحقیق و تفتیش اور حقائق نگاری کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔اس نے گذشتہ ادوار میں انسانی کارناموں اور سرگرمیوں کو معلوم کرنے کی کوشش کی۔ واقعات کی چھان بین کے لیے دور دراز کے سفر اختیار کیے۔ وہاں کے مقامی باشندوں سے ماضی و حال کے حالات و واقعات سنے اور تاریخ کے لیے مواد حاصل کیا۔ تاریخ کو ادب سے علیحدہ کیا۔ قصے کہانیوں اور داستانوں کو تاریخ میں شامل نہیں کیا اور تاریخ کو تحقیق و تفتیش کے معنوں میں استعمال کیا۔اپنا نظریہ تاریخ بیان کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ ''تاریخ سے مراد حقیقت کی تلاش ہے''جس کا مطلب زمانہ ماضی کے حقائق کی تلاش ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ :

''یہ ہیروڈوٹس ساکن ہیلی کارناسس کی تحقیقات ہے جو اس کو اس لیے شائع کر رہا ہے کہ انسانوں کے کارنامے (اپنے آباواجداد) فراموش نہ ہو جائیں اور ان کی یادداشت باقی رہے اور یونانی اور وحشیوں (ایرانیوں) کے عجیب و غریب کارناموں کی داستان باقی رہے۔ ساتھ ہی یہ بھی تحریر میں آجائے کہ ان (ایونیاؤں اور وحشیوں) کے درمیان جو تنازعہ تھا اس کے اسباب کیا تھے۔"

ہیروڈوٹس انسان کو معقولیت پسند کہتا ہے کہ جس کا فرض ہے کہ اشیاء کی تشریح عقلی بنیادوں پر کرے اور فکر کو استعمال کر کے حقائق کی کھوج لگائے۔ ہیروڈوٹس کا کہنا ہے کہ مورخوں کو چاہیے کہ وہ یہ معلوم کریں کہ انسانوں نے زمانہ ماضی میں کیا کارنامے انجام دیے اور کیسے انجام دیے؟ ہیروڈوٹس محض واقعات تک اپنی توجہ مبذول نہیں رکھنا چاہتا بلکہ انکی وجوہات کو بھی جاننا چاہتا ہے۔

ہیروڈوٹس کے تاریخ لکھنے کا نمایاں نظریہ یہ تھا کہ وہ یونان و ایران اور مشرق و مغرب میں ٹکراؤ کی وجوہات جاننا چاہتا تھا۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ کون سی وجوہات تھیں جن کی بنیاد پر ایرانی، یونانیوں کو بار بار شکست دیتے ہیں اور ایرانیوں کی فتح کے کیا اسباب ہیں۔اس کا کہنا تھا کہ جنگ میں شکست اور فتح محض اتفاق نہیں ہیں کیونکہ حال کے واقعات کی وجوہات ماضی میں پوشیدہ ہیں۔ ماضی کی حقیقت حال میں پنہاں

ہے اور حال ہمیشہ مستقبل کی رہبری کرتا ہے۔

ہیروڈوٹس بیان کرتا ہے کہ ایران و یونان کی جنگ دو تمدنوں اور دو نظریات کی جنگ تھی چونکہ ہیروڈوٹس کے زمانے میں یونانیوں کے سب سے بڑے دشمن ایرانی تھے جو برابر یونانی ریاستوں سے لڑتے رہتے تھے۔ ہیروڈوٹس کے زمانے میں یونانیوں کو اپنی تہذیب کے متعلق یہ گمان تھا کہ دنیا کی کوئی دوسری قوم ان کی طرح مہذب نہیں۔ چنانچہ ہیروڈوٹس ایرانیوں کو 'وحشی' کہتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ ایرانیوں کی بعض خوبیاں بھی بیان کرتا ہے۔ جیمس شاٹ ول (Shotwell) ہیروڈوٹس کو ایرانی جنگوں کے ہومر کا خطاب دیتا ہے۔

ہیروڈوٹس نے ایرانیوں اور یونانیوں، بابلیوں، اشوریوں، مصریوں، ایشائے کوچک اور خلیج فارس کے ساتھ ساتھ آباد ملکوں کی تاریخ کے ساتھ ساتھ وہاں کے باشندوں، نسلوں، ان کے مختلف عقائد، موسمی حالات اور قدرتی پیداوار کے بارے میں بیش قیمت معلومات فراہم کی ہیں۔ اس نے مختلف تمدنوں کا ذکر کرتے ہوئے پہلی تاریخ عالم مرتب کی اور اس طرح ایک عالمی تاریخ لکھنے کی بنیاد ڈالی۔ اس کی تاریخ ایک طرح سے سیاحت نامہ بھی ہے۔ کچھ کمیوں کے باوجود موجودہ دور کے مورخین اسے قابل اعتبار مورخ مانتے ہیں اور اس کی ایمانداری اور حقیقت پسندی کو تسلیم کرتے رہے ہیں۔ فن تاریخ نویسی کی پہلی منزل یونان میں ہیروڈوٹس کے ہاتھوں مکمل ہوئی۔ اس نے تنقید کا فن ہیکاٹیس کی تحریروں سے سیکھا۔ اس کی تاریخ اپنے عہد کی تہذیبوں کی بہترین عکاسی کرتی ہے۔

1.5.2 تھوسی ڈائڈیز (Thucydides)

تھوسی ڈائڈیز (471-401 ق م) دنیا کے عظیم مورخین میں سے ایک ایسا مورخ ہے جس کے متعلق یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ فلسفہ تاریخ کا بانی ہے۔ جنگ پیلوپونیشیا (Peloponessian Wars) پر اس کی تاریخ کا شمار دنیا کی اہم ترین تصانیف میں ہوتا ہے۔ تھیوسی ڈائیڈیز بذات خود اس جنگ میں شریک تھا۔ اپنی کتاب کے شروع میں اپنی تصنیف کے مقاصد سے بحث کرتے ہوئے اس نے قدیم ترین دور سے لے کر خود اپنے زمانے تک یونانی سماج کے ارتقاء کا بھی ذکر کیا ہے۔ ایتھنس کے طاعون (430 تا 425 ق م) کا تذکرہ کافی دلچسپ ہے۔ وہ اس سورج گرہن کا بھی ذکر کرتا جو 430 ق م میں ایونیا میں نظر آیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب سورج گرہن کا حال تفصیل سے بیان کیا گیا۔

تھوسی ڈائڈیز تاریخی حقائق کو اسباب اور نتائج (Causation) کے ساتھ پیش کرنے والا پہلا مورخ ہے۔ اس نے تاریخی حقائق اور واقعات کو ہیروڈوٹس سے بالکل جداگانہ انداز میں پیش کیا اور قصے کہانیوں کو تاریخ کے دامن سے خارج کر دیا۔ اپنی تاریخ میں کہیں بھی قصے کہانیاں بیان نہیں کیں اور وہ داستان گوئی کا قائل نہیں تھا۔ اس کے خیال میں زمانہ ماضی کے واقعات کا علم اس لیے ضروری ہے کیونکہ اس بات کا پورا امکان ہے کہ آئندہ اس قسم کے واقعات، اسی قسم کی علت اور معلول (Cause and Effect) کی بنا پر دوبارہ ہوں گے۔

تھوسی ڈائڈیز کے تاریخی نظریات سے ہم اسپارٹا اور ایتھنز کی جنگوں کی وجوہات کو سمجھنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ ہیروڈوٹس کی بہ نسبت تھوسی ڈائڈیز کا موضوع تاریخ دقیق اور محصور ہے اور وہ اپنی تحقیق کا انحصار صرف چشم دید شواہد اور معلومات پر کرتا ہے اور انہیں تاریخ کے لیے قابل قبول مواد قرار دیتا ہے۔ اس نے تاریخ مرتب کرنے کے لیے حالات و واقعات سے آگاہ افراد کے انٹرویو لیے اور انہیں وجوہات

اور معقولیت کے ساتھ قلم بند کیا۔ تھوسی ڈائڈیز کے مطابق ''چشم دید شواہد کے بغیر تاریخ کا کوئی وجود نہیں۔'' تھوسی ڈائڈیز تاریخ نویسی کے لیے ماضی قریب کے شواہد و واقعات کو زیادہ معتبر و مستند سمجھتا ہے اور ماخذ (Source) کے صحیح اعداد و شمار (Data) کو تاریخ کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ تھوسی ڈائڈیز تاریخ نویسی کے لیے مندرجہ ذیل امور پر زور دیتا ہے:

- زمانہ ماضی کی (یونانی) تاریخ تحریر کرتے وقت معتبر ماخذوں کو حاصل کیا جائے۔
- جنگی تاریخ کے بارے میں (Military History) مختلف وجوہات میں سے صحیح ترین کا انتخاب کیا جائے۔
- سیاسی تاریخ رقم کرتے وقت حکومتی نمائندوں اور مختلف سیاسی شخصیات کے بیان اور تقاریر کو شامل کرنا چاہیے۔
- تاریخ کو قصے کہانیوں اور داستان گوئی سے پاک صاف رکھنا چاہیے۔
- تاریخی واقعات کو معقولیت حق و صداقت اور وجوہات کی روشنی میں تحریر کرنے چاہیے۔

تھوسی ڈائڈیز اسپارٹا کی جنگوں سے قبل تحریر کی گئی تاریخ کو درست خیال نہیں کرتا اور وہ موجودہ عہد اور ماضی قریب کی معلومات، اعداد و شمار، مآخذ اور شواہد کو معتبر سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ اس سے پہلے کہ ماخذ کو غلط طور پر پیش کیا جائے انہیں احاطہ تاریخ میں لے آنا چاہیے۔ تھوسی ڈائڈیز پر سب سے بڑی تنقید یہ ہے کہ اس نے اپنے عہد کی سماجی اور معاشی تاریخ کو نظر انداز کیا اور یکطرفہ اسپارٹا کی جنگوں کی فوجی تاریخ تحریر کی۔ تاہم وہ قدیم یونانی مورخین میں سے سب سے صاف گو، حقیقت پسند اور معقولیت پسند تھا۔ اس کی تاریخ نویسی کا انداز مورخین کے لیے آج بھی ایک عمدہ نمونہ ہے۔

1.5.3 زینوفون (Xenophon)

تھوسی ڈائڈیز کے بعد یونانی تاریخ نویسی کا ایک روشن دور ختم ہوا۔ زینوفون (430-355 ق م) نے اگرچہ یونانی اور دیگر مشرقی اقوام کی تاریخ تحریر کی مگر وہ ہیروڈوٹس اور تھوسی ڈائڈیز جیسا معیار برقرار نہ رکھ سکا۔ ایک وقائع نگار کے طور پر وہ نہایت معتبر اور حقیقت پسند تھا اور اس نے واقعات تحریر کرتے وقت پوری دیانت داری برتی لیکن وہ تاریخ میں تحقیق اور اسباب اور نتائج پر بھرپور توجہ نہیں دے سکا۔ اس نے سوانح نگاری کے طرز پر تاریخ لکھی اور اپنے عہد کی نمایاں شخصیات، حکومتوں اور اداروں کے بارے میں مفید معلومات قلمبند کیں۔ یہ یونانی تاریخ نویسی کا آخری معتبر مورخ تھا۔ تاریخ نویسی میں تجزیہ نگاری اور معقولیت پسندی میں وہ مقام حاصل نہ کر سکا جو اس کے پیشرو ہیروڈوٹس اور تھوسی ڈائڈیز کو حاصل تھا۔

زینوفون، سقراط کا پیروکار اور دس ہزار سپاہیوں کے دستے کا کمانڈر تھا۔ اس نے فرات سے بحیرہ اسود تک کوہستانی علاقے میں اپنے سفر کا حال 'انا باسس' (Anabasis) میں جس خوبی سے لکھا ہے اس کا شمار تاریخ کے شاہکاروں میں ہوتا ہے۔ زینوفون ایک اہم تاریخی شاہکار 'ہیلینکا' (Hellenica) کا مصنف بھی ہے۔ سات ابواب میں زینوفون کی اس تاریخ کا سلسلہ تھوسی ڈائڈیز کی تاریخ کے خاتمے یعنی 410 ق م کے بعد پیلوپونیشین جنگوں کے واقعات سے مل جاتا ہے۔

1.5.4 ایفورس (Ephorus)

ایفورس(322-410ق م)چوتھی صدی ق م کے وسط کا مورخ اور جغرافیہ دان ہے۔ یہ نظریہ تاریخ کے بارے میں اپنے استاد اور ایٹکا کے ماہر مقرر آسوکریٹس (Isocrates) سے بے حد متاثر تھا۔ ہیروڈوٹس کے بعد وہ پہلا مورخ ہے جس نے تاریخ عالم پر لکھنا شروع کیا۔ الفیوروس جغرافیہ کو بڑی اہمیت دیتا تھا۔ اس نے تاریخ کی جغرافیائی اساس پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ الفیوروس کی تاریخ کا سلسلہ 355تا256ق م پر ختم ہو جاتا ہے۔

1.5.5 تھیوپومپوس (Theopompos)

تھیوپومپوس(380-323ق م) بھی اپنے استاد آسوکریٹس سے بہت متاثر تھا اور اس کے سیاسی نظریات کی بنیاد پر تاریخ نویسی کی۔ یہ یونانی مورخ اور خطیب تھا۔ یہ پہلا یونانی مورخ ہے جس نے روم کا واضح طور پر ذکر کیا ہے۔ وہ بڑا فاضل اور دانشور تھا اور اس امر پر بڑا زور دیتا تھا کہ تاریخی مباحث میں سیرت و کردار، آداب، ذات اور ذہنیت کا تذکرہ ناگزیر ہے۔ اس لحاظ سے گویا وہ ٹیسی ٹس (Tacitus) کا پیشرو اور نفسیاتی تاریخ کا بانی تھا۔ تھیوپومپوس کی اہم تصنیفات میں بارہ ابواب پر مشتمل تاریخ یونانHellenica شامل ہے جس سے تھوسی ڈائڈیز کی تاریخ کا وہ سلسلہ جو410ق م پر ختم ہو جاتا تھا398ق م تک وسیع ہو جاتا ہے۔ اس کی دوسری تصنیف 'تاریخ فلپ' Historiae Philippicae58 جلدوں پر مشتمل تھی جسے فلپ پنجم نے16 کتابوں تک مختصر کروایا۔ یہ360ق م سے336ق م تک تقریباً سارے یونان کی تاریخ ہے۔ ایفورس اور تھیوپومپوس دونوں مورخوں کا اسلوب نہایت سادہ اور آسان تھا مگر وہ تجزیہ نگاری، معقولیت اور رائے زنی سے عاری تھے۔

1.5.6 پولی بیس (Polybios)

پولی بیس(205۔125ق م)ایک مورخ، جغرافیہ دان اور رواقی تھا۔ وہ اہم یونانی مورخین میں سے ایک تھا۔ اس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ پہلا عالم گیر مورخ تھا۔ اپنے اسلوب کے قطع نظر وہ یونان و روم کے تاریخی سنگم کا عظیم مورخ تھا۔ اس نے 'یونان اور روم' کی تاریخ لکھی جو40 جلدوں پر مشتمل تھی۔ اس میں زیادہ تر220ق م اور146ق م کے درمیانی حالات کا ذکر ہے۔ اس کتاب کے طویل مقدمے یعنی پہلی اور دوسری فصلوں میں پولی بیس نے بتایا ہے کہ تاریخ کا مقصد اور نظریہ کیا ہونا چاہیے۔ پولی بیس کے مطابق تاریخ کا پہلا مقصد حقائق کی تلاش اور حصول علم ہے۔ اس کے 3 اہم عناصر ہیں

1۔ دستاویزوں کا مطالعہ 2۔ جغرافیے کا مطالعہ 3۔ سیاسیات اور فن حرب وضرب کا مطالعہ

پولی بیس نے جغرافیے کو بالخصوص اہمیت دی۔ وہ کہتا تھا انسانی حوادث کے جغرافیائی پس منظر کی تشریح نہایت ضروری ہے۔ اسے جغرافیہ میں خود بھی بڑی وسیع معلومات حاصل تھیں جس کی ایک وجہ اس کی دور دراز کی سیاحتیں تھیں اور دوسری اس کی غیر معمولی ذہانت تھی۔ اس تصنیف سے یونانی افکار کی تاریخ میں ایک نئے باب کا افتتاح ہوتا ہے کیونکہ یہ پہلا موقع تھا جب یونانی اور رومی تہذیبیں ایک

دوسرے سے منسلک ہوئیں۔

دوسری صدی ق م جب یونانی تہذیب زوال پذیر ہوئی تو اس دور میں کوئی قابل ذکر یونانی مورخ موجود نہیں تھا جو تاریخ نویسی کے عمل کو رواں دواں رکھتا۔ اس دور میں پولی بیس ہی وہ واحد مورخ ہے جس نے یونان و روم کی تاریخ کو ہیروڈوٹس اور تھیوسی ڈائیڈز کے اسلوب میں تحریر کیا۔ کلنگ ووڈ کے مطابق پولی بیس کا انداز تحریر انسان نواز (Humanistic) ہے۔ اس نے سائنسی انداز معقولیت، شواہد اور وجوہات کو تاریخ نویسی میں استعمال کیا۔ وہ اپنا نظریہ تاریخ بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ :

''تاریخ لکھنے کا مقصد یہ نہیں کہ واقعات کو کیسے کنٹرول کیا جائے بلکہ واقعات کو جامعیت اور تدبر کے ساتھ پیش کیا جائے۔ انسانی اعمال اور سرگرمیوں کو دہرایا نہیں جا سکتا اور نہ ہی تاریخ ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ انہیں کیسے کنٹرول کیا جانا چاہیے۔ جو کچھ تاریخ سے جان پائے ہیں وہ یہ کہ ہم ہمیشہ اپنی غلطیوں سے سیکھ سکتے ہیں اور یہ کہ اخلاقی پختگی کو برقرار رکھ سکتے ہیں۔''

اس کی تاریخ کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مورخ کے لیے چند شرائط مقرر کرتا ہے جن کے بغیر حقیقی تاریخ نہیں لکھی جا سکتی۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ ''میں کہتا ہوں کہ تاریخ پوری طرح نہیں لکھی جا سکتی جب تک اس کو اہل عمل لوگ نہ لکھیں یا مورخوں کو پوری طرح معلوم نہ ہو جائے کہ تاریخ نویسی کے لیے امور مملکت کا عملی تجربہ ضروری ہے۔ جب تک یہ نہ ہو گا تب تک مورخ تاریخ نویسی میں برابر غلطیاں کرتے رہیں گے۔''

یہ واضح ہے کہ پولی بیس خود ماہر سیاست تھا اور اس نے مورخ بننے سے پہلے عملی طور پر سیاست میں حصہ لیا اور فوج میں شامل ہوا۔ اس کو تاریخ اور ماخذوں کے بارے میں وسیع معلومات حاصل تھیں۔ اس نے آزادانہ طور پر حقائق کی روشنی میں بلا خوف و خطر اعلیٰ شخصیات پر تنقید کی۔ اس کا کہنا ہے کہ علم تاریخ کی اہمیت، واقعات و حقائق کی وجوہات میں پوشیدہ ہے اور یہی بات تاریخ نویسی کے لیے بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ چونکہ اس نے وسیع سلطنت روم کے شب و روز دیکھے تھے، اس کے ذہن میں 'عالمی تاریخ' کا ایک وسیع نظریہ تھا۔ اسی کو مد نظر رکھتے ہوئے اس نے 'تاریخ روم' تحریر کی۔ پولی بیس نے اپنی تاریخ کا مقصد یہ متعین کیا کہ ''لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ تاریخ کا مطالعہ اس لیے ضروری ہے کہ کوئی قوم گمراہ نہ ہو اور سابق اقوام کی غلطیوں کو نہ دہرائے اور اپنے آپ کی اصلاح کرے۔ وہ تقدیر کا بھی قائل تھا۔ اس کے بقول ''تاریخ کے مطالعے سے کوئی قوم اپنی قسمت تو بدل نہیں سکتی البتہ متعدد مصیبتوں کو صبر و استقلال سے جھیل ضرور سکتی ہے۔ پولی بیس علم تاریخ کو حکمرانوں، سیاست دانوں دانشوروں اور سپاہیوں کی تربیت کے لیے ضروری قرار دیتا ہے۔

1.5.7 پلوٹارک (Plutarch)

یونانی مورخوں کی صف میں پلوٹارک (45تا120ء) آخری مستند مصنف تھا۔ شروع میں اس نے مذہبی پیشوائی کا پیشہ اختیار کیا اور بعد ازاں اس نے فلسفہ سائنس اور ادب پر بہت سے عالمانہ و محققانہ مضامین تحریر کیے۔

تاریخ پر پلوٹارک نے زندگی کے آخری حصہ میں کام کیا۔ تاریخ میں اس کا بہترین کام 'پلوٹارک لائیوز' یا سوانح شرفاء یونان، 'ایتھنز کا عروج وزوال' اور 'سوانح شرفاء روم' تحریر کیں۔ پلوٹارک کو شہرت اس کے فلسفہ وسائنس کے علوم کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی تاریخ نویسی کی خصوصیات کی بنیاد پر ملی۔ شیکس پیر نے رومی ڈرامہ نویسی کے لیے پلوٹارک کی تاریخ کو بطور ماخذ استعمال کیا۔ پلوٹارک مصر و روم بھی گیا اور روم میں اس کے بہترین دوست اور احباب تھے۔ جب وہ روم پہنچا تو شہنشاہ ہیڈرین (Hadrian) نے نہایت عزت واحترام سے اس کا استقبال کیا اور یونان میں اسے اعلی عہدہ کی پیشکش کی جو اس نے قبول نہ کی اور اپنے آبائی وطن چیرونیا (Chaeronea) کو ترجیح دی جہاں پر اس کا 120ء میں انتقال ہو گیا۔ پلوٹارک نے یونان وروم کی مشہور عظیم شخصیات کی سوانح تحریر کیں اور آئندہ کے مورخین کے لیے سوانح عمریاں تحریر کرنے کا اسلوب وضع کیا۔ یہ یونانی ادیب اور معلم اخلاق اپنی سوانح (Lives) کی بدولت مشہور ہوا۔ پلوٹارک نے سوانح نویسی میں کمال پیدا کیا۔ اس کا طریقہ نگارش یہ تھا کہ وہ ایک یونانی اور ایک رومی ممتاز ہستی کو لیتا تھا اور دونوں کا موازنہ کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی مجموعہ سوانح کا نام 'متوازی سوانحات' رکھا۔

1.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

عہد قدیم کے یونان میں تاریخ نویسی کی کوئی باقاعدہ روایت ہیروڈوٹس سے پہلے نہیں تھی۔ ماقبل کلاسیکی یونان کی اہم روایت قصے کہانیاں، اساطیری داستانیں اور دیومالائیں تھیں جن کا موضوع بحث انسان نہ ہو کر دیوتا تھے۔ ہومر کے عہد میں اس میں بدلاؤ آنا شروع ہوئے اور بہادروں کی داستانوں اور رزمیوں کو جگہ حاصل ہوئی۔ بعد کے دور میں مختصر وقائع نگاروں (Logographers) نے قدیم داستانوں سے ناقابل یقین واقعات کو خارج کرنا شروع کر دیا۔ ہیکاٹس اس روایت میں اہم مقام کا حامل تھا اور ہیروڈوٹس بھی اس سے متاثر تھا۔ لیکن یہ وقائع نگار ابھی تک اپنی تحریر میں تحقیق اور اسباب اور وجوہات کو جگہ نہیں دے پائے تھے۔

کلاسیکی عہد کے آغاز کے ساتھ باقاعدہ یونانی تاریخ نویسی شروع ہوئی۔ ہیروڈوٹس نے اپنی تصنیف سے پہلی بار تاریخ میں تحقیق کا پہلو اجاگر کیا جسے اس کے بعد تھوسی ڈائڈیز نے عروج پر پہنچایا۔ تھوسی ڈائڈیز نے اپنی تاریخ نویسی میں داستان گوئی کو بالکل خارج کر دیا اور مشاہدات اور تجربات پر زور دیا۔ اس لیے اسے سائنسی تاریخ نویسی کا بانی بھی کہا جاتا ہے۔ بعد کے مورخین نے کچھ کمی بیشی کے ساتھ اس روایت کو قائم رکھا۔ یونانی مورخین کی عظمت یہ ہے کہ انہوں نے تاریخ نویسی کو تاریخی تسلسل، تحقیق، معقولیت اور اسباب اور وجوہات کے ساتھ تحریر کیا۔ انہوں نے تاریخ کی عمارت کو نظریاتی بنیادوں پر نہیں بلکہ انسانی (Humanistic) اقداروں پر قائم کیا۔ تاریخ کو ادب اور قصہ کہانیوں سے جدا کر کے تحقیقی وتفتیشی علوم کی صف میں کھڑا کر دیا۔ تاریخ کا سائنسی نظریہ یونانیوں کی دین ہے۔

1.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

عبرانی : یہودی

بابلی : قدیم عراق میں ایک سلطنت

اشوری : قدیم عراق اور شام میں ایک سلطنت

موآبی پتھر : میشا تختی، جسے موآبی پتھر کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، تقریباً 840 قبل مسیح کا ایک قبر کا کتبہ ہے جس میں ایک اہم کنعانی کتبہ، موآب (جدید اردن میں واقع ایک مملکت) کے بادشاہ میشا کے نام پر ہے۔

ایونیا : موجودہ ترکی کا ساحلی علاقہ جسے یونانی ایونیا پکارتے تھے۔

لوگوگرافر : مختصر وقائع نگار

ٹرائے : ہومر کی نظموں میں پایا جانے والا ترکی میں ایک شہر

ہیلی کارناسس : ایونیا میں واقع ایک شہر

Relief : ابھری ہوئی نقشی تصاویر

1.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

1.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

i. یونانیوں سے پہلے یادداشت چھوڑنے والے کنہیں دو قوموں کے نام بتایئے۔

ii. پہلی بابلی سلطنت میں ہر سال کا نام کس کے اوپر رکھا جاتا تھا۔

iii. ریلیف کسے کہتے ہیں۔

iv. عبرانی صحیفوں میں کتنی کتابوں میں تاریخی معلومات درج ہے۔

v. مائیسینی تہذیب کہاں واقع تھی۔

vi. الیاڈ اور اڈیسی کس کی تصنیف ہیں۔

vii. ٹرائے شہر کا ذکر کس کی تصنیف میں کیا گیا۔

viii. اپامیہ کہاں واقع تھا۔

ix. 'سوانح شرفاء روم' کس کی تصنیف ہے۔

x. تھوسی ڈائڈیز کی تصنیف کا کیا نام ہے۔

1.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. ہومر پر ایک مضمون لکھیے۔
2. ہیکاٹس پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔
3. مختصر وقائع نگار کون تھے، بیان کیجیے۔

4. تھوسی ڈائڈیز کے بارے میں بتائیے۔
5. پلوٹارک پر ایک مضمون لکھیے۔

1.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. ماقبل کلاسیکی یونان میں تاریخ نویسی کے پس منظر پر ایک تفصیلی مضمون قلمبند کیجیے۔
2. یونانی تاریخ نویسی پر اثرات کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔
3. ہیروڈوٹس کی تاریخ نویسی کی خصوصیات بیان کیجیے۔

1.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. Grethlein, Jonas., *The Greeks and their Past: Poetry, Oratory and History in the Fifth Century BCE*. Cambridge: Cambridge University Press. 2010.
2. Hornblower, Simon ed. *Greek Historiography*. Oxford Clarendon Press. 1994.
3. Luce, T. J., *The Greek Historians*. London and New York: Routledge.1997.
4. Pitcher, Luke., *Writing Ancient History: An Introduction to Classical Historiography*. London and New York: I. B. Tauris. 2009.
5. Shrimpton, Gordon S., *History and Memory in Ancient Greece.* Montreal and Buffalo, NY: McGill-Queen's University Press.1997.
6. Skinner, Joseph E., *The Invention of Greek Ethnography: From Homer to Herodotus*. Oxford: Oxford University Press. 2012.

اکائی 2۔رومی تاریخ نویسی

(Roman Historiography)

اکائی کے اجزا

2.0		تمہید
2.1		مقاصد
2.2		پس منظر
2.3		رومی مورخین
	2.3.1	کوئنٹس فیبیس پکٹر
	2.3.2	مارکس پورشیئس کیٹو
	2.3.3	گائس جولیس سیزر
	2.3.4	سالوسٹ
	2.3.5	کونٹس کرٹیس روفس
	2.3.6	لیوی
	2.3.7	ٹیسی ٹس
2.4		اکتسابی نتائج
2.5		کلیدی الفاظ
2.6		نمونہ امتحانی سوالات
	2.6.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	2.6.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	2.6.2	طویل جوابات کے حامل سوالات
2.7		مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

2.0 تمہید (Introduction)

حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے صدیوں قبل اٹلی کے دریائے ٹائبر (Tiber) کے کنارے سات چھوٹی پہاڑیوں پر مٹی کے بنے سات گاؤں آباد تھے جو وقت کے ساتھ ترقی کر کے ''روم'' نام کے ایک چھوٹے سے شہر میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اگلی صدیوں میں یہ چھوٹا سا شہر پہلے اٹلی اور پھر دوسرے ممالک پر قبضہ کر کے ایک طاقتور سلطنت کا مرکز بن گیا اور آئندہ کئی صدیوں تک بنا رہا۔ رومی سلطنت اپنے عروج کے دور میں یورپ، ایشیا اور افریقہ کے مختلف ممالک پر مشتمل 23 لاکھ مربع میل کے رقبہ پر پھیلی ہوئی تھی۔ یہ قدیم یونان کے ثقافتی ورثے کی نہ صرف امین اور محافظ رہی بلکہ انتظام حکومت، قانون، تعمیرات اور خدمات عامہ کے میدانوں میں متعدد اضافے بھی کیے۔ جدید مغربی تہذیب کی ثقافت، قانون، ٹیکنالوجی، فنون، زبان، مذہب، طرز حکومت، سیاست، افواج اور طرز تعمیر پر قدیم رومی سلطنت کے دیرپا اثرات پائے جاتے ہیں۔ یہاں اس قدیم رومی سلطنت کی مختصر سی تاریخ بیان کی جاتی ہے۔

مارکس پورشیس کاٹو (Marcus Porcius Cato) کے مطابق ''مشہور اور اہم آدمیوں کے لیے ان کی تفریحی سرگرمیوں کا حساب ہونا چاہیے جو ان کے سنجیدہ کاموں سے کم نہ ہو۔''

روم کی تاریخ کی ماہیت اس بات میں پائی جاتی ہے کہ یہ پرانی اور نئی دنیا کو ملانے والی ایک لڑی ہے۔ یہ اس پانی کے ذخیرے کی طرح ہے جس میں پہلے مختلف چشموں سے پانی آ کر جمع ہوتا ہے اور پھر اس میں سے کئی شاخوں کی صورت میں نکل کر منقسم ہوتا ہے۔ پہلے تمام پرانی اقوام رومی سلطنت کے اندر جذب ہو گئیں اور پھر اس سے نئی قوموں کی صورت میں ظاہر ہوئیں۔

قانون داں، فوجی اور حکمرانوں کی حیثیت سے اہل روم عروج پر پہنچے ہوئے تھے لیکن تخلیقی کاموں میں یونانیوں سے کم تر تھے اسی لیے انہوں نے یونانیوں سے سارے علوم و فنون لے لیے۔ رومی سلطنت کے زوال پذیر ہوتے ہی علوم و فنون کا بھی خاتمہ ہوتا چلا گیا۔ یہ بات نہایت افسوس ناک ہے کہ رومی تہذیب یونانی مورخوں مثلاً ہیروڈوٹس اور تھیوی ڈائیڈز جیسے حقیقت پسند تاریخ دان نہ پیدا کر سکی۔

2.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- رومی تاریخ نویسی کے پس منظر کو سمجھ سکیں گے۔
- رومی مورخین کے انداز اور اسلوب بیان کو سمجھ سکیں گے۔
- فیبیس اور کیٹو کے طرز تحریر کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- لیوی اور ٹیسی ٹس کے کارناموں کو بیان کر سکیں گے۔
- یونانی اور رومی مورخین کا موازنہ کر سکیں گے۔

2.2 پس منظر (Background)

رومی سلطنت کی تاریخ اس وقت شروع ہوتی ہے، جب فتوحات کے ذریعے اس کی طاقت اور اقتدار مستحکم ہو گیا۔ جب کوئی سلطنت سیاسی اور اقتصادی طور پر مضبوط ہو جائے تو ساتھ ہی اس کا تمدن بھی تشکیل پاتا ہے۔ امراء اور سالاروں کا طبقہ پیدا ہوتا ہے، جو مال و دولت سے معاشرے میں اعلیٰ مقام حاصل کر لیتا ہے۔ اس دور میں روم کا شہر نئی اور شاندار عمارتوں سے آراستہ ہو گیا۔ جنگ میں پکڑے جانے والے غلاموں کی وجہ سے آبادی کی تعداد بڑھ گئی۔ رومی جمہوریہ کے عروج کے وقت تقریباً 200. قبل مسیح میں پولی بیس (Polybius) رومی جمہوریہ کی تاریخ لکھی۔ یہ خود یونانی تھا اور ایک غلام کے طور پر اسے روم لایا گیا تھا جہاں یہ روم کے مشہور خاندان اسکاپیوافریقانوس (Scapeo Africanus) میں بچوں کا اتالیق ہو گیا تھا۔ جب اسکاپیو خاندان نے قرطاجنہ (Carthage) پر حملہ کر کے اسے تباہ کیا تھا تو یہ اس کے ساتھ تھا۔ اس نے رومی سلطنت کی تاریخ لکھتے وقت نہ صرف جنگوں میں شرکت کی تھی، بلکہ ان کے تمدن اور سیاست کا بھی بغور مطالعہ کیا تھا۔ اس نے تاریخ لکھتے وقت غیر جانبداری کا رویہ اختیار کیا اور اپنی تاریخ میں ان اصولوں کو اختیار کیا ہے، جن پر آج بھی عمل کیا جاتا ہے۔ یعنی واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی رائے دینے کے بجائے ان کو اسی طرح بیان کیا جائے جیسا کہ وہ واقع ہوئے تھے اور تاریخ لکھتے وقت ذاتی خیالات کے داخل کرنے سے بچنے کی کوشش کی۔

یونانی مورخوں نے تاریخ نویسی کی ابتدائی بنیادیں فراہم کیں، جن پر آگے چل کر رومی مورخوں نے اضافے کیے اور تاریخ کے بیان کے لیے نئے نظریات کو روشناس کرایا۔ رومی دور میں تاریخ نویسی میں اس وقت تبدیلی آئی جب رومی سلطنت وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔ لہٰذا اس نے عالمی تاریخ کو پیدا کیا، کیونکہ رومیوں نے مختلف اقوام کو شکست دے کر ان کے ملکوں پر قبضہ کیا تھا، اس لیے اب مورخ قومی یا ملکی تاریخ کی جگہ جیسا کہ یونانی مورخوں کا دستور تھا کہ اپنی تاریخ میں مفتوح قوموں کو بھی جگہ دی۔

2.3 رومی مورخین (Roman Historians)

2.3.1 کوئنٹس فیبیس پکٹر (Quintus Fabius Pictor)

دوسری پیونی جنگ کے درمیان، کوئنٹس فیبیس پکٹر پہلا رومی تھا جس نے نثر میں روم کی تاریخ لکھی۔ غالباً 270 کے لگ بھگ پیدا ہوئے، فیبیس نے 230 کی دہائی کے دوران لیگوریہ اور گال کے خلاف مسلسل مہموں میں حصہ لیا اور ہو سکتا ہے کہ ان ہی میں سے کسی ایک سال میں اس نے پریٹر کا عہدہ بھی حاصل کیا ہو۔ 216 ق م میں کینے (Cannae) کی تباہ کن شکست کے بعد ایک سفارتی مہم کے طور پر اسے ڈیلفی بھیجا گیا تاکہ وہ تباہ شدہ ریاست کے لیے دیوتاؤں سے مشورہ حاصل کر سکے۔ یہ مشن ایک اہم تجربہ رہا ہو گا۔ اپنے سفر میں فیبیس کو یونانیوں میں روم کے خلاف ناراضگی کا سامنا کرنا پڑا، جو کہ ایک تاریخی کام تحریر کرنے کے اس کے فیصلے میں ایک فیصلہ کن عنصر ثابت ہوا تھا تاکہ وہ موجودہ معاملات کے بارے میں رومی نقطہ نظر کو پیش کر سکے۔ تاہم بنیادی تحریک روم ہی سے آئی تھی جو کہ کینے کی شکست کے بعد رومی ریاست میں گہرا یا بحران تھا۔ کارتھیج کے ساتھ بڑھتے ہوئے تصادم کے سبب جنگ اور سیاست کے عوامل پر سوال ضرور پیدا ہوا ہو گا۔ یہ

ایک ایسا سوال تھا جس نے ماضی اور حال کے لیے اس کی مطابقت کو ظاہر کرنے کا وعدہ کیا تھا اور اس طرح اس نے موجودہ بحران میں ایک رجحان پیش کیا تھا۔ رجحان کی یہ ضرورت پکٹر کی رومی تاریخ کی تنظیم میں نظر آتی ہے۔

فیبیئس نے اپنی تاریخ نویسی میں ایک قابل فہم تسلسل قائم کیا جو ہیریکلس کی اٹلی میں آمد سے لے کر رومولس تک اور پھر اپنے زمانے کے نامور اشخاص تک چلا۔ جہاں تک ان کی تاریخ کی اہمیت کا سوال ہے تو یہ کوئی سادہ سی قیام کی کہانی نہیں تھی کیونکہ یقینی طور پر یونانی مصنفین جیسے ہیپریتھوس کے ڈایوکلس پہلے ہی روم کے بارے میں ایسی قیام کی داستانیں بیان کر چکے تھے۔ پھر بھی فیبیس پکٹر کے لیے یہ فرضی مقام (Spatium Mythicum) ماضی میں بہت دور واقع ایک الگ جگہ نہیں تھی، بلکہ اس کی تصنیف میں یہ رومی ریاست کی بنیاد بن گئی، جس کے رسم و رواج، اداروں اور حکمرانی کا ابتدائی دور میں اعلان کیا گیا تھا۔

فیبیئس کا کام دوہرا تھا: تاریخی مواد کا ایک تاریخ وار جال قائم کرنا جو انفرادی اور اجتماعی یادوں کے پیچیدہ، درجہ بند مرکب کے ذریعے ہی دستیاب تھا۔ اور ایک مربوط بیانیہ تیار کرنا۔ اس نے اپنی کتاب *Punic War* میں رومولس اور روم کے قیام سے ہنی بال کی جنگوں تک صرف ایک مختصر تاریخی بیان پیش کیا ہے۔ ہالی کارناسس کے ڈایونوسیس کی تصنیف میں ایک تبصرہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ فیبیئس کی تاریخ کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا:

- پہلا حصہ، شہر کے قیام کا ایک عام اور سرسری جائزہ جس میں جمہوریہ کے ابتدائی سال شامل تھے۔
- دوسرا حصہ، 'قیام کے بعد عہد عتیق' یعنی 450ق م میں Decemvirate (دس لوگوں کے ایک گروہ) کی حکومت سے لے کر Pyrrhic War (280-75ق م) تک کا عرصہ، جس میں فیبیس نے مختصراً حقیقت پر مبنی نکات پر زور دیا۔
- تیسرا، عصری تاریخ جسے پہلی پیونک وار سے، احتیاط سے اور سنجیدگی سے لکھا گیا۔

یہ تصنیف کئی کتابوں پر مشتمل تھی۔ رومولس اور ریمس کے بارے میں طویل داستانی اقتباسات یہ واضح کرتے ہیں کہ فیبیس کی تاریخ محض حقائق اور اعداد و شمار کی تالیف نہیں تھی۔ موجودہ واقعات کا تذکرہ واضح اور عمدہ اور کم از کم جب بات بین الاقوامی معاملات میں رومیوں کے کردار کی وضاحت کی ہو تو تجزیاتی بھی تھا۔ پکٹر کے ارادوں کو دیکھتے ہوئے، یہ سمجھنا آسان ہے کہ یہ کام یونانی میں کیوں لکھا گیا تھا۔ ایک پڑھے لکھے عوام (یونانی، رومناور بربر) سے خطاب کرتے ہوئے، یہ واحد زبان تھی جو قارئین کے وسیع حلقے تک پہنچنے کے لیے موزوں تھی۔ فیبیس پکٹر نے معیار قائم کیے اور اس کی کامیابی کو لوسیس، سنسیس الیمنٹس (Lucius Cincius Alimentus)، الوس پوسٹمیس البینس (Aulus Postumius Albinus) اور گائس اچیلیس (Gaius Acilius) نے تسلیم کیا. یہ سبھی تعلیم یافتہ اور رومی سینیٹ کے ممبران تھے جنہوں نے زبان، شکل اور موضوع کے معاملات میں دوسری صدی کی پہلی دہائیوں میں فیبیس کی پیروی کی۔

2.3.2 مارکس پورشیئس کیٹو (Marcus Porcius Cato)

جب مارکس پورشیئس کیٹو(234-149 قبل مسیح)نے 170 میں یا اس کے آس پاس ''رومی لوگوں کے کارنامے'' (The Deeds of the Roman People) لکھنے کا ارادہ کیا تو اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ اس کام میں بالکل اسی طرح مہارت حاصل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا جس طرح اس نے باقی تمام چیزوں میں مہارت حاصل کی تھی۔ وہ اٹلی میں ٹسکولم (Tusculum) نامی قدیم شہر میں ایک عام گھرانے میں پیدا ہوا، جہاں سے اس نے رومی اشرافیہ کے اعلیٰ ترین عہدے تک اپنا زندگی کا سفر طے کیا۔ 204 ق م میں وہ کوئسٹر بنا۔ پانچ سال بعد 199 ق م میں اسے لوگوں کا ایڈائل بنایا گیا۔ 198 ق م میں سارڈینیا کا پریٹر متعین ہوا اور 195 ق م میں میکسمس ہونوس کے عہدے سے سرفراز ہوا۔ 194 ق م میں ایک عظیم فتح کے بعد اسے قونصل کا عظیم عہدہ دیا گیا۔ یہ واقعی ایک شاندار کیریر تھا۔

اپنے دور کے عظیم رہنماؤں کی طرح، کیٹو بھی جمہوریہ کی تقدیر کے ساتھ مکمل ذاتی شناخت اور وابستگی سے لبریز تھا۔ درحقیقت، رومی اجتماعی اقدار جیسے سختی، شائستگی اور سادہ طرز زندگی سے اس کی خاص وابستگی نے اسے ایک منفرد شناخت دی، جو کہ رومی ثقافتی یادداشت میں کیٹو کے ایک مثالی فضیلت والے ایک فرد کی حیثیت سے تصور کی خصوصیت بن گئی۔

دوسروں کے برعکس کیٹو مختلف تھا۔ وہ قونصل عہدے کا آدمی تھا، جس کا مطلب اعلیٰ ترین عزت و وقار تھا۔ فیبیس کے دیگر فوری جانشینوں کے برعکس، کیٹو اس وقار کو رومی ثقافت کو جدید بنانے کے لیے استعمال کرنے کے لیے پرعزم تھا۔ اس جدیدیت کا ایک حصہ تاریخ نویسی کی صنف کو لاطینی بنانا تھا۔ کیٹو نے لاطینی میں لکھا اور اس کے بعد کسی رومی مورخ نے یونانی میں لکھنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ رومیوں کے پاس ایک زبان اور دانشورانہ صلاحیتوں کا ایک مجموعہ تھا جو یونانیوں کی ادبی روایتوں کے ساتھ ساتھ ان کی ثقافتی کامیابیوں کا مدمقابل تھا۔

فیبین روایت سے خود کو الگ کرنے کے لیے کیٹو کی دوسری حکمت عملی اٹلی کے لوگوں اور خطوں کی تاریخوں کو شامل کرنا تھا، جن کو کیٹو کی *Origins* کی دوسری اور تیسری کتابوں میں تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے مقامی شجرہ نسب اور رسومات، افسانے اور تاریخی ماخذ کو ایک ثقافتی برادری کے مربوط حصوں کے طور پر سمجھا جاتا تھا، جس میں روم، لاطینی اور اتحادی جذب ہوتے تھے۔ حالانکہ اس تصور کو مستقبل کے مورخین میں پذیرائی نہیں ملی اور نہ ہی کیٹو کی ایک اور خاصیت یعنی کہ اس نے بظاہر اپنے کام کے بیشتر حصوں میں رومی قونصلوں اور دیگر مجسٹریٹس کے ناموں کو خارج کر دیا، کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کے باوجود، رومی ثقافت کی آزادی پر کیٹو کا زور، رومی اجتماعی اقدار کی اس کی تصویر کشی اور آخری لیکن کم از کم، سیاسی بیان بازی اور سخت گھریلو بحثوں پر اس کی توجہ اس حقیقت کو اجاگر کرتی ہے کہ تاریخ نویسی کیٹو کے ساتھ ایک نئے دور میں داخل ہوئی۔

2.3.3 گائس جولیس سیزر (Gaius Julius Caesar)

گائس جولیس سیزر (100-44 ق م) سیاسی مدبر، سپاہی اور مورخ تھا۔ اس نے رومی کیلنڈر کی تکمیل کی۔ جہاں تک فنی پہلوؤں کا

تعلق ہے توسوسی جنیس (Sosigenes) نے اس کا ہاتھ بٹایا لیکن یہ آج تک جولیس کے نام سے جولین کلینڈر کہلاتا ہے۔ جولین کلینڈر کی خصوصیات وہ چار سالہ دور ہے جس میں تین سالوں کی مدت 365 دن اور چوتھے کی 366 دن ہے اور یوں سال کی اوسط 365.25 دن ہو جاتی ہے۔ ان میں طویل تر سال لیپ (Leap) وہ ہے جس کی چار کے عدد پر تقسیم ہو جاتی ہے۔ پہلے جولین سال کی شروعات یکم جنوری 45 ق م (709 رومی) کو ہوئی۔

سیزر نے ایک کتاب علم ہیت پر بھی لکھی اور ایک مکتوب بھی جس میں پیائش پر بحث تھی۔ یہ دونوں تحریریں ضائع ہو چکی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ قواعد کی اصطلاح جس کی کوئی مثال یونانی زبان میں نہیں ملتی اسی کی رائج کردہ ہے۔ اس نے سلطنت روم کی پیائش کا ارادہ کیا اور افسران کو حکم دیا کہ عوام کے لیے کتب خانے کا انتظام کرے لیکن یہ دونوں تجاویز اس کی موت کے باعث رک گئیں۔

کیٹو سے متاثر ہو کر جولیس سیزر نے لاطینی زبان میں 'جنگ گال' لکھی۔ یہ کتاب لاطینی تہذیب کے بحر روم سے بحر اوقیانوس (Atlantic Ocean) تک پہنچنے کی داستان ہے۔۔ جولیس سیزر کا ہمعصر سالوست روم اور جو گرتھا کی جنگ کو پیش کرتا ہوا پر لطف انداز میں روم کو بچانے کی اپیل کرتا ہے. سیزر کی 'خانہ جنگی' غالباً اس کے کسی نائب کی تحریر کردہ ہے جو کہ اس کے اپنے عہد کی داستان ہے۔ یہ سادہ لہجے میں تحریر کردہ ہے۔ اس میں وہ افسانوی انداز میں بیان کرتا ہے کہ کس طرح وہ 49 قبل مسیح میں روم میں داخل ہوا اور پامپی کو شکست دی، اسپین کو سرنگوں کیا، قلوپطرہ کو مصر کے تخت پر بحال کیا اور کس طرح قلوپطرہ کے مخالفین کو تیونس میں شکست دی۔ اس کے دور کا خاتمہ ہو جاتا ہے جب اس کے مخالفین اسے رومی جمہوریت کا ڈکٹیٹر سمجھتے ہوئے 15 مارچ 44 ق م میں روم میں قتل کر دیتے ہیں۔

2.3.4 سالوسٹ (Sallust)

دوسرا اہم مورخ سالوسٹ تھا جو رومی سیاست میں پوری طرح الجھا ہوا تھا۔ یہ جولیس سیزر کے حامیوں میں سے تھا اور اس کے قتل کے بعد گوشہ نشیں ہو گیا اور رومی سلطنت کی تاریخ لکھنی شروع کی۔ اس کی تاریخ کا سب سے اہم پہلو رومی سلطنت کے سیاسی اداروں کا زوال ہے۔ یہ ادارے خانہ جنگی اور سازشوں کی وجہ سے اپنی عزت و وقار کھو چکے تھے۔ پولی بیس چونکہ چیزوں کو معروضی طور پر دیکھتا تھا اور واقعات پر اپنی کوئی رائے نہیں دیتا تھا، جبکہ سالوسٹ نہ صرف اپنی رائے دیتا ہے بلکہ رومی سلطنت کے اخلاقی زوال پر تبصرہ بھی کرتا ہے۔ یہاں ہم تاریخ نویسی میں دو رجحانات کو دیکھتے ہیں۔ ایک وہ جو پولی بیس نے اختیار کیا اور دوسرا جس کو سالوسٹ نے اپنایا۔ اس پر آج بھی مورخ بحث کر رہے ہیں کہ کیا تاریخ کو محض ماضی کے واقعات بتانے کا ذریعہ بنانا چاہیے یا ماضی کے بیان کے ساتھ ہونے والے واقعات کی تشریح اور توجیہ بھی کرنا چاہیے۔

2.3.5 کونٹس کرٹیس روفس (Quintus Curtius Rofus)

کونٹس کرٹیس روفس نے غالباً کاڈنیس (41-54 ق م) کے ماتحت فروغ پایا۔ وہ رومی خطیب اور مورخ تھا اور سکندر کی ایک سوانح حیات کا مصنف ہے۔ یہ کتاب دس فصلوں میں تھی اور اس کا انداز اگرچہ غیر ناقدانہ ہے مگر ادبی لحاظ سے نہایت خوب ہے۔ لیوی اور سنیکا

(Seneca) نے بھی اس سے استفادہ کیا۔ یہ تصنیف یونانی رومانیت اور رومی خطابت کا ایک بے مثل امتزاج ہے۔ کرٹیس شاید پہلا شخص تھا جس نے ایک غیر ملکی بحث پر قلم اٹھایا۔

2.3.6 لیوی (Livy)

رومی سلطنت کی تاریخ نویسی کا سب سے اہم مورخ لیوی (59ق م تا17ء) ہے۔ جس نے روم کی تاریخ کو روم کے قیام سے لے کر شہنشاہ آگسٹس (Augustus) کے زمانے تک لکھا جو کہ رومی سلطنت کی تاریخ کے لیے اہم دستاویز ہے۔ لیوی بذات خود نہ تو کسی سیاست میں ملوث تھا اور نہ ہی اس کی لکھی ہوئی تاریخ خوشامدانہ ہے۔ اس نے تاریخی ماخذوں کو احتیاط کے ساتھ استعمال کیا ہے اور روم کے ماضی کو ایک شاندار ماضی بتاتے ہوئے رومی قوم کے کردار اور ان کے اوصاف کو بیان کیا ہے کہ جن کی بنیاد پر رومیوں نے فتوحات کیں اور ایک وسیع سلطنت کی بنیاد ڈالی، لیکن ساتھ ہی میں وہ یہ بھی خبردار کرتا ہے کہ اگر رومیوں نے اپنے کردار کو چھوڑا تو ان کی سلطنت زوال پذیر ہو جائے گی۔

لیوی رومیوں کی کامیابیوں میں ان کے اداروں کو بھی اہمیت دیتا ہے، کیونکہ یہ وہ ادارے تھے جو رومی جنرلوں، سیاست دانوں اور امراء پر نظر رکھتے تھے جب تک سنیٹ اور کونسل کے ادارے مضبوط رہے، رومیوں کو فتوحات ہوتی رہیں۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ جب ریاست کے ادارے کمزور ہو جائیں تو اس صورت میں سماج کا زوال ہو جاتا ہے۔ لیوی کے اس نظریے کو رومی سلطنت میں ہم اس وقت دیکھتے ہیں کہ جب رومی سالار، فوج کو رشوت دے کر بادشاہ بنتے تھے اور بادشاہت کی باقاعدہ نیلامی ہوتی تھی۔

لیوی کی تاریخ کی ایک اہمیت یہ ہے کہ اس نے یونانی مورخوں کی طرح تاریخ کو ذاتی مشاہدوں یا زبانی سنے سنائے واقعات پر نہیں لکھا ہے، بلکہ اس نے تاریخ نویسی میں ماخذ اور حوالہ جات کو روشناس کرایا ہے، جس کی وجہ سے تاریخ نویسی میں واقعات کو تصدیق کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔

لیوی کی تاریخ کو نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کے زمانے میں مقبولیت ملی۔ چھاپہ خانہ (Printing Press) کی ایجاد کے ساتھ ہی اس کی اشاعت ہوئی۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر میکیاولی (م1527ء) نے بھی لیوی کی تاریخ پر اپنے خیالات کو پیش کیا ہے، جس کی وجہ سے تاریخ نویسی کو عملی طور پر سمجھنے میں آسانی پیدا ہوتی ہے۔

لیوی نے اپنی 'ابتدائی روم کی تاریخ' میں شاعرانہ انداز میں رومی جمہوریہ کی عظمت کے گیت گائے۔ یہ تاریخ نثر میں رزمیہ بیان ہے۔ اس میں وہ روم کی ابتداء، ابتدائی تاریخ، پہلے سات بادشاہوں کے حالات، رومی جمہوریت کے قیام، حصول اقتدار کی باہمی جنگوں اور فرانس و یورپ کی مہموں سے فراغت کے واقعات نہایت تفصیل کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ رومیوں کی مشہور کہانی اور اس قسم کی دیگر بہت سی افسانوی داستانیں بیان کرتا ہے۔ زیادہ تر کہانیاں یونانی ادب سے اخذ شدہ ہیں جنہیں رومی تمدن کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔

لیوی اپنے زمانے کی برائیوں کو پیش کرتا ہے اور اسے یہ یقین تھا کہ رومی جمہوریت ان تمام برائیوں پر غالب آجائے گی۔ وہ واقعات کی تفصیل کے معاملہ میں بہت لاپرواہ ہے۔ اس کے حالات زندگی کے بارے میں بھی بہت کم معلوم ہے۔ مگر وہ ایک عہد ساز دور میں زندہ رہا۔

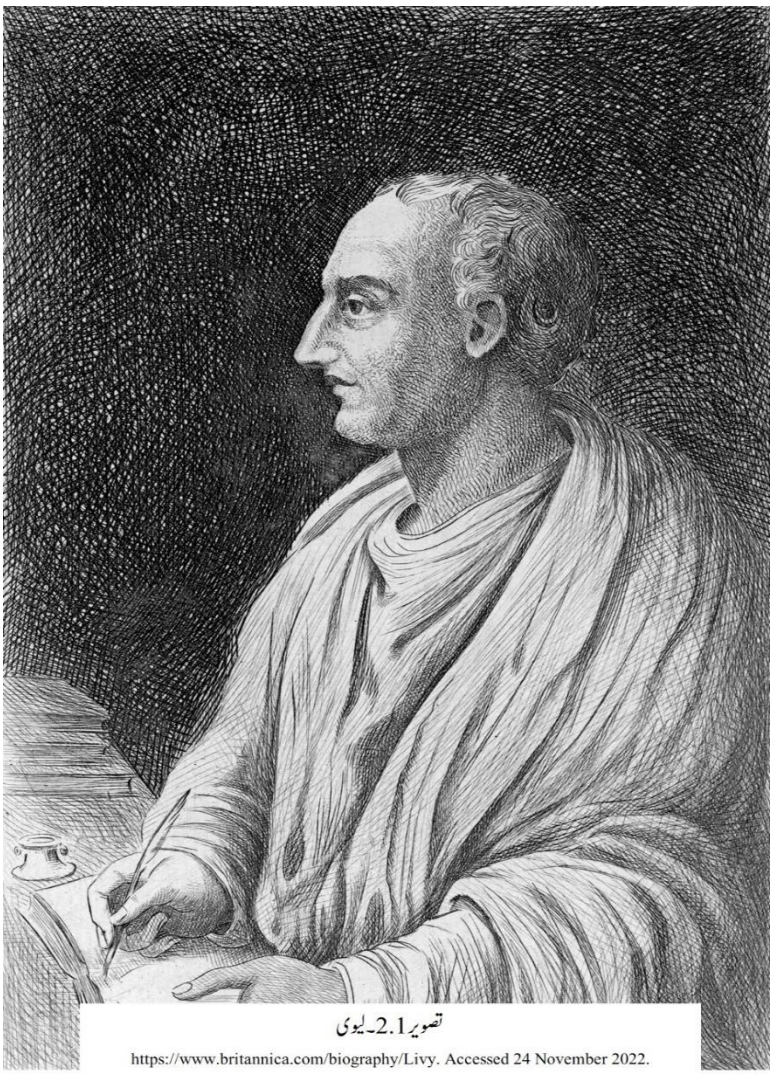

تصویر 2.1۔ لیوی

https://www.britannica.com/biography/Livy. Accessed 24 November 2022.

اس نے 'روم کی تاریخ' کو 142 جلدوں میں مرتب کیا جن میں سے صرف 35 دستیاب ہیں۔ اس نے 23 سال کی عمر میں تاریخ لکھنی شروع کی اور مسلسل چالیس برس تک اپنی موت تک لکھتا رہا۔ اس کی تاریخ زیادہ طور پر ادبی تاریخ ہے۔ لیوی کو روم کی ابتدائی عہد کی تاریخ لکھتے وقت کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مثال کے طور پر روم کی تاریخ کے ابتدائی دستاویز، روم اور گالیہ (فرانس) کی ابتدائی جنگوں میں برباد ہو چکے تھے کیونکہ 376 قبل مسیح میں گالیہ کے وحشی قبائل کی روم پر فتح کے وقت روم کو نذر آتش کر دیا گیا تھا جس سے اکثر دستاویز جل کر راکھ ہو گئے۔ اس لیے لیوی کو پہلی چھ جلدوں میں خصوصاً ادبی تاریخ کے لیے قصوں کہانیوں سے مدد لے کر روم کی تاریخ مکمل کرنی پڑی۔ تاہم لیوی تاریخ نویسی کے لیے حقائق و واقعات کی درستگی کا نظریہ پیش کرتا ہے اور مورخ کی غیر جانبداری پر زور دیتا ہے کہ وہ ہر حال میں سچائی کا دامن نہ چھوڑے۔ چنانچہ وہ بیان کرتا ہے کہ :

''مطالعہ تاریخ بیمار قوموں اور ذہنوں کے لیے بہترین اکسیر (دوائی) کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاریخ میں مختلف اقوام کے تجربات کا اندراج ہوتا ہے۔ اس میں اپنے اور اپنی قوم کے لیے مفید ترین تجربے کا انتخاب کیا جاسکتا ہے اور غلط تجربات سے پرہیز کیا جاسکتا ہے۔''

لیوی کی 'روم کی تاریخ' جیسی ضخیم کتاب پھر کبھی نہیں لکھی گئی۔ اس نے اپنے چند ماخذوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کا طرز تحریر مبالغے سے بری ہے لیکن وہ اپنے ماخذوں کی صداقت کو بلا ثبوت مان لیتا تھا۔ اسکے ہر لفظ سے وطن پرستی کا اظہار ہوتا ہے اور وطن پرستی کی تلقین کو وہ اپنا فرض سمجھتا ہے۔ اس نے افسانوں کو بھی اپنی تاریخ میں جگہ دی۔ لیوی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے رومیوں کی ابتداء سے لے کر اپنے زمانے تک تاریخ لکھی اور واقعات کو مسلسل بیان کیا۔ گویا رومیوں کے لیے یہ تاریخ دراصل 'تاریخ عالم' تھی کیونکہ رومیوں کا عقیدہ تھا کہ ان کے مورث اعلی دیوتا تھے لیکن لیوی نے رومیوں کو محض انسان قرار دیا جیسا کہ لیوی تحریر کرتا ہے کہ

''روم کے عروج سے پیشتر واقعات جو ہم تک پہنچے ہیں وہ قدیم افسانوں کی صورت میں ہیں تاریخی دستایزات کی صورت میں نہیں۔ یہ افسانے شاعری سے پر ہونے کی وجہ سے بڑے دلکش ہیں۔ میں ان افسانوں کی نہ تصدیق کروں گا اور نہ ہی تردید۔ کوئی وجہ نہیں کہ میں ان افسانوں پر اعتراض کروں جب کہ قدیم طریقے کے مطابق ان افسانوں میں انسانی عنصر کے ساتھ ساتھ خدائی عنصر بھی رہا ہے۔ اس خدائی عنصر سے ماضی بڑا شاندار ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی قوم دعوی کرتی ہے کہ اس کی ابتداء الوہیت سے ہوئی تو وہ صرف ہماری قوم ہے۔ رومی قوم نے اپنی لڑائیوں کے ذریعہ جو عظمت حاصل کی ہے وہ ایسی ہے کہ ان کا یہ دعوی کہ ان کی قوم کے بانی کا باپ مریخ ستارہ خود تھا۔ دیگر قوموں کو اس طرح مان لینا چاہئے جس طرح وہ رومی حکومت کو تسلیم کرتے ہیں۔''

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ لیوی نے واقعات کے ساتھ افسانے بھی شامل کر دیے لیکن ساتھ ہی یہ رومی مورخ محسوس کرتا ہے کہ اب اس کی قوم روبہ زوال ہے۔ اس کی وجہ بقول لیوی کا کہنا ہے کہ ''اب رومی سیدھی سادھی زندگی کو چھوڑ کر عیش و عشرت اور دولت کی مستیوں میں محو ہو گئے ہیں۔ چنانچہ اس مورخ کو اب اپنی قوم کا زوال صاف نظر آتا ہے۔

2.3.7 ٹیسی ٹس (Tacitus)

لیوی کے بعد جس مورخ نے رومی تاریخ کو اپنے مشاہدات کی روشنی میں لکھا ہے وہ ٹیسی ٹس (56تا120ء) ہے۔ اس کی تاریخ شہنشاہ نیرو (Neru) کے بعد شروع ہوتی ہے، جب رومی سلطنت کی سیاست میں انتشار، سیاسی سازشیں اور امراء کے درمیان قتل وغارت گری روزمرہ کا معمول بن جاتی ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے کہ جب رومی سلطنت اور جرمن قبائل میں جنگیں ہوتی ہیں۔

ایک وقت تھا کہ جب رومیوں نے جرمن قبائل کو شکست دے کر ختم کر دیا تھا، لیکن ٹیسی ٹس کے زمانے میں صورت حال تبدیل ہو گئی تھی۔ رومی سلطنت اندرونی طور پر کمزور ہو رہی تھی۔ اس کے حکمران طبقے بدعنوانیوں میں ملوث تھے۔ اس لیے جب ٹیسی ٹس نے جرمن قبائل کی تاریخ لکھی تو نہ صرف ان کی بہادری کی تعریف کی، بلکہ اس بات پر بھی زور دیا کہ وہ نسلاً خالص ہیں اور کسی دوسری نسل

نے ان کو آلودہ نہیں کیا ہے۔ ٹیسی ٹس کے اس نظریے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو قومیں اپنی نسلی خالصیت کو ختم کر کے دوسری قوم سے ملاپ کرتی ہیں تو اس کے نتیجے میں ان کا کردار کمزور ہو جاتا ہے، لیکن جو قومیں اپنی نسلی پاکیزگی کو برقرار رکھتی ہیں ان کے کردار میں کوئی فرق نہیں آتا ہے۔ ٹیسی ٹس کے ان نظریات کی بنیاد پر ہم موجودہ دور میں پیدا ہونے والے نسلی تعصبات کو سمجھ سکتے ہیں۔

آسٹریا کی راجدھانی ویانا میں پارلیامنٹ کی عمارت میں نصب ٹیسی ٹس کا مجسمہ

ٹیسی ٹس نے اپنی پہلی تاریخی تصنیف *Histories* میں چھ رومی شہنشاہوں کے زمانے کے حالات لکھے ہیں لیکن اس کی نظر زیادہ تر شہر روم تک محدود رہی۔ اس کے خیال میں رومیوں کا اصل فرض حکومت کی تنظیم نہیں بلکہ فتوحات ہیں۔ ٹیسی ٹس پہلی صدی عیسوی میں روم کی تاریخ اور رومی جمہوریہ کا ایسا قابل قدر مورخ ہے کہ جس کے نظریہ تاریخ اور اسلوب تاریخ نویسی کو اس عہد جدید میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ لیوی کے پچاس سال بعد ٹیسی ٹس نے اپنی تاریخ میں بلند ترین ادبی معیار کو برقرار رکھا۔ اس نے روم کے زوال کو اپنی کتاب *Annals* میں پیش کیا۔ اس نے اپنے عہد کے علاوہ اپنے سے پہلے دور کے بھی حالات قلمبند کیے۔ وہ بیک وقت کئی امور کا ماہر تھا۔ وہ خطیب، جاگیر دار سیاستدان اور بالآخر مورخ تھا۔ جس وقت اس نے سیاست سے کنارہ کشی کر کے تاریخ نویسی کو باقاعدہ طور پر اپنایا تو اس کی سیاسی زندگی پورے جوبن پر تھی۔ اس کے زمانے میں روم کا دور جمہوریت ختم ہو چکا تھا اور مطلق العنانیت قائم ہو چکی تھی لیکن دور جمہوریت کی آزادی کی یاد لوگوں کے دلوں میں اب بھی موجزن تھی۔ چنانچہ وہ ایام رفتہ کا رونا روتا ہے اور اپنے زمانے کو دور غلامی کہتا ہے لیکن دور جمہوریت کو واپس لانے کی کوئی تجویز پیش نہیں کرتا۔ لہذا اس کی تاریخ سبق آموز نہیں کہی جا سکتی جیسا کہ وہ خود بیان کرتا ہے:

'اس عرصے میں شہر روم کے باشندے غلامی میں غرق ہو گئے۔ جن میں کونسل ممبران، سنیٹ اور امرا بھی شامل ہیں۔ جس کا جتنا اونچا عہدہ ہے وہ اسی حساب سے دکھاوا کرتا ہے۔ یہ لوگ اپنے چہروں سے نہ کسی شہنشاہ کی موت پر اظہار غم کرتے ہیں اور نہ اس کے جانشین کی تخت نشینی پر اظہار خوشی کرتے ہیں بلکہ اپنی خوشامد میں خوشی اور غم دونوں شامل کرتے ہیں۔'

وہ ٹائبرس اور نیرو کے مظالم کو دردناک انداز میں پیش کرتا ہے اور روم کے مہذب لوگوں پر 'جرمینیا' کے جنگلوں کی وحشی زندگی کو ترجیح دیتا ہے۔ ٹیسی ٹس ایک اخلاقی مورخ تھا اور اس نے تاریخ سے وہی کام لیا جو 'جو ویل' نے شاعری سے لیا تھا۔ ٹیسی ٹس نے نصرانیت پر غور و فکر کرنے کو رومی فطرت کے منافی خیال کیا لیکن چوتھی صدی عیسوی میں روم عیسائی ہو گیا۔ ٹیسی ٹس کے مطابق تاریخ کا علم ہر آدمی کے لیے ضروری ہے کیوں کہ یہ اخلاق و کردار کی تعمیر کرتا ہے اور وہ اسے سبق آموز ماضی کی حقانیت کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ وہ تاریخ کو اخلاق کا ہی حصہ سمجھتا ہے اور اسے ادب سے الگ تصور نہیں کرتا۔

2.4 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ نے قدیم دنیا میں تاریخ نویسی کے دوسرے مرحلے یعنی رومی تاریخ نویسی کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ رومی تاریخ نویسی کی روایت، یونانی تاریخ نویسی کی بنیاد پر قائم ہوئی۔ پولی بیس جو کہ ایک یونانی تھا، روم اور یونان کی جنگ میں اسے قیدی بنا کر روم لے جایا گیا جہاں اس نے رومی دنیا کی تاریخ لکھی۔ اسی کی بنیاد پر بعد کے رومی مورخین جیسے جولیس سیزر، لیوی اور ٹیسی ٹس نے روم کی تاریخ لکھنے کی کوشش کی۔ یونانی تاریخ نویسی میں حقیقت پسندی اور تحقیق کو جو اہمیت حاصل تھی، وہ رومی تاریخ نویسی میں ختم ہوتی چلی گئی۔ واقعات کی تردید اور تنقید کے بجائے ہر واقعے کے تفصیلی بیان پر زور دیا جانے لگا۔ بلاشبہ روم کا سب سے بڑا مورخ یا روزنامچہ نگار لیوی تھا، جس نے متعدد ضخیم جلدوں میں روم کی تاریخ اس کی ابتدا سے اپنے دور تک لکھی۔ اس نے واقعات کو حتی الامکان غیر جانبدارانہ انداز سے

لکھنے کی کوشش کی اور واقعات کی جزئیات پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ البتہ لیوی سمیت رومی مورخین کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ جس طبقہ امرا یا شراف کے بارے میں لکھ رہے تھے وہ خود بھی اسی کا حصہ تھے اور اس دور کی سیاست میں شامل تھے۔ ایسے حالات میں ان سے مکمل غیر جانبداری کی توقع نہیں رکھی جاسکتی۔ پھر بھی قدیم دنیا کی تاریخ نویسی میں رومی مورخین کا اہم کردار ہے، کیونکہ یہ وہی تھے جنہوں نے رومی دنیا کے نام سے پہلی بار عالمگیر تاریخ نویسی کی کوشش کی۔

رومی مورخوں میں ایک خامی یہ تھی کہ ان میں سے زیادہ تر تنخواہ دار ملازم تھے یا پھر سردار تھے۔ یہ بڑے مہذب اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ رومیوں کی تہذیب پر یونانی رنگ چڑھ چکا تھا اس لیے انہوں نے یونانی اسلوب تاریخ نویسی اختیار کیا جس کے ساتھ یونانی مورخوں کی خامیاں بھی ان کی تاریخ نویسی میں داخل ہو گئیں۔ ساتھ ہی رومی مورخین نے تاریخی روزنامچے لکھ کر اس فن میں اضافہ کیا۔ جولیس سیزر نے خود نوشت لکھنے کا رواج شروع کیا۔ رومی مورخین نے خاص خاص واقعات کے متعلق علیحدہ رسالے لکھنے کا رواج بھی قائم کیا۔ جولیس سیزر کی 'فتح گال' اس قسم کی تاریخ کی بہترین مثال ہے۔ اس سے تاریخ کی وسیع النظری میں اضافہ ہوا۔ لہذا رسالہ نویسی سے سوانح نگاری کا دستور پیدا ہوا۔ تاریخ نویسی میں رومی مورخ، یونانی مورخوں کے نقال تھے جب یونانی رومیوں کے زیر نگیں ہو گئے تو یونانیوں نے اپنے رومی حکمرانوں کی خاطر تاریخ نویسی شروع کی مگر یہ رومی نما یونانی ہیروڈوٹس اور تھوسی ڈائیڈز کے انداز پر تاریخ نویسی نہ کر سکے۔

2.5 کلیدی الفاظ (Keywords)

پامپی : قدیم اٹلی کا شہر / ایک فوجی کمانڈر

ٹائبرس : رومی حکمراں

نیرو : رومی حکمراں

2.6 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

2.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. روم کس ندی کے کنارے آباد تھا؟
2. رومی سلطنت اپنے عروج کے دور میں کتنے لاکھ مربع میل کے رقبہ پر پھیلی ہوئی تھی؟
3. جولیس سیزر کون تھا؟
4. پولی بیس کہاں کا رہنے والا تھا؟
5. ٹائبرس اور نیرو کون تھے؟
6. روم کی تاریخ کس کی تصنیف ہے؟

7. پامپی کی خصوصیت کیا تھی؟
8. ''مطالعہ تاریخ بیمار قوموں اور ذہنوں کے لیے بہترین اکسیر (دوائی) کی حیثیت رکھتا ہے'' کس نے کہا؟
9. لیوی کی وفات کب ہوئی؟
10. ٹیسی ٹس کی کتاب کا نام بتائیے۔

2.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. جولیس سیزر پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. کرٹیس روفس پر ایک نوٹ لکھیے۔
3. پولی بیس کے بارے میں ایک مضمون لکھیے۔
4. سالوسٹ کے بارے میں ایک مضمون لکھیے۔
5. رومی تاریخ نویسی کی کوئی دو خصوصیات بیان کیجیے۔

2.6.2 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. لیوی کے بارے میں ایک تفصیلی مضمون قلمبند کیجیے۔
2. ٹیسی ٹس کے بارے میں ایک تفصیلی مضمون قلمبند کیجیے۔
3. رومی تاریخ نویسی کے اہم خدوخال کی وضاحت کیجیے۔

2.7 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. Aili, Hans., *The Prose Rhythm of Sallust and Livy*. Stockholm: Almqvist & Wiksell. 1979.
2. Damon, Cynthia., "Rhetoric and Historiography." In *A Companion to Roman Rhetoric*. Edited by W. Dominik and J. Hall, 439-450. Oxford Blackwell Publishers. 2006.
3. Eckstein, Arthur M., *Moral Vision in the Histories of Polybius*. Berkeley: University of California Press. 1995.
4. Humphries, Mark., "In Mommsen's Shade: Roman Historiography, Past and Present." *Classics Ireland*, 9: 28-45. 2002.
5. Kraus, Christina Shuttleworth, John Marincola, C.B.R. Pelling, and A. J. Woodman eds., *Ancient Historiography and Its Contexts: Studies in Honour of A. J. Woodman*. Oxford, Oxford University Press. 2010.

6. Kraus, Christina Shuttleworth, and A. J. Woodman., *Latin Historians.* Oxford, Oxford University Press. 1997.
7. McDonald, A. H., "Theme and Style in Roman Historiography." *Journal of Roman Studies*, 65:1–10. 1975.
8. Mehl, Andreas., *Roman Historiography: An Introduction to its Basic Aspects and Development*. Translated by Hans-Friedrich Mueller. Chichester, UK: Wiley-Blackwell Publishing. 2011.
9. Usher, Stephen, *The Historians of Greece and Rome.* New York: Taplinger. 1970.
10. Vasaly, Ann, "Characterization and Complexity: Caesar, Sallust, and Livy." In *The Cambridge Companion to the Roman Historians.* Edited by Andrew Feldherr, 245–260. Cambridge, UK, Cambridge University Press. 2009.

اکائی 3۔ چینی تاریخ نویسی

(Chinese Historiography)

اکائی کے اجزا

3.0		تمہید
3.1		مقاصد
3.2		دانشور افسران یا مورخ
3.3		تاریخ نویسی کی روایت کا ارتقا
	3.3.1	بہار اور خزاں کے وقائع
	3.3.2	سوچوان
	3.3.3	سوما چین
	3.3.4	پان کو
	3.3.5	تانگ عہد میں تاریخ نویسی
	3.3.6	سوما کوانگ
	3.3.7	ہسیا چانگ
3.4		تاریخی نظریات
	3.4.1	شاہی خاندانوں کی تاریخ
	3.4.2	مسلسل تاریخ
3.5		چینی تاریخ نویسی کی روایت کی خصوصیات
	3.5.1	سرکاری تاریخ
	3.5.2	رہنمایانہ تاریخ
	3.5.3	معیاری نمونہ
	3.5.4	معروضیت اور دیانت داری

3.6 اکتسابی نتائج
3.7 کلیدی الفاظ
3.8 نمونہ امتحانی سوالات
3.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
3.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
3.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
3.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

3.0 تمہید (Introduction)

کہا جاتا ہے کہ 'چین' نے ایک تاریخی ادب تیار کیا، جو اپنی خوبیوں اور حدود دونوں لحاظ سے مخصوص ہے لیکن اپنی پیداوار کے حجم اور ریکارڈ کی لمبائی اور تسلسل میں منفرد ہے۔ چینی تاریخ نویسی کی مسلسل تاریخ کم از کم کنفیوشس کے زمانے تک جاتی ہے اور اپنی روایتی شکل میں یہ چینی سلطنت کے طور پر، یعنی بیسویں صدی کے اوائل تک باقی رہی۔ تاریخ نویسی کے مغربی طلباء کی طرف سے اس پر بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ بلاشبہ جزوی طور پر اس کی وجہ اس کو حاصل کرنے میں آنے والی مشکلات ہیں، کیونکہ چینی کوئی آسان زبان نہیں ہے اور کوئی بھی صرف اس کی تاریخی روایت کی نوعیت اور معیار کا نمونہ لینے کے لیے اسے سیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرے گا اور نہ ہی یورپی زبانوں میں چینی تصنیفات کا بہت زیادہ ترجمہ ہوا ہے۔ یہاں تک کہ جو بھی ترجمہ کیا گیا ہے اس کا زیادہ تر حصہ کسی ایسے شخص کے لیے بہت کم معنی رکھتا ہے جو پہلے سے ہی چینی تاریخ اور ثقافت کے بارے میں کافی حد ناواقف ہو۔ اس کے باوجود چینی تاریخ نویسی، دنیا کی دیگر دو عظیم تاریخی روایات، مغربی اور اسلامی سے کہیں زیادہ حد تک 'ثقافت سے منسلک' ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ نہ یہ ان سے متاثر ہوئی ہے اور نہ ہی اس نے خود ان کو کسی خاص حد تک متاثر کیا ہے۔ چینی تاریخی روایت کے اثرات بنیادی طور پر مشرقی ایشیا میں کوریا، جاپان اور ویتنام کی تاریخی روایات تک محدود تھے، کیونکہ یہ ممالک چین کی نوآبادیات میں شامل تھے یا اس کے قریب واقع تھے۔

چینی تاریخ نویسی کوئی بہت مذہبی 'نہیں ہے۔ یہ جو کہانیاں سناتی ہے ان کا تعلق انبیاء، مافوق الفطرت، جادو یا معجزات سے نہیں ہے۔ تاہم، اس کا کنفیوشس مسلک کے ساتھ گہرا تعلق ہے، جو کہ حکام کے مذہب کے بجائے ان کے نظریات پر مشتمل ہے۔ یہ وہی دانشور افسران تھے جنہوں نے تاریخ لکھی اور پڑھی۔ روایتی رسم و رواج اور خاندانی تسلسل کے ساتھ اسی طرح کے تعلق سے، کنفیوشس مت، ناگزیر طور پر، ماضی اور اس کی فراہم کردہ نظیروں میں گہری دلچسپی رکھتا تھا۔

یہ کہا گیا ہے کہ کنفیوشس کے لیے، تاریخ نے کسی نہ کسی لحاظ سے مقدس تحریروں کی جگہ لی جو دوسری ثقافتوں میں بہت مرکزی

حیثیت رکھتے تھے۔تاریخ نویسی کی ابتدا کنفیوشس سے بھی پہلے کی ہے۔آباؤاجداد کی عبادت اس عظیم دانشور سے پہلے بھی موجود تھی اور اس کے لیے کم از کم خاص طور پر شاہی گھرانوں کے نسب ناموں کے تحفظ کی ضرورت تھی۔221 قبل مسیح میں پہلے شہنشاہ کے ذریعے چین کے اتحاد سے پہلے چین کو جن ریاستوں میں تقسیم کیا گیا تھا ان میں سے مختلف نے تاریخی روزنامچوں کو محفوظ رکھا۔

3.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- چین میں تاریخ نویسی کی روایت کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- مختلف مورخین کی تصنیفات سے واقف ہو سکیں گے۔
- چینی تاریخ نویسی کی خصوصیات سے واقف ہو سکیں گے۔
- چین میں تاریخ نویسی کی سرکاری سرپرستی کا جائزہ لے سکیں گے۔

3.2 دانشور افسران یا مورخ (The Scholar Bureaucratic, or Historian)

چین میں تاریخ نویسی کا کام دانشوروں نے انجام دیا۔یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے لیکن روایتی چین کے بارے میں جو امتیازی بات ہے وہ یہ ہے کہ وہ دانشوران، سرکاری افسران بھی تھے۔حالانکہ اپنی تاریخیں تحریر کرتے وقت حقیقی طور پر وہ کسی سرکاری عہدہ پر فائز نہیں تھے، تاہم وہ اس طور پر سرکاری ضرور تھے کہ یا تو وہ ریٹائر ہو چکے تھے یا سرکاری عہدوں کے خواہش مند تھے۔چینی تاریخ کے ماہر ایشین بلاز (Etienne Balasz) نے یہی تحریر کیا ہے۔بلیزہی نے چینی تاریخ نویسی کی مختصر تعریف یوں بیان کی ہے 'سرکاری عہدیداروں کے لیے سرکاری عہدیداروں کی تحریر کردہ تاریخ۔'

اس کا عملاً مطلب یہ ہے کہ چینی تاریخ نویسی صرف اس شہنشاہی ریاست کے مسائل کو ہی اجاگر کرتی ہے، جس کے یہ دانشور ملازم تھے یا رہے تھے۔اس طرح شہنشاہ اور اس کے حکمراں گھرانے کی حکومت کو جائز ثابت کرنا ہی ان کے لیے اہم مسئلہ تھا۔اعلیٰ خوبیوں کے حامل افراد کی حکومت سے کنفیوشس مت کے حامیوں کا مطلب یہ تھا کہ ایک شہنشاہ کے لیے مناسب نہیں ہے کہ حکومت کرنے کے اپنے حق کو اقتدار پر اپنے اعزا اور اقربا کے قبضہ کے لیے استعمال کرے۔مسئلہ یہ نہیں تھا کہ کیسے ایک شہنشاہ یا شاہی سلسلہ برسر اقتدار آیا بلکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ اچھی طرح مروجہ کنفیوشس مت کے اصول اور روایت کے مطابق وہ ہمیشہ اقتدار پر بنے رہنے کا جواز پیش کریں۔لہذا پچھلے شاہی خاندانوں یا پچھلے حکمرانوں کی تاریخ اس طرح لکھنا کہ موجودہ حکمراں کے وقار میں اضافہ ہو اور جانشینی کے دور میں اس کی شان و شوکت کو یقینی بنا دینے کا سبب ہو، یہ سرکاری دانشور مورخ کے لیے اہم مسئلہ تھا۔تاریخ کے بڑے کام، عام طور پر حکمرانوں کی امداد یافتہ تھے یا انہوں نے ان کی نگرانی کی تھی۔

موجودہ حکمرانوں کے حق میں اس تعصب کے باوجود بلاز کے مطابق چینی تاریخ نویسی اکثر ایک درجہ تک معروضیت کا ثبوت دیتی ہے جو کہ ان حالات میں غیر معمولی تھا۔ گیارہویں صدی کے ایک عظیم تاریخی کام میں مذکور اس قصہ سے کافی حد تک یہ وضاحت ہوتی ہے کہ اگر سرکاری تاریخ نویس مصمم عہد کر لیتے تو وہ اپنے فیصلہ کی آزادی کو محفوظ رکھ سکتے تھے:

تانگ خاندان کے شہنشاہ ٹائی تسونگ (T'ae-tsung) نے شاہی محتسب چوسوئی لیانگ (Ch'u sue-liang) سے کہا تھا: تم چونکہ کام اور کاروائی ہر چیز کے بارے میں دفتر میں موصول ہونے والے روزنامچوں کے ذمہ دار ہو (شہنشاہ کی سرگرمیوں کے جسے شاہی مورخین تیار کرتے تھے) کیا میں دیکھ سکتا ہوں کہ تم نے کیا لکھا ہے؟ سوئی لیانگ نے جواب دیا: تاریخ نویس لوگوں کے اور حکمراں کے اقوال اور اعمال کو لکھتے ہوئے ان تمام چیزوں کو بھی تحریر کر دیتے ہیں جو اچھی یا بری ہوں۔ وہ ایسا اس امید میں کرتے ہیں کہ حکمراں کوئی برائی نہیں کر سکے لیکن یہ تو عجیب و غریب بات ہوئی کی حکمراں خود ہی دیکھے کہ اس کے بارے میں کیا کچھ لکھا گیا۔ شہنشاہ نے کہا: اگر میں کوئی ایسا کام کروں جو اچھا نہ ہو تو تم اسے بھی لکھو گے؟ سوئی لیانگ نے جواب دیا، میرا کام تو بس قلم چلانا ہے میں کیسے ہمت کر سکتا ہوں کہ اسے دیکھوں؟ ایک شاہی مورخ لیو چی (Liu Chi) آگے لکھتا ہے کہ حالانکہ سوئی لیانگ اس حکایت کو لکھ نہیں سکا تاہم ریاست میں ہر کسی کو پتہ ہے کہ شہنشاہ نے کیا جواب دیا تھا۔ اس نے کہا تھا "ٹھیک ہے۔"

اس حکایت سے مورخین کے ایک دوسرے مسئلہ کی بھی وضاحت ہوتی ہے وہ یہ کہ وہ حکمرانوں اور سرکاری عہدیداروں دونوں کو سکھانے کا کام بھی کرتے تھے اس کے لیے وہ ان کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے مطلوب اطلاعات ان کو فراہم کرتے تھے اور ماضی کے تجربات سے سبق اخذ کرتے تھے۔ اس معروف تاریخی کام کا نام جس سے اس اقتباس کو لیا گیا ہے حکومت کی مدد کے لیے معاون آئینہ (Comprehensive Mirror for the Aid of Government) ہے۔ ریاستی مسائل کا دائرہ جس قدر بعد کے شہنشاہی عہد تک پھیلا اسی قدر مورنین کے قلم کے لیے مناسب خیال کیے جانے والے معاملات کا دائرہ بھی وسیع ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ بعد کی تاریخ کے بہت سے کام حقیقی طور پر ضخامت اور خیال کی وسعت کے اعتبار سے عمل میں معلومات سے پر ہیں۔

3.3 تاریخ نویسی کی روایت کا ارتقا (Evolution of Historiographical Tradition)

3.3.1 بہار اور خزاں کے وقائع (Annales of Autumn and Spring)

یہ ریاست لو کی ان تاریخوں میں سے ایک تھا، جسے 'بہار اور خزاں کے وقائع' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ روایتی طور پر مسلسل تاریخی روایت کے آغاز کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ خود ریاست یا تاریخ میں موجود معلومات کی وجہ سے اتنا زیادہ اہم نہیں ہے بلکہ اس وجہ سے کہ اسے غالباً کنفیوشس نے خود ترمیم کیا تھا اور اس طرح اس نے ایک ایسا نمونہ فراہم کیا جسے کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس میں 722 سے 481 قبل مسیح کے سالوں کا احاطہ کیا گیا ہے اور یہ بنیادی طور پر عظیم واقعات کی خاص طور پر وہ جو رسمی اہمیت کے ہیں، سادہ

دستاویز ہے۔ جو بات واقعی اہم تھی وہ یہ کہ کنفیوشس نے تدوین کے عمل میں، الفاظ اور اصطلاحات کے محتاط استعمال سے، تعریف اور الزام تراشی کا ایک اہم معیار متعارف کرایا تھا۔ ہر کسی کو، یہاں تک کہ چین میں بھی اس کو سمجھنا آسان نہیں ہے اور ایک قدیم خیال ہے کہ کنفیوشس حقیقت میں اینالز کو کلاسیکی نصابی کتاب کے طور پر استعمال کرنا چاہتا تھا۔

جیسا بھی ہو ایک مورخ کے طور پر کنفیوشس کی سرگرمیوں کے بارے میں اس عقیدے کی ایک وراثت، یہ تصور تھا کہ تعریف اور الزام کی تقسیم مورخ کے فرائض میں سب سے اونچے درجے پر ہے- یہاں تک کہ بہت سے مورخین عملی طور پر خود کو کنفیوشس کی مانند رکھنے میں ہچکچاتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بہار اور خزاں کے وقائع میں کنفیوشس کے پیغام نے واقعی اس پر متعدد تشریحات کو جنم دیا جو کہ کنفیوشس کے کئی صدیوں بعد ہان دور (206ق م تا220ء) کے دوران ظاہر ہوتی ہیں

3.3.2 سوچوان (Tso-chuan)

ان سب سے قدرے ہٹ علیحدہ 'Tso-chuan' یا Tso کی روایت ہے۔ یہ کنفیوشس کے 'اینالز' سے زیادہ واقعات سے بھرپور ہے اور تھوڑا طویل عرصہ پر محیط ہے۔ اس میں دیگر تبصروں کے مقابلے میں اخلاقی حصہ کافی کم ہے اور بنیادی طور پر بیانیہ انداز میں لکھا ہوا ہے اور اکثر یہ بیانیہ بہت واضح ہے۔ اسے چینی ادبی نثر کا پہلا عظیم شاہکار مانا جاتا ہے، حالانکہ یہ مکمل طور پر واضح نہیں ہے کہ اسے تاریخ کے طور پر درجہ بندی کیا جانا چاہیے یا نہیں۔ اس کا ایک بڑا حصہ اس دور سے کافی پہلے ماضی کی عظیم شخصیات کے بارے میں افسانوی یا نیم افسانوی کہانیوں پر مبنی ہو سکتا ہے۔

3.3.3 سوماچین (Ssu-ma Ch'ien)

چینی تاریخ نویسی میں اہم پیش رفت سوماچین (تقریباً145 سے85ق م) اور اس کے والد سُوماتان (Ssu-ma T'an) کے کاموں سے ہوئی۔ سوماچین نے اپنے باپ کے کام کو جاری رکھا اور مکمل کیا۔ ہان خاندان کے تحت متحد چین میں دونوں نے یکے بعد دیگرے عظیم محرر یا عظیم مورخ (T'ai shih) کا موروثی عہدہ سنبھالا۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ ابتدائی دور سے لے کر اپنے دور تک چینی تاریخ کے موجودہ مواد اور روایات کو ایک تصنیف میں یکجا کیا جائے۔ ایسا کرتے ہوئے انہوں نے ایک بنیادی نمونہ قائم کیا جس پر کچھ ردوبدل کے ساتھ 1911 میں سلطنت کے خاتمے تک چین کی سرکاری تاریخ لکھنے کے لیے عمل کیا گیا۔ یہ ایک حذف اور نقل (Scissors-and Paste) نقطہ نظر تھا۔ اس میں متعدد ذرائع سے مواد کو اکٹھا کیا گیا اور سوائے تلخیص (abridgement) کے بغیر کسی تبدیلی کے دوبارہ پیش کیا گیا۔ مورخ کے اگر کوئی ذاتی خیالات ہیں تو ان کو اس میں مکمل طور پر الگ تھلگ رکھا گیا۔

یقینی طور پر مناسب اقتباسات کے انتخاب میں مورخ کا فیصلہ ہی عمل میں آیا، اس لیے یہ ایک بہت سادہ تجویز ہو گی کہ ایسی کتاب کو بنیادی ماخذ یا مواد سمجھا جا سکتا ہے، بھلے ہی یہ اس کام سے جو مکمل طور پر مورخ کے اپنے الفاظ میں ہو، قریب تر ہو سکتا ہے۔ بعید ترین ادوار کے لیے، استعمال شدہ مواد میں سے کچھ کی صداقت یا اعتبار شاید مشتبہ رہا ہو، لیکن عصری تاریخ کے لیے ان باضابطہ سرکاری دستاویزات کو تمام فوائد

اور مشکلات کے باوجود استعمال کیا جا سکتا ہے۔

دوسرا پہلو جس میں دونوں نے ایک نمونہ قائم کیا وہ موضوعات کے مطابق مواد کی تنظیم ہے۔ چینی تاریخ Shih-chi (مورخ کے دستاویز) کو پانچ بنیادی حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔

1. سب سے پہلے بنیادی روزنامچے (pen-chi) آئے، جو شہنشاہوں کی زندگی اور دور حکومت کے اہم واقعات کو بیان کرتے ہیں۔
2. اس کے بعد تختیوں (piao) کا ذکر ہے جس میں ہان سلطنت کے اعلیٰ عہدوں پر تقرری، ہان سلطنت سے پہلے کے دور کے مختلف آزاد خاندانوں کی تاریخیں شامل ہیں۔
3. تیسرے حصے میں یک موضوعی بیانات (shu) آتے ہیں جو حکومت کے متعدد پہلوؤں جیسے کیلنڈر، رسومات اور موسیقی کا احاطہ کرتے ہیں۔
4. اگلے حصے، موروثی گھرانے (shih-chia) میں ہان سے پہلے کی متعدد ریاستوں کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ یہ ایک ایسا زمرہ تھا جس کو سوما چین کے جانشینوں نے متحدہ چین کی تاریخ لکھتے وقت ضروری نہیں سمجھا۔
5. سب سے لمبا حصہ، سوانح حیات (lieh-chuan) سب سے اہم حصہ تھا جو کہ اگرچہ زیادہ تر قابل ذکر افراد کی سوانح حیات پر مشتمل ہے، پھر بھی اس میں وہ باتیں بھی شامل ہے جن کو کہیں اور مناسب جگہ نہ ملی ہو، جیسے کہ بیرونی ممالک کے ساتھ تعلقات۔ سوانح عمریاں بعد کی سرکاری تاریخوں کا بڑھتا ہوا حصہ بنیں لیکن یہ جدید مغربی معنوں میں سوانح حیات نہیں تھیں۔ ان کے مضامین کو ان کی انفرادیت کے لیے نہیں جانا جاتا تھا جتنا کہ کسی گروپ یا طبقے کے ممبروں کی نمائندگی کے لیے جو چینی ریاست کی کارکردگی کے لیے اہم تھے۔

یہ سب کچھ علمی بے توجہی کا تاثر دے سکتا ہے اور در حقیقت بعد کی کچھ تاریخوں میں ایسا کیا بھی گیا۔ مثال کے طور پر جہاں تک پہلے شہنشاہ سے متعلق مواد کے کافی حصوں کا Raymond Dawson (1994) کے ترجمہ کا مطالعہ بہت واضح طور پر ظاہر کرتا ہے، جو کہ کسی بھی طرح سے سوما چئین کی تحریر جیسا نہیں ہے کیوں کہ وہ غیر معمولی طور پر متنوع اور پڑھنے کے لیے دلچسپ ہے۔

نہ صرف ڈھانچہ سے بلکہ ساچین نے جو طریقہ اختیار کیا، بعد کے مورخین نے اہم معاملوں میں اس طریقہ سے بھی استفادہ کیا۔ اس نے ان ذرائع کی اصل کی ایماندارانہ نقل تیار کرنے کا عمل شروع کیا جن وہ بھروسہ کرتا تھا اور جہاں کہیں ایک ہی موضوع یا واقعہ کے سلسلہ میں متعدد روایتیں تھیں یا مختلف روایتیں تھیں اس نے ان ساری روایات کی نقل تیار کی اور یہ حق قاری کو دیا کہ وہ اپنے آپ فیصلہ کرے۔ اس نے تحریر کے لیے وقائع کے تحت اور رسمی طریقہ سے پیچھا چھڑا کر اپنا صاف اور واضح طریقہ رائج کیا، اس کے بعد کے عظیم مورخین پان کو (Pan Ku) نے اسے زبردست خراج عقیدت پیش کی۔ اس عظیم مورخ کے بارے میں وہ رقمطراز ہے:

"تقریریں کرتا ہے مگر زیادہ الفاظ کا استعمال نہیں کرتا۔ وہ بالکل سادہ ہے مگر اجڈ گنوار نہیں ہے۔ اس کی تحریر براہ راست ہے، اس

کے حقائق بولتے ہیں وہ کسی چیز کو جھٹلاتا نہیں ہے اور برائی کو برائی قرار دینے سے احتراز نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تحریر ایک حقیقی دستاویز ہے۔"

3.3.4 پان کو (Pan Ku)

چین میں سرکاری تاریخ نویسی کو اگلے مرحلے میں لے جانے کا سہرا پان کو (32تا92ء) سر جاتا ہے۔ اس کی تاریخ ایک ذاتی سرگرمی کے طور پر شروع ہوئی۔ بھلے ہی بعد میں اسے سرکاری حیثیت اور حمایت دی گئی لیکن یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ سرکاری تاریخوں کے غلبہ کے باوجود چین کے پورے گزشتہ دور میں تاریخ نویسی کے تعلق سے ذاتی سرگرمیاں جاری رہیں۔ اپنے کام میں پان کو نے سابق ہان خاندان کی تاریخ (Han shu) لکھی اور اس دوران خصوصی طور پر ایک ہی خاندان کا ذکر کرتے ہوئے، وہ سوما چین کے قائم کردہ طرز سے ہٹ گیا۔ پان کو اس نئی قائم کردہ مثال کی بعد کے مورخین کے ذریعے پیروی کی گئی۔ چینی مورخین نے اپنے ملک کی تاریخ کو کسی شاہی خاندانوں کے سانچے میں دیکھنے کی کوشش کی، جس میں ان کی بڑی حد تک مغربی دانشوروں نے بھی پیروی کی۔

3.3.5 تانگ عہد میں تاریخ نویسی (Historiography during Tang Period)

ہان کے بعد تانگ حکمراں خاندان نے 618 سے 907 تک پورے چین پر حکومت کی۔ اس وقت حکومت نے تاریخ کا ایک محکمہ قائم کیا جسے تانگ عہد کی تاریخ کے لیے مواد جمع کرنے اور تیار کرنے کا کام سونپا گیا۔ متعدد وقفوں پر (اکثر ہر دور حکومت کے آخر میں) ان کو روزنامچوں میں شامل کیا جاتا تھا اور اس طرح انہیں تغیر پذیر دستاویزات (Shih-lu) کا نام دیا گیا۔ ان دستاویزات کو اس طرح مرتب کیا گیا تھا کہ سابقہ مثالوں کی تلاش میں افسران کے استعمال کے لیے حوالہ جاتی مواد کے ایک مجموعہ کے طور پر کام آسکے۔

صدی کے آغاز میں کیمبرج مورخین کی طرح، روایتی چین اس بات کا قائل تھا کہ کچھ بھی پہلی بار واقع نہیں ہوتا۔ آخر کار یہ طرز تسلیم کر لیا گیا کہ ہر نیا حکمراں خاندان اپنے پیشرو کی سرکاری تاریخ لکھنے کا حکم دے اپنی تخت نشینی کو نشان زد کرے گا اور اس تاریخ کو تغیر پذیر دستاویزات کی مدد سے مرتب کیا جائے گا۔ کچھ صدیوں کے لیے سرکاری تاریخیں تو باقی ہیں، لیکن ان سے متعلق تغیر پذیر دستاویزات غائب ہو چکے ہیں۔ آخری دو خاندانوں، منگ (1368تا1644ء) اور چنگ (1644تا1911ء) کے تغیر پذیر دستاویزات اب بھی موجود ہیں لہٰذا یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ محکمہ تاریخ کے افسروں نے سرکاری تاریخ نویسی میں ان تغیر پذیر دستاویزات کو کیسے استعمال کیا۔

3.3.6 سوما کوانگ (Ssuma Kuang)

سرکاری تاریخ نویسی کا ایسا نظام ماضی کا مسلسل، تفصیلی بیان فراہم کرنے میں منفرد تھا، تاہم یہ اپنی فطرت کے لحاظ سے، منفرد یا ایک شعبہ علم کے طور پر تاریخی تحقیق اور تحریر کی ترقی کے لیے بہت سازگار نہیں تھا۔ بہت سے چینی مفکرین واقعی سرکاری طرز سے مطمئن نہیں تھے۔ کچھ نے اس کی کمیوں، متبادل یا اصلاحی اضافے کے بارے میں لکھا ہے، جب کہ کچھ دوسروں نے اپنے طور پر کچھ کرنے یا تاریخ لکھنے کی

کوشش کی۔ دوسری قسم کی اہم ترین مثال سنگ خاندان (960-1279) کے دور میں ملتی ہے جب سوما کوانگ نے 1085 میں اپنی تصنیف *Tzu-chih t'ung-chien* (حکمرانی میں مدد کے لیے جامع آئینہ) مکمل کی۔ اس میں 403 قبل مسیح سے 959 عیسوی تک یعنی *Spring and Autumn Annals* کے اختتام سے لے کر سنگ خاندان (Sung Dynasty) کی تخت نشینی تک کا پورا دور شامل تھا۔ اس کتاب کا مصنف ایک سرکردہ سیاست داں تھا، اس لیے شاید ہی یہ کہا جا سکے کہ اس کی کتاب مکمل طور پر سرکاری افسر شاہی کی روایت سے باہر لکھی گئی ہو۔ درحقیقت اسے اس کے لیے سرکاری حمایت حاصل تھی۔ لیکن جو چیز غیر معمولی تھی وہ کام کی شکل اور تنظیم نہیں تھی جتنی کہ وقت کی طوالت اور یہ حقیقت کہ اس کے پیچھے ایک ہی رہنمایانہ فکر تھی۔ یہ ایک ایسی چیز تھی جو سرکاری تاریخوں کے تعلق سے ختم ہو چکی تھی۔ سوما کوانگ کسی بھی طرح سے اپنے خیالات کو تحریر کرنے سے گریزاں نہیں تھا، لیکن اس کے باوجود اس نے ایسے واقعات کی تفصیلات شامل کرنے پر بھی اصرار کیا جو اگرچہ اخلاقی طور پر کم ہی بہتری لا سکتے تھے۔

بعد کے ایک مورخ، چو ہسی (Chu Hsi) نے سوما کوانگ کے کام کی ایک تلخیص تیار کی جس کا نام، *Kang-mu* رکھا۔ اس میں 'تعریف اور الزام' کا ایک بہت بڑا عنصر شامل تھا اور جو سیاسی اخلاقیات کے کنفیوشسی تصورات کے مطابق تھا۔ بدقسمتی سے سوما کوانگ کی اصل تصنیف کے بجائے چو ہسی کی تلخیص 'کانگ مو' کو ہی بڑے پیمانے پر پڑھا گیا اور اسے مستند سمجھا گیا۔

3.3.7 ہسیاچانگ (Hsüeh-ch'eng)

وہ دانشور جسے تاریخ لکھنے کے روایتی تصور کے ساتھ علیحدگی میں سب سے زیادہ دور جانا جاتا ہے چنگ خاندان کے تحت رہتا تھا۔ چانگ (1738-1801) نے دلیل دی کہ چینی تاریخ نویسی میں غیر اہم جزویات یا تفصیلات (minutiae) پر کچھ زیادہ ہی زور دیا گیا ہے اور اس بے جا مصروفیت کی وجہ سے کسی بڑی صورت حال، یا مسئلے کو سوچنا سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ تاریخ کی نوعیت اور مقصد کے بارے میں بہت وسیع نظریہ اختیار کرنا چاہتا تھا۔ اس کا موازنہ گوام بتیساو کو (Giambattista Vico) سے کیا گیا ہے اور ایک دقیق تاریخی مفکر کے طور پر شاید لارڈ ایکٹن کے ساتھ بھی اس کا موازنہ کیا جا سکتا ہے جو بہترین ارادوں کے باوجود اپنے نظریات کو عملی جامہ پہنانے میں ناکام رہا۔

چانگ نے اپنے دور میں بہت کم اثر ڈالا اور تیزی سے بھلا دیا گیا۔ وہ ایک کتاب شائع کرنے میں تو کامیاب رہا لیکن یہ کتاب 1782ء میں شاہی لائبریری میں پائی جانی والی 2,136 تاریخی تصنیفات میں شامل نہیں تھی۔ اس کے نظریات پر صرف حالیہ دنوں میں توجہ دی گئی، جب چینی مفکرین نے جدید فکر پر غالب آنے کے لیے اپنی علمی روایت کی تلاش شروع کی۔

3.4 تاریخی نظریات (Historical Approaches)

تاریخ نویسی کا علم ہمیشہ کسی نہ کسی نظریاتی بنیاد پر ہی سامنے آیا۔ یہاں تک کہ مکمل غیر جانبداری کا دعوی کرنے والے مورخین بھی

اپنے مواد کو مرتب کرنے کے لیے عام اصولوں سے رجوع کرتے ہیں۔ ماقبل جدید چین میں تاریخ نویسی کا علم بھی اس سے مستثنی نہیں ہے۔ یہاں ہم چینی تاریخ نویسی کی روایت کی چند نظریاتی بنیادوں کے بارے میں بحث کریں گے۔

3.4.1 شاہی خاندانوں کی تاریخ (Dynastic History)

روایتی تاریخ نویسی پر شاہی دور کا تصور حاوی رہا۔ چینی روایت کے مطابق چین کا پہلا حکمراں خاندان زیا (Xia) تھا جسے شانگ (Shang) خاندان نے تخت سے بے دخل کیا۔ اس کے بعد ژاو (Zhou) خاندان نے تخت پر قبضہ کر لیا اور اسی طرح سلسلہ چلتا رہا۔ اس طرح چینی یکے بعد دیگرے شاہی خاندانوں کے عروج وزوال کو واضح متعینہ نمونے کے طور پر دیکھتے ہیں۔ شاہی سلسلہ کا نظریہ روایتی مورخین کے لیے دو طریقے سے مفید ثابت ہوا۔ ایک تو یہ کہ اپنے ماضی کو باقاعدہ حصوں میں تقسیم کرنے میں ان کو آسانی ہوئی، کیونکہ چند خاندانوں نے تین سو سال سے زائد عرصے تک حکومت کی، جب کہ کچھ خاندان صرف چند دہائیوں تک ہی تخت پر برقرار رہ سکے۔ دوسرے شاید زیادہ اہم یہ کہ شاہی سلسلہ، تاریخ نویسی کے اخلاقی مقاصد کا پابند رہا۔ شاہی خاندان کے عروج وزوال کو انفرادی حکمرانوں کی ذاتی اخلاقی خوبیوں کا نتیجہ قرار دیا گیا۔ کسی شاہی خاندان کے بانی حکمراں یا حکمرانوں کو ہمیشہ بڑی دانشمندی اور صلاحیت کے حامل افراد کے طور پر پیش کیا جاتا تھا جو بد نظمی کا خاتمہ کرتے تھے اور عام انسانی بہبود کے ایک عہد کی بنیاد رکھتے تھے۔ اخیر زمانے کے ان حکمرانوں کو کمزور اور غیر مؤثر افراد تصور کیا گیا جو کہ اپنے آپ میں ہی مست رہتے تھے اور جنہوں نے ریاست کے امور کو بد نظمی کا شکار بنا دیا۔ اس طرح موجودہ خاندان کا بانی حکمراں (جو اپنے پیش رو خاندان کی تاریخ لکھے جانے کے عمل کی نگرانی کرتا تھا) مثبت شکل میں ظاہر ہوتا ہے جس نے گڑبڑی اور بد نظمی کا خاتمہ کیا اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اپنے نااہل پیش رو سے تخت چھین کر حکومت کرنے کے لیے اسے تائید ربانی حاصل ہوئی اور پورا سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔ یہ حکمرانوں کے لیے کھلی آگاہی تھی کہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں وہ ایماندار رہیں اور حکومت چلانے کے اصول اور تسلیم شدہ روایات کی پیروی کریں، ورنہ کسی اور کو حکومت کرنے کے لیے تائید ربانی حاصل ہو جائے گی۔

فیر بینک (Fair Bank) کے مطابق چینی تاریخ کے بنیادی محرکات کو سمجھنے کے لیے شاہی سلسلہ بڑی اڑچن ثابت ہوا۔ صرف قلیل مدتی تبدیلیوں پر ہی توجہ مرکوز کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہایت ہی بنیادی اور طویل مدتی تبدیلیاں واضح طور پر سامنے نہیں آپائیں جو کہ چینی معاشرہ میں وقوع پذیر ہو رہی تھیں۔ ٹھیک اسی طرح تاریخ کے اعادہ پر ہی زور دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ حقیقی تبدیلی کے امکان کو ہی مسترد کر دیا گیا۔ اس طرح ماضی کی ڈور سے بندھے ہوئے سیاستداں اور دانشور حال کی الجھنوں کو بھی سلجھانے کے لیے پچھلے زمانے میں ہی سراغ تلاش کرتے رہے، کیونکہ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ موجودہ معاملات کی نظیر پچھلے دور میں موجود ہے۔ اس تصور نے ایک بیمار ذہنیت کو جنم دے دیا۔ بالخصوص جب کہ 19 ویں صدی میں چین کو بالکل نئے اور بالکل الگ انداز کے مسائل درپیش تھے لیکن یہی وہ وقت ہے جب فیر بینک تسلیم کرتا ہے کہ شاہی سلسلہ بہت ہی محدود افادیت کا حامل تھا کیونکہ خود عظیم شاہی خاندانوں کے ادوار میں غیر ملکیوں کی جانب سے درپیش مسائل کی صورت میں ان کی انتظامی اور اقتصادی کمزوری بڑی تیزی سے ظاہر ہو رہی تھی اور ایک بحران پیدا ہو گیا تھا جس میں انقلاب اور بیرونی حملہ کا بھی اندازہ بھی ہونے لگا تھا۔

3.4.2 مسلسل تاریخ (Continuing History)

شاہی سلسلہ کی بنیاد پر تاریخ نویسی پر روایتی چین میں تنقید ہونے لگی تھی۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے۔ بالخصوص تانگ اور سنگ عہد میں مورخین نے اس نظریے کی مخالفت کی اور اس سے باہر نکلنے کی کوشش کی۔ بعض مورخین جیسے سوما کوانگ نے اس کی کھل کر مخالفت کی لیکن اس کے کام کا دائرہ کسی ایک شاہی خاندان سے بلند تر تھا۔ جب کہ زینگ چیاو (Zheng qiao) نے شاہی تواریخ لکھنے کا عمل شروع کرنے کے لیے ماقبل مورخ پان کو کی براہ راست تنقید کی اور مسلسل تاریخ کے تصور کی کھلم کھلا تائید کی۔ یان شو (Yuan shu) نے ایک موضوع کو لے کر اس کے بارے میں شروع سے آخر تک لکھنے کا طریقہ شروع کیا اور اپنے طریقہ میں اس نے شاہی تاریخ نویسی کی مقرر کردہ حدود کی پروا نہیں کی۔ مادوان لن (Maduan lin) نے ایک قسم کا سمجھوتہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے یہ مشورہ دیا کہ شاہی بنیاد پر سیاسی تاریخ کو ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے لیکن اداروں کی تاریخ میں یہی طریقہ اختیار نہیں کیا جاسکتا۔ ہر عہد میں اداروں کی اہمیت اور بتدریج ترقی کے اسباب کو سمجھنے کے لیے ان اداروں کا ان کے آغاز سے خاتمہ تک جامع اور تقابلی مطالعہ کرنے پڑے گا اور اس طرح ان کے ارتقاء کو سمجھنے کی کوشش کرنی پڑے گی اور اس میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ عام طور پر کہا جاسکتا ہے کہ بعد کے مورخین نے اس طریقہ کو اختیار کیا کہ سیاسی ارتقا کے بارے میں تحقیق کرتے ہوئے شاہی اصولوں کو بڑی سختی سے اختیار کیا لیکن جب ادارہ جاتی تاریخ لکھنے کی بات آئی تو بہت مناسب رویہ اپنایا گیا۔

3.5 چینی تاریخ نویسی کی روایت کی خصوصیات

(Characteristic Features of Chinese Historiography)

جیسا کہ ہم نے دیکھا چینی تاریخ نویسی کی روایت ان دونوں عناصر پر مشتمل ہے جو تاریخ نویسی کی دیگر عظیم روایتوں میں مشترک ہیں لیکن چند خصوصیات ایسی ہیں جو بالکل منفرد ہیں جو مکمل طور پر چینی تمدن کی امتیازی خصوصیات سے متعلق ہیں۔ ذیل میں ہم اس روایت کی اہم خصوصیات کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

3.5.1 سرکاری تاریخ (Official History)

چینی تاریخ نویسی نمایاں طور پر سرکاری تاریخ نویسی ہے۔ اس کے کئی مفہوم ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کام کو اکثر و بیشتر سرکاری عہدیداروں نے ہی انجام دیا۔ دوسرے یہ کہ بالخصوص ابتدائی زمانے کے بعد عام طور پر حکمرانوں نے اس کام کی نگرانی کی یا اسے تعاون دیا۔ حالانکہ چند مستثنیات بھی ہیں لیکن نجی تاریخ (Sishi) جو کہ یقینی طور پر موجود تھی اور بلاشبہ اسے احترام بھی حاصل تھا لیکن سرکاری طور پر تحریر کردہ تاریخ کے غلبہ کو اس نے بھی چیلنج نہیں کیا۔ تیسرے یہ کہ تاریخی تحریر کے مشمولات اکثر انتظامیہ کے مسائل کو ہی ظاہر کرتے ہیں اور بالکل محدود طور پر حکمراں خاندان اور شہنشاہ کے مسائل ان میں ملتے ہیں۔ چوتھے یہ کہ اہم ذرائع جن پر تاریخ نویسی کی بنیاد ہے وہ سرکاری دستاویزات ہیں جس تک ان مورخین کی رسائی نسبتاً آسان تھی کیونکہ یہ سرکاری عہدیدار تھے۔ دوسرے معاشروں میں مورخین

کے لیے اہم ذرائع جیسے زمین کے دستاویزات نجی معاہدے، مقدماتی دستاویزات وغیرہ کو روایتی چینی مورخین نے شاذ و نادر ہی استعمال کیا ہے۔

3.5.2 رہنمایانہ تاریخ (Moral History)

تاریخ نویسی لازمی طور پر رہنمایانہ ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اپنے قارئین کے لیے رہنما کا کام دیتی ہے۔ ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ شاہی سلسلہ کا نمونہ کہنے سے مراد یہ ہے کہ وہ بعد کے حکمرانوں کے لیے ایک نظام ہے کہ ان کو کیسے حکومت کرنی چاہیے۔ لیکن بی صرف شہنشاہوں کے لیے ہی سبق آموز نہیں ہے، بلکہ فرض شناس سرکاری عہدیدار جنہیں محکموں میں کوئی نہ کوئی دشواری پیش آتی ہے، جیسے فساد کن غیر ملکیوں سے کیسے نپٹا جائے، رہزنی، بغاوت پر کیسے قابو پایا جائے ایسی صورت میں یہی توقع کی جاتی تھی کہ وہ تاریخ سے رجوع کرے گا کہ اس کے پیش روؤں نے ایسے مسئلوں کو کیسے حل کیا تھا۔ یہ صرف اطلاعات نہیں ہیں کہ تاریخ کی کتابوں میں انہیں تلاش کر لیا جائے۔ ان میں حکمرانوں اور سرکاری عہدیداروں کے اقوال وافعال کی شکل میں فرض شناسی، اخلاقی دیانتداری اور دانشمندی کے نمونے تھے جو عالموں اور سرکاری عبدیداروں کے لیے سبق آموز اور انہیں تحریک دیتے تھے۔ ایک عقل مند افسر نے اعلی افسر یا شہنشاہ کے سامنے اپنے اقدام کو بیج ثابت کرنے کے لیے اس کی نظیر پیش کرتا تھا۔

3.5.3 معیاری نمونہ(Standard Format)

تاریخ کے اہم کاموں میں ایک غیر معمولی اصولی نمونے (Consistent Format) کی پیروی کی گئی ہے۔ ایک زمانے سے شاہی خاندان کی تاریخوں اور جامع تاریخوں (Comprehensive Histories) میں یکساں طور پر ایک ہی طرح کے باب اور ان کے ذیلی ابواب شامل رہے۔ جن کی بدولت بعد کے مؤرین اور محققین کے لیے ان میں موجود معلومات کی بھول بھلیوں کو سمجھنا آسان ہو گیا۔ مثال کے طور پر آج کوئی محقق قدیم چین یا کسی ادارے کے کسی مخصوص عہد پر کام کرتا ہے تو ان امور کی بدولت اسے متعلقہ ابواب تک پہنچنے میں آسانی ہوتی ہے۔

3.5.4 معروضیت اور دیانت داری (Objectivity and Honesty)

عظیم مورخ سوما کوانگ (Sima Qian) کے عہد سے ہی حقائق کو حتی الامکان معروضیت کے ساتھ پیش کرنا ایک مورخ کا فرض تسلیم کیا جاتا ہے۔ روایتی چینی تاریخ نویسی میں یہ ایک تضاد (Paradox) ہے کہ سرکاری (Official) اور معیاری تاریخ پر زور دیا جاتا ہے جو تاریخ نویسی میں معروضیت کے قیام کے لیے معاون نہیں ہے۔ پھر بھی چارلس گارڈنر (Charles Gardner) جیسے محقق تسلیم کرتے ہیں کہ تاریخ نویسی کے چینی تصورات میں معروضیت کا تصور شامل ہے۔ مورخ جو مواد منظر عام پر لاتا تھا اس میں مورخ کی انفرادی شخصیت اور آراء کی دخل اندازی کی گنجائش نہیں تھی۔ اگر اس بات کو محسوس کیا گیا کہ یہاں مورخ نے اپنی طرح لکھنے کی کوشش کی ہے، عموماً وہاں خلاصے اور تبصروں میں اتنے حصے کو بقیہ تصنیف سے صاف طور پر علیحدہ کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ اپنے تحقیقی ماخذ سے وفاداری اور دیانت داری کے باوجود اکثر مورخ اپنے الفاظ میں موضوع کو بیان کرنے یا اس کی وضاحت کرنے کے بجائے اس ماخذ سے لفظ بہ

لفظ اقتباس اتار لیتے تھے۔اس امر کو ادبی سرقہ سمجھنے کے بجائے تاریخی تشکیل نو کا سب سے زیادہ فطری اور منطقی طریقہ سمجھا جاتا تھا۔اس طرز سے معیاری چینی تاریخ نویسی کتر پیوند (cut and paste) کی شکل میں تبدیل ہو گئی جو نئی تحقیق کے بجائے ماقبل کے کاموں کی ترتیب و تدوین کے مترادف لگتی ہے۔ ''کتر پیوند طریقہ حالانکہ کافی وسیع مطالعے اور تھکانے والا کام ہے لیکن اس کا فائدہ یہ ہوا کہ چینی تاریخ کے ابتدائی دور کی بہت سی تصنیفات جو خصوصاً زمانہ حال کا حصہ نہیں ہیں، آج بھی پوری طرح معدوم نہیں ہوئیں کیونکہ ان تصنیفات کے صیح صحیح اور لمبے لمبے اقتباس بعد کی تاریخی تصنیفات میں پوری طرح محفوظ ہیں۔

آخر میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ چین کے شہنشاہی عہد کے خصوصا عظیم ہان (Han) مورخین کے بعد کے مورخوں کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ وہ تاریخ نویسی کی عظیم روایت کا ایک حصہ ہیں۔ کبھی بھی ان کے اختیارات کی آزادی سلب ہو جاتی تھی کیوں کہ وہ اپنے عظیم پیش روؤں کے بنائے ہوئے نمونوں کے پابند تھے۔ لیکن دوسرے معنی میں انہوں نے ماضی کے اہم دستاویزوں کو جس طرح محفوظ کیا ہے، ان کی استقامت، تسلسل اور عام اعتبار دوسری تہذیبوں اور سماجوں سے بالاتر ہے۔ چینی یا بیرونی نژاد، بڑے یا چھوٹے شاہی خاندان، سب نے اخلاقی طور پر روایت کو قائم رکھنے اور تاریخ نویسی کی روایت کے تسلسل کو جاری وساری رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔اس احساس وشعور نے کہ وہ ایک عظیم روایت کا حصہ ہیں، چین کے مورخوں اور ان کے کاموں کو حوصلہ افزائی کی اور تاریخ اور کلاسیکی روایت کی غیر معمولی اہمیت کو احترام بخشنے میں اہم کردار ادا کیا۔

3.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

چینی تاریخ نویسی کی روایت کے بارے میں دانشور ولیم تھیوڈور ڈی بری (Wm. Theodore de Bary) نے لکھا ہے کہ ''چینی مصنفین کی تحریریں اپنے ماضی کی مسلسل اور سب سے زیادہ مکمل دستاویز کی نمائندگی کرتی ہے۔'' چارلس گارڈنر (Charles Gardner) نے چین کی قدیم تاریخ نویسی کے اپنے مطالعے کے آغاز میں لکھا ہے کہ ''کسی بھی دوسری قدیم قوم نے اپنے ماضی کی مکمل یادداشت کو اس قدر لمبے، اتنے سلسلے وار انداز میں اور اتنے منظم طریقے پر محفوظ نہیں کیا ہے۔ جے کے فیربینک نے بھی اسی انداز میں تحریر کیا ہے کہ ''چینیوں کی بنسبت دوسرے لوگوں کو اپنے ماضی میں اتنی دلچسپی نہیں رہی، جو ان کے موجودہ دور کے لیے مثال تھا اور انسانی سماج کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا ابتدائی ذریعہ تھا۔ یہ ایک ایسا موضوع تھا جس سے ان کو بیحد لگاؤ تھا۔تاریخ کے اسٹیج پر اداکار بننے کا اتنا گہرا احساس یا اپنے بارے میں تاریخ کے مستقبل کے فیصلے میں اتنی گہری دلچسپی دوسرے لوگوں کے اندر دیکھنے کو نہیں ملتی ہے۔''

'The Shi Ji' یعنی تاریخی دستاویزات کے مصنف اور چین کے پہلے عظیم مورخ سوماچین نے لکھا ہے کہ ''میں نے دنیا کی قدیم روایات کو ایک جگہ جمع کیا جو کہ ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں، بلکہ کھو چکی تھیں۔ میں نے ماضی کے واقعات اور کاموں کا بغور مشاہدہ کیا اور ان کی کامیابی اور ناکامی اور ان کے عروج وزوال کے اسباب تلاش کیے۔ میری خواہش تھی کہ بہشت اور انسان سے متعلق تمام چیزوں کا بغور مشاہدہ کروں اور ماضی اور حال کی تبدیلیوں کی تہ تک پہنچوں۔'' پہلی صدی عیسوی میں سوماچین نے چین میں تاریخ نویسی کی باقاعدہ روایت کی بنیاد

رکھی۔اس دور میں دنیا کے کسی بھی حصہ میں اس نوعیت کا کام شاید ہی ہوا ہو۔تاریخ نویسی چین کی قدیم روایت کا نہایت ہی اہم حصہ رہی ہے۔ یہ پوری طرح ان کے روایتی فلسفہ اخلاقیات اور آئین جہانبانی کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔تاریخ سے متعلق یہ عظیم کام چین کی ادبی روایت اور انھیں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

اس اکائی کے بقیہ حصے میں چین کی عظیم تاریخ نویسی کی روایت کے اہم پہلوؤں کا مطالعہ پیش کیا گیا۔ بالخصوص ماقبل جدید چین میں تاریخ نویسی کے اصل محرکات کا جائزہ لیا گیا۔ساتھ ہی قدیم چین میں تاریخ نویسی کی نشو ونما اور مورخین کے درمیان بحث ومباحثہ کے اہم موضوعات کا تجزیہ کرنے کی بھی کوشش کی گئی۔آخر میں اس روایت کی امتیازی خصوصیات پر بھی روشنی ڈالی گئی۔

3.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

شی : تاریخ

سوماچین : قدیم چین کا ابتدائی عظیم مورخ

تغیر پذیر دستاویزات : ہان کے بعد تانگ حکومت نے تاریخ کا ایک محکمہ قائم کیا جسے تانگ عہد کی تاریخ کے لیے مواد جمع کرنے اور تیار کرنے کا کام سونپا گیا۔متعدد وقفوں پر (اکثر ہر دور حکومت کے آخر میں) ان کو روزنامچوں میں شامل کیا جاتا تھا اور اس طرح انہیں تغیر پذیر دستاویزات (Shih-lu) کا نام دیا گیا

3.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

3.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. چینی تاریخ نویسی کی مسلسل تاریخ کم از کم کس کے زمانے تک جاتی ہے؟
2. چینی تاریخ نویسی کے علاوہ دنیا کی دیگر دو عظیم تاریخی روایات کے نام بتائیے۔
3. 'بہار اور خزاں کے وقائع' کس ریاست کی تاریخوں میں سے ایک تھا؟
4. 'بہار اور خزاں کے وقائع' کس نے لکھی؟
5. سوماچین کے والد کا نام کیا تھا؟
6. سوماچین نے کون سا عہدہ سنبھالا؟
7. پین چی (pen-chi) سے کیا مراد ہے؟
8. شو (shu) کسے کہتے ہیں
9. سوانح حیات کو چینی زبان میں کیا کہتے ہیں؟

10. پان کو نے کس خاندان کی تاریخ لکھی؟

3.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

مندرجہ ذیل میں سے کسی تین پر مختصر نوٹ لکھیے۔

1. دانشور افسران
2. بہار اور خزاں کے وقائع
3. پان کو
4. تانگ عہد میں تاریخ نویسی
5. ہسیا چانگ

3.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. سوما چین نے قدیم چین کی تاریخ نویسی کو کس طرح متاثر کیا؟
2. ماقبل جدید چین میں تاریخ نویسی کے ارتقاء سے بحث کیجیے۔
3. چین کی روایتی تاریخ نویسی کی خصوصیات بیان کیجیے۔

3.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. William Theodore de Bary (Comp.), *Sources of Chinese Tradition*, Vol.1, New York and London, Columbia University Press, 1960.
2. Charles S. Gardner, *Chinese Traditional Historiography*, Cambridge, Massachusetts, Harvard University Press, 1961.
3. John King Fairbank and Edwin Reischauer, *East Asia: The Great Tradition*, Boston, Houghton Mifflin Company, 1958.
4. Etienne Balasz, *Chinese Civilization and Bureaucracy*, New Haven, Yale University Press, 1964.
5. Endymion Wilkinson, *Chinese History: A Manual*, Cambridge, Massachusetts and London, Harvard University Press, 2000.
6. J. Meskill (ed.), *The Pattern of Chinese History: Cycles, Development, or Stagnation*? Boston, Heath, 1965.

اکائی 4۔ کلہن کی راجترنگنی کے حوالے سے قدیم ہندوستانی روایات

(Ancient Indian Traditions with special reference to Kalhana's Rajatarangini)

اکائی کے اجزا

4.0	تمہید
4.1	مقاصد
4.2	سیاسی اور انتظامی پہلو
4.3	کشمیر کی معیشت بقول کلہن
4.4	کلہن بطور مورخ
4.5	کلہن بطورِ جغرافیہ دان اور مصنف
4.6	خرافات اور حکایات
4.7	کلہن کا فلسفہ تاریخ
4.8	کشمیر اور اسکی ادبی دنیا سے تعلق
4.9	اکتسابی نتائج
4.10	کلیدی الفاظ
4.11	نمونہ امتحانی سوالات
4.11.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
4.11.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
4.11.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
4.12	مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

4.0 تمہید (Introduction)

کشمیر کی تاریخی تحریر کی روایت 'راج ترنگنی' (راجاؤں کا دریا) آٹھ ہزار مصرعوں پر مشتمل ایک طویل سنسکرت داستانی نظم ہے جسے آٹھ اکائیوں میں تقسیم کیا گیا ہے، ہر ایک اکائی کو مصنف نے ترنگ کہا ہے۔ یہ کشمیر کے راجاؤں کے افسانوی دور (1184 قبل مسیح) سے اس کتاب کی تصنیف (49-1148 عیسوی) تک کی مسلسل تاریخ ہے۔ کتاب کا عنوان ہمیں بتاتا ہے کہ اس کا مصنف کلہن (Kalhana) کشمیر کے راجا ہرش (Harsha) کے وزیر چمپا (Champa) کا بیٹا تھا۔ راج ترنگنی اب تک دریافت ہونے والی واحد ایسی سنسکرت تصنیف ہے جسے نوآبادیاتی مورخین نے تاریخ سمجھا اور بقول ان کے کشمیر ہندوستان کا واحد خطہ ہے جس میں تاریخ نویسی کی روایت موجود تھی۔ اگرچہ بنیادی طور پر ہندوستان کا ایک بڑا حصہ ہند آریائی روایتوں کا وارث رہا لیکن کشمیر، یونانی (Greek)، چینی (Chinese) اور شک (Sythian) ثقافتی اثرات سے بہرہ ور ہوا جن کی ایک باقاعدہ تاریخی روایت تھی۔ ممکن ہے کہ مسلسل پہاڑی سلسلوں کی وجہ سے خطہ کی جغرافیائی علاحدگی نے مضبوط قوم پرستی کو فروغ دیا ہو اور برہمن مت کے مقابلے بدھ مت میں تاریخ کے بہتر شعور نے کشمیر میں تاریخ نویسی کی روایت کو فروغ دینے میں مدد کی ہو۔

راج ترنگنی کے مشمولات معلومات کا ذخیرہ ہیں۔ اس کتاب کے ذریعے ہمیں مقدس برہمن اور راجپوت کے علاوہ ڈوم اور اچھوت چنڈال کے بارے میں معلوم ہوا۔ کلہن اپنی تحریر میں ان سب کا ذکر کرتا ہے۔ اس کی تصنیف ماضی کو زندہ کرتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ اس کے ہم عصر مرد اور عورتیں کیسے رہتے تھے۔ وہ کیا کھاتے اور پہنتے تھے۔ ان کے مذہبی عقائد کیا تھے اور وہ جنس یعنی مرد و عورت کے درمیان تعلق کے بارے میں کیا سوچتے تھے۔ ہم اس کتاب سے شہروں کی بنیاد، مندروں، وہاروں اور مٹھوں کی تعمیر اور ان کے ماننے والوں نیز اس کے نہ ماننے والوں کے بارے میں معلومات حاصل کرتے ہیں۔ میگھواہنا (Maghwana) کی فتح کے ذریعے عدم تشدد پھیلانے کی کوشش، جنگجوؤں کے حملے اور تباہی، قحط، سیلاب اور زبردست آگ وغیرہ سب سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔

4.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- ہندوستان میں تاریخ نویسی کی شروعات کیسے ہوئی، سمجھ سکیں گے۔
- کشمیر کی تاریخ کے لیے راج ترنگنی کی اہمیت کا جائزہ لے سکیں گے۔
- کشمیر کی سماجی، مذہبی، اقتصادی اور سیاسی پہلوؤں کو سمجھ سکیں گے۔
- کشمیر میں کایستھ طبقہ کے عروج اور دربار میں ان کے کردار کا علم حاصل کر سکیں گے۔
- گیارہویں اور بارہویں صدی کے کشمیر میں ہوئی سیاسی سرگرمیوں پر ایک روشنی ڈال سکیں گے۔

4.2 سیاسی اور انتظامی پہلو (Political and Administrative Aspects)

راج ترنگنی، راجاؤں اور امرا کے احوال پر مبنی ہے جس میں للیتادتیہ (Lalitaditya) جیسے خود پسند جنگجو بادشاہ اور چندراپیڈا (Chandrapeda) جیسے کامیاب خیر خواہ بادشاہ تھے۔ لیکن جاگیرداروں اور داروں، کائستھوں، تانتریوں، ایکنگوں اور برہمنوں نے ان حکمرانوں کی حکمرانی کو سیاسی طور پر ناپائیدار بنادیا تھا۔ کلہن کا کہنا ہے کہ تانتریوں اور ایکنگوں نے اپنے فائدے کے لیے اپنے شاہی آقاؤں کو مداری کے سانپوں کی طرح کنٹرول کیا اور ان کی نمائش کی۔ برہمنوں نے، بادشاہ اور حکومت کے ساتھ اختلافات کی صورت میں، ایک طاقتور سیاسی ہتھیار کے طور پر بھوک ہڑتال کا سہارا لیا۔ تانترک، ایکنگ، دمار، کائستھ اور برہمن پجاری سبھی کے بارے میں کلہن نے اپنی بے باک قلم سے رائے زنی کی ہے۔

4.3 کشمیر کی معیشت بقول کلہن (Kashmir's Economy as Described by Kalhana)

اگرچہ کلہن نے اپنی تاریخ میں معاشی پہلو پر زور نہیں دیا ہے پھر بھی اس کے ذریعے دی گئی قحط، خوراک کی قیمتوں، ٹیکسوں (Taxes)، کرنسی (Currency) اور اسی طرح کی بہت سی تفصیلات اس زمانے کی معاشی زندگی کی تصویر پیش کرنے میں کامیاب رہتی ہیں۔ کلہن اس بات کو بیان کرتا ہے کہ جب درباری تلے ہوئے گوشت اور ہلکی ٹھنڈی اور خوشبو والی شراب سے لطف اندوز ہوتے تھے، اس وقت عام لوگ چاول اور ہاگ سبزی کا شوربہ کھا رہے تھے۔ کلہن غلامی کے ذریعے سماجی منظر نامے کی ایک واضح تصویر پیش کرتا ہے جیسا کہ غلام کا کوئی وجود نہیں تھا۔ ذات پات کے نظام نے ہندوستان میں اور کشمیر میں کچھ فرق کے ساتھ اپنا کردار ادا کیا۔ کلہن کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کشمیر میں کسی بھی شہری یا فوجی عہدے پر فائز رہنے میں ذات پات کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ ڈومبا اور برہمن یکساں سپاہی تھے اور کسی بھی ذات کا فرد دولت اور اثر ورسوخ کے ذریعے دمار (طبقہ اعلیٰ) کے درجہ تک پہنچ سکتا تھا. اس قسم کی بین ذات (Inter-Caste) شادیوں کا ذکر ہندوستان میں کہیں اور نہیں سنا گیا۔ راج ترنگنی میں مذکور ہے۔ جنگجو بادشاہ سنکر اور من (Shankravarman) کی نوکر ایک نچلی ذات کی روح کشی کرنے والے کی بیٹی تھی۔ بادشاہ شکرورمن (عیسوی 33-923) نے ایک اچھوت ڈومبا عورت ہمسی سے شادی کی اور اسے ملکہ بنادیا اور وہ معمول کے ساتھ سری نگر کے قریب رام سوامی (Ramaswami Temple) کے مقدس وشنو مندر میں داخل ہوئی۔ راج ترنگنی کے شواہد سے دیکھیں تو کشمیر کی خوبصورت خواتین پردے اور حرم کو نہیں جانتی تھیں جو ہندوستانی خواتین جانتی ہیں۔ عورتوں کی خلوت اور پردہ داری کا شاہی خاندانوں میں بھی رواج نہیں تھا۔ خواتین، عام طور پر، آزاد تھیں، غیر منقولہ جائیداد کی مالک تھیں اور اپنی جائیدادوں کا انتظام خود کرتی تھیں۔ ان میں سے بعض نے فوج کے کمانڈر کے طور پر بھی جنگ کی۔ ستی، جس کا مطلب ہے شوہر کی موت کے بعد خود چتا پر جل کر مر جانا، کشمیر میں کئی صدیوں تک زندہ رہا۔ جبر کی مذمت کرتے ہوئے کلہن نے اس دور میں لکھا جب انسان کے حقوق اور بادشاہت کی مذمت کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ پھر بھی شاید یہ ہندو دھرم میں ان کا عقیدہ تھا جس نے انہیں کسی بھی قسم کے ظلم کی مذمت کرنے پر زور دیا۔ بادشاہ سنکر اور من (Shankarvarman) نے غریبوں اور پسماندہ لوگوں کے ساتھ ہمدردی کی جبری مشقت کی مذمت کیا ور ملیچھوں (Mlechchas) کی غلامی کی تجارت سے اپنی وحشت کا اظہار کیا۔

4.4 کلہن بطور مورخ (Kalhana as an Historian)

راج ترنگنی میں ہمارے پاس قدیم ہندوستان میں ایک حقیقی مورخ کے قریب ترین نقطہ نظر ہے۔ صرف راج ترنگنی پورے برصغیر میں تاریخ کے طور پر لکھی جاتی ہے۔ قدیم ہندوستانی مصنفین عام طور پر ماضی کے واقعات کو خالصتاً انسانی واقعات کے طور پر، یا کسی بھی تاریخی ترتیب میں ان کے وقوع پذیر ہونے کے لیے استعمال نہیں ہوتے تھے۔ ان دو لحاظ سے کلہن قدیم ہندوستان کے تمام مورخین میں سر فہرست ہے۔ جیسا کہ (R.C. Majumdar) مجمدار نے تبصرہ کیا، راج ترنگنی قدیم ہندوستانی مورخین کے ذریعے پہنچنے والے تاریخی علم کے اعلی ادبی نشان کو ظاہر کرتی ہے۔

ایک سچے مورخ کا ایک اہم امتحان حقائق کے لیے اس کی فکر ہے۔ کلہن کا کہنا ہے کہ صرف ایک نیک شاعر ہی قابل تعریف ہے جو محبت یا نفرت سے پاک ہو اور اپنی زبان کو ہمیشہ نمائش تک محدود رکھتا ہو اور جو مختلف ذرائع استعمال کرتا ہو۔ صرف تحریری ذرائع میں نیل مت پران (Nilmatpurana)- کشمیر کے سرپرست سنت، شمیندر (Kshemendra) کی نریپاولی، ہیلاراجا کی پارتھیاولی، سی این کی ترکیبیں شامل ہیں۔ ویلکارا اور پدمیسیرا اور مصنفین کی ایک کلاس جسے مہاتمیاس کہا جاتا ہے، اس کے علاوہ سابق سیونٹس کے گیارہ کام ان ادبی ماخذوں کو جانچنے کے لیے، کلہن نے بہت زیادہ اصلی اتھارٹیز کا استعمال کیا جیسے کہ مذہبی بنیادوں اور زمین (land-grants) کی گرانٹس اور دیگر مراعات سے متعلق دستاویزات، فرمودات، تعریفی تحریریں، سکے اور قدیم یادگاریں کو اپنی کتاب لکھنے کے لیے استعمال کیا۔

4.5 کلہن بطور جغرافیہ دان اور مصنف (Kalhana as a Geographer and Writer)

وہ وادی کشمیر کی ٹپوگرافی کے ماہر تھے۔ یہ حیرت کی بات ہے کہ قرون وسطی کے ہندوستانی تواریخ کو کلہن کی طرح نوشتہ جات اور سکوں کو تاریخ کے جائز ماخذ ماننا چاہیے تھا اور آثار قدیمہ کے ذرائع کو اس مستعدی کے ساتھ تلاش کرنا چاہیے تھا کہ ان کے بارے میں ان کے بیان سے جدید تحقیق و تحقیق کی رہنمائی ہوئی ہے۔ جیسا کہ اے بی کینیتھ (A.B. Kenneth) نے لکھا ہے، ہر قسم کی مقامی روایات اور خاندانی ریکارڈ، اس کی اپنی ذاتی معلومات اور اس کے والد اور بہت سے دوسرے لوگوں نے اس کے کام کی تاریخ سے پہلے کے پچاس سال کے واقعات کا جائزہ لیا، حقائق کی قطعی تفصیلات کیا اور ادبی تاریخ کے بارے میں ان کے دعوے بھی قطعی ہیں۔ کلہن نے تضادات اور غلطیوں کا پتہ لگانے اور ان کو دور کرنے کے لیے اپنے ذرائع سے پریشانی کا سامنا کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے کام میں ایک غضبناک انداز پایا اور پیڈینٹری کی غلطی اور دیکھ بھال کی کمی نے کشمیندر کی نریپاولی کو غلطیوں سے بھر دیا تھا۔ پہلی تین ترنگوں یا کتابوں کے لیے، کلہن کو افسانوں، افسانوں اور روایتوں یا بہترین نیم تاریخی مواد پر بہت زیادہ انحصار کرنا پڑا اور یہاں ہم واضح ناممکنات اور ناممکنات کے بارے میں پڑھتے ہیں جنہوں نے کچھ اسکالرز کو ان تینوں کتابوں کو غیر تاریخی ماننے پر آمادہ کیا ہے۔

4.6 خرافات اور حکایات (Myths and Legends)

ہم نے سنید ھیماتا(Hemet) کے تین سو سال تک راج کرنے والے ایک بادشاہ کے بارے میں پڑھا ہے، جسے بادشاہ نے دوبارہ زندہ کیا اور بادشاہ جیندر کا جانشین بنا۔ معجزاتی اور مافوق الفطرت کو باب چوتھے کنکونا میں بھی جگہ ملتی ہے جسے للیتادتیہ (Lalitaditya) نے وسطی ایشیا سے اپنے دربار میں لایا تھا اور اس نے ایک ایسا سحر استعمال کیا تھا جس کی وجہ سے پنجاب میں ایک دریا کا ہنگامہ خیز پانی فوج کے لیے درمیان میں ایک واضح پیچ چھوڑ دیتا تھا۔ پار کرنے کی حقیقت یہ ہے کہ کلہن نے اپنی عمر کے ساتھ اشتراک کیا اور ماضی کے بہت سے توہمات اور عقائد کا دعوی کیا۔ اپنے 2333 سالہ میں جو دوسری صدی قبل مسیح تک پہنچتا ہے، اس نے اسے غلطیاں کرنے کے بہت سے مواقع فراہم کیے تھے۔ لیکن یہ ان کے کریڈٹ پر بھی ہے کہ وہ کبھی کبھی ایسی بکواس بیان کرتے ہوئے شرم محسوس کرتے تھے۔ بادشاہ للیتادتیہ (Lalitadityas) نے اپنی موت کے ساتھ جس طرح سے ملاقات کی ہو اس کے مختلف بیانات کا حوالہ دیتے ہوئے، کلہن طنزیہ مزاح کے ساتھ کہتے ہیں، کہ جس نے بہت سے معجزاتی کام کیے ہوں، اس کے لیے بھی بہت معجزاتی موت کا ہونا مناسب تھا۔ کرکوٹا خاندان کے بارے میں حقائق اور ان کی وضاحت باب چوتھے میں اس نے ذکر کی ہے، راجاترنگینی کی تاریخ مضبوط بنیادوں پر ٹکی ہوئی ہے، اس کے بعد کی کتابوں میں لکھی گئی تاریخ کے معیار میں مسلسل بہتری آئی ہے۔ تاریخی واقعات کو ان کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وضاحتیں صرف مذہب اور کرما جیسے تصورات پر نہیں بلکہ فطری حالات پر بھی منحصر ہیں۔ آٹھویں باب میں، جو تقریباً نصف کام کرتا ہے اور جہاں کلہن اپنے زمانے کے قریب کے واقعات کو بیان کرتا ہے 1150-1100ء تجزیہ اور وجہ کی وضاحت کا معیار اعلیٰ درجہ کا ہے اور وہ حقائق کے نقطہ نظر اور نسباتی اور ٹپو گرافیکل معلومات میں اعلیٰ درجے کی درستگی حاصل کرتا ہے جو وہ فراہم کرتا ہے۔ اور اس کا اپنا وقت جتنا قریب ہوگا، درستگی اتنی ہی زیادہ ہوگی کیونکہ اس نے موجودہ واقعات کے عمل کو غور سے دیکھا ہے۔ سوری متی کی خود سوزی اور سو سالہ کے قتل کی تفصیلات عینی شاہد کے بیان کی نشاندہی کرتی ہیں۔ چونکہ تاریخ ماضی کے واقعات کا ان کے وقوع کی ترتیب سے مطالعہ کرتی ہے، اس لیے ایک حقیقی مورخ کا ایک امتحان اس ترتیب کا احساس ہوتا ہے، یعنی تاریخ کی ترتیب کا۔ راج ترنگنی کو اب تک اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ کلہن کا شیو کے ساتھ مضبوطی سے التزام اسے بدھ مت کو اپنا احترام دینے سے نہیں روکتا۔ کلہن کا تاریخ کا آئیڈیل ماضی کی واضح نمائندگی ہے جس میں آنے والی نسلوں کے استاد کے طور پر اس کے عظیم کردار ہیں۔ اے بی کیتھ (A.B. Kenneth) لکھتے ہیں کہ مہاکاویہ خاص طور پر مہابھارت (The Mahabharata) اور رامائن (The Ramayana) اور ہندوستانی شاعری کے اثرات نے ایسے انجام کی طرف کام کیا۔ مہاکاویہ کا اثر اخلاقیات کو ابھارنے کے عمومی رجحان میں، طاقت اور دولت کی ناپائیداری پر پڑنے والے دباؤ اور اس یا مستقبل کی زندگی میں بدکرداروں کے لیے آنے والے عذاب میں دیکھا جاتا ہے۔ پھر، جیسا کہ ہندوستانی شاعری کی ضرورت ہے، راج ترنگنی کا غالب جذبہ -رسا- اندرونی سکون، استعفیٰ، شانتی یا سکون ہے۔ تاریخ کا کوئی ایسا اخلاقی مقصد نہیں ہے جیسا کہ قدیم اور قرون وسطی کے مورخین کے خیال میں اس کا تھا۔

4.7 کلہن کا فلسفہ تاریخ (Kalhana's Philosophy of History)

کلہن نے اپنے سامنے پیش کردہ تعلیماتی مقصد کے ساتھ قریبی تعلق بنایا جو کہ ہندوؤں کے نظریہ حیات کے بنیادی اصولوں کی تاریخ پر اس کا اطلاق تھا۔ بعض اوقات ان کا سہارا بھی بطور وجہ وضاحت کے۔ گویا اس طرح کے تصورات کی ایک درجہ بندی - دھرم، نیکی، بدی، قسمت، الٰہی انتقام اور الٰہی خوشی نے اسے تاریخ کا ایک تیار فلسفہ فراہم کیا۔ اس طرح کے فلسفے نے بعض اوقات ان کی وضاحتوں کی نوعیت اور معیار کو متاثر کیا۔ ایک نیک نیت بادشاہ اپنے مقصد میں اس کی اپنی پنیا یا اس کی رعایا کی کمی سے شکست کھا سکتا ہے۔ اور اس زمانے میں لکھنا جو مطلق العنان طاقت پر آئینی جانچ پڑتال کے بارے میں بہت کم یا کچھ نہیں جانتا تھا، کلہن حکمرانوں کے لیے ایک چیک کے طور پر الٰہی انتقام یا رضائے الٰہی کا نظریہ لاتا ہے۔ گہری تاریخی احساس، ادبی شکل کے شاندار احساس اور خوبصورت، عمدہ اور سریلی زبان کے ساتھ، کلہن نے راج ترنگنی میں تاریخ اور ادب میں قریب قریب کمال حاصل کیا۔ یہ کام بنیادی طور پر سادہ تصدیق شدہ نثر میں ایک بیانیہ ہے۔ مناظر صاف ستھرا ترتیب اور تمثیل جیسی اقوال، کہانیوں اور مکالموں کو بڑی مہارت سے کہانی کے تانے بانے میں بُنایا گیا ہے جو نہ صرف تنوع بلکہ ڈرامائی طاقت دیتا ہے۔ تدوین کے اکاؤنٹ، قدیم ہندوستانی تاریخ نویسی نے عقلیت کو حد سے زیادہ پھینک دیا اور خود کو مذہب اور افسانوں سے جوڑ دیا۔ قابل اعتماد اور غیر معتبر، ممکن اور ناممکن، قدرتی اور مافوق الفطرت ذرائع میں کوئی فرق نہیں کیا گیا۔ تاریخ کے اس طرح کے عام موضوعات جیسے سیاست، جنگ اور جھگڑے اتہاس پران کاویہ (Itihasa Purana Kavya) روایت کے مصنفین کے لیے تھے، زندگی کے صرف سطحی تاثرات، جس کے نیچے انسان کے انسانی وجود کے خود مختار مقصد کی تکمیل کا دلکش ڈرامہ ہے۔ زیر بحث روایت نے اس اندرونی کہانی کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور پروشارتھ کے لحاظ سے زندگی کے معنی کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، زندگی کے چار مقاصد۔ لوگوں کی اپنے ماضی کے علم کی ضرورت کو جذب کرتے ہوئے، خود شناسی اور شناخت کے لیے، ہندوستانی مہاکاویہ روایت نے فکر اور ادب کے شاہکار تخلیق کیے، لیکن اس قیمت پر جسے ہم تاریخ کہتے ہیں۔ یونانی لفظ ہسٹوریا (Historia) نے انسان کی خود شناسی کے لیے انسانی ماضی کی تحقیقات کے طور پر جو خیال پیش کیا ہے وہ قدیم ہندوستانی ذہانت کے ذہن میں کبھی نہیں آیا تھا۔ اسی ے طویل عرصے کے دوران۔ 1500 قبل مسیح سے 1200 عیسوی تک۔ اتہاس - پران - کاویہ روایت نے حقیقی تاریخ کی طرف ترقی کی کوئی علامت نہیں دکھائی، اکیلے راج ترنگنی ہی ایک راحت بخش استثناء ہے۔

کلہن کی راج ترنگنی (12 ویں صدی عیسوی)، جو سنسکرت میں لکھی گئی ہے، کشمیری علاقائی شناخت اور خودداری کے ساتھ سب سے قدیم زندہ بیان اور مشغولیت ہے۔ یہ ایک ایسی جگہ کی سیاست کی وضاحت کرتا ہے جو کشمیر کو زمین کے دوسرے ٹکڑے سے ایک وطن میں بدل دیتا ہے۔ یہ اس کے جغرافیہ، اس کے لوگوں، اس کی روایات، اس کی لوک داستان اور اس کی دو ہزار سال کی تاریخ کا نقشہ بناتا ہے۔ تاہم یہ صرف کشمیر کی کہانی نہیں ہے بلکہ کشمیر کے لیے بھی ایک کہانی ہے، کیونکہ یہ کشمیری تاریخ اور کشمیری بادشاہوں کو گہری اخلاقی عینک سے دیکھتی اور جانچتی ہے۔ یہ فضیلت کے برابر ایک تنقیدی تبصرہ بھی ہے، اس لیے صالح طرز عمل کلہن کے عالمی نظریہ میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ پراجنوپلانم (رعایا کی فلاح و بہبود) اور ستیہ (خالص ذہنیت) بادشاہوں کے اعلیٰ فرائض/فضیلت تھے جبکہ پرجاپیڈانم (لوگوں پر ظلم کرنا)

اور لوبھ (لالچ) ان کی سب سے بڑی برائیاں تھیں۔ کلہن نے کشمیری بادشاہوں اور ان کی پالیسیوں کے ساتھ ساتھ دیگر سماجی اور سیاسی اداکاروں کی درجہ بندی اور تنقید کی جنہوں نے اس اخلاقی اصول کے مطابق اس کے بیانیے کو متاثر کیا۔ جہاں تک راج ترنگنی کی ساکھ کا تعلق ہے، اس حقیقت پر تشویش ہے کہ اس نے کشمیری تاریخ کی اگلی چار صدیوں میں دیگر کشمیریوں کے ذریعہ کم از کم تین سیکوئلز کو جنم دیا۔ اسے ابوالفضل (Abul Fazl) کی طرف سے خطے کی اولین نمائندگی کے طور پر سمجھا جاتا تھا جب مغل 16ویں صدی کے آخر میں وادی پر اترے تھے، اس نے اپنی سرزمین میں کلہانا کی گفتگو کی طاقت، وقار اور سمجھی جانے والی صداقت کی تصدیق کی تھی۔ راج ترنگنی کشمیر کو ایک بہت ہی پاک سرزمین کے طور پر پیش کرتی ہے بلکہ بعض اوقات ایک شورش زدہ سرزمین کے طور پر بھی۔ کلہن کے لیے، یہ کوئی تضاد نہیں تھا بلکہ کشمیر کی اصل فطرت، جو کہ قدیم اور روحانی تھی، اس کی سیاست اور خانہ جنگیوں کی وجہ سے ایک المناک خرابی یا غداری تھی۔ حیرت انگیز بصیرت کے مظاہرہ میں، کلہن نے اپنے ملک کو اپیلاو پر یہ دیش کے طور پر بیان کیا، ایک ایسا ملک جو بغاوت میں خوش تھا اور سوبھیداودھورم منڈلم، اپنے ہی دھڑوں کے ذریعے ناخوش تھا۔ روایتی ذات پات کے نظام میں، کشمیر میں بھی برہمن سرفہرست تھے اور ان کے بعد جنگجو طبقہ تھا۔ یہ درست ہے کہ ابتدائی کشمیر میں چھتریہ (Kshatriya)، ویشیہ (Vaishya) اور شودر (Shudra) جیسی کوئی ذات نہیں تھی لیکن ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ کلہن نے اپنی تاریخ میں ہندوستان کے روایتی ذات پات کے نظام سے متعلق بہت سی اصطلاحات استعمال کی ہیں جیسے برہمن، راجپوترا، ڈومباس، چنڈالا وغیرہ۔ جو کچھ اوپر کہا جا چکا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کشمیر کا معاشرہ ذاتوں اور ذیلی ذاتوں کا ایک وفاق بن گیا، جس کے ارکان نے بعض اوقات آپس میں شادیاں بھی کیں، جو کہ بعد کے زمانے میں پہلے کی نسبت زیادہ کثرت سے ہوئیں، لیکن جس نے اس کے باوجود اپنی الگ شناخت برقرار رکھی۔ معاشرہ بہت سے گروہوں پر مشتمل تھا جنہیں ایک ہی روحانی اور ثقافتی فریم ورک (Framework) میں لایا گیا تھا، لیکن جو صرف جزوی طور پر آپس میں مل گئے تھے۔ ذات مکمل طور پر جامد نہیں تھی، نئی ذیلی ذاتوں کے لیے یہ اکثر نقل مکانی، فیوژن یا ذیلی تقسیم سے پیدا ہوتی ہے۔ پرانی ذیلی ذاتیں بعض اوقات اپنی شناخت کھو دیتی ہیں اور اپنی حیثیت سے اوپر یا گر جاتی ہیں۔ راج ترنگنی میں، کلہن نے کافی مثالیں دی ہیں کہ کس طرح ڈھامر اطبقے نے نہ صرف برہمنوں کو بلکہ حکمران طبقے پر بھی غلبہ حاصل کیا۔ کشمیر کے معاشرے میں ان کا بہت مضبوط مقام تھا خاص طور پر جب حکمران طبقہ ڈامراوں میں گھرا ہوا تھا۔ بادشاہوں نے اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کے لیے جنگجو طبقے کی حمایت حاصل کرنے کی کئی بار کوشش کی۔ انہیں ملازمین کے ساتھ ساتھ حکمرانی کے اختیارات سے آزاد بھی دکھایا گیا۔ ہندوستان کے دیگر حصوں کی طرح کشمیر میں بھی ہمیں اس ذات کی مختلف ذیلی ذاتیں ملتی ہیں۔ ہم اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ کشمیر کی راجاترنگینی جنگجوؤں کے دور میں نہ صرف کشمیر بلکہ پورے ہندوستان کی تاریخ کو بہت زیادہ متاثر کیا گیا۔

4.8 کشمیر اور اس کا ادبی دنیا سے تعلق (Kashmir and its Connection with Literary World)

یہ بات مشہور ہے کہ قدیم زمانے سے کشمیر اور کاشی (Kashi) ہندوستان بھر میں علم کے مشہور مراکز تھے۔ لیکن کشمیر کاشی (Kashi) سے بہت آگے تھا۔ کاشی (Kashi) کے علماء کو اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لیے کشمیر آنا پڑا۔ آج بھی کاشی (Kashi) کے روایتی لوگ اپنے بچوں کو سیکھنے کی شروعات کے وقت ان سے کہتے ہیں کہ مقدس دھاگہ پہنیں اور کشمیر کی سمت سات قدم چلیں۔ مقدس دھاگے کو

کشمیر سے آنے اور واپس آنے کی علامت سمجھا جاتا ہے اور تعلیم کی تکمیل کے بعد اسے تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ کشمیر ابتدائی دور سے ہی سیکھنے کا مرکز تھا۔ کسی بھی عالم کو اس وقت تک کامیاب نہیں سمجھا جا سکتا جب تک کہ وہ کشمیر کے نامور علماء سے کئی سالوں تک اپنے آپ کو وابستہ نہ کر لے اور ان سے سبق نہ لے۔ اس کی عکاسی معروف اسکالر شمندرا (Kshemendra) کے ایک مشاہدے سے ہوتی ہے کہ بنگال کے طلباء مٹھ میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے کشمیر گئے تھے۔ بدھ خانقاہوں کی تعمیر، جو کہ راہبوں کی رہائش گاہوں کے علاوہ سیکھنے کے مراکز تھے، کشمیر میں جاری رہی۔ اپنے کام کی چوتھی کتاب میں کلہن پھر سے وہاروں اور مٹھوں (Viharas and Mathas) کی تعمیر کا اڑتا ہوا حوالہ دیتا ہے۔ ایک دلچسپ حوالہ میں، راجاترنگنی کے مصنف نے ہمیں کشمیریوں کے ساتھ ساتھ غیر ملکیوں کے لیے ملکہ ڈیڈا (Didda) کی طرف سے ایک وہار کی تعمیر کے بارے میں بتایا ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی شکل چوکور ہے۔ یہ تصور کرنے کے لیے کسی تخیل کی ضرورت نہیں ہے کہ کشمیر میں وقتاً فوقتاً تعمیر کیے گئے اتنی بڑی تعداد میں وہاروں نے طویل عرصے تک عظیم بدھ مت کی تعلیم کی نشستوں کے طور پر کام کیا۔ اس کا نتیجہ بدھ مت کے علمائے کرام کی شہرت زمین سے پیدا ہونے والے اور ان کے تخلیق کردہ کاموں سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ علم کے ایسے مراکز کا لسا جیسے شریر بادشاہوں کا شکار ہو گئے جنہوں نے انہیں بے دردی سے لوٹا اور قیمتی ورثے کو تباہ کر دیا۔ راج ترنگنی نے کشمیر کا ذکر سائنس اور فنون کے عظیم میدان کے طور پر کیا ہے۔ ادبی دنیا میں بلند ترین مقام حاصل کرنے والے نامور شخصیات کے بے شمار ناموں کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ کشمیر شاعری کے مطالعہ کا مرکز تھا، بھاہا (7ویں صدی عیسوی)، وامان (8ویں صدی عیسوی)، رودرتا (8ویں سے 9ویں صدی عیسوی)، ممتا (11ویں صدی عیسوی) اور دیگر کا گھر تھا۔ اس شعبے کے سرکردہ مصنفین کی اکثریت کا تعلق کشمیر سے تھا۔ اس نے چرکا (Charka) جیسے مشہور ڈاکٹر بھی پیدا کیے، جن کی طب پر کتابیں جدید طبّی اور جراحی کی دنیا کے لیے ایک معجزہ ہیں۔ طب کے میدان میں ترقی کے اعلیٰ نشان کی تصدیق علاقے کے کچھ نسخوں سے ہوتی ہے۔ دور دراز کے ممالک سے ثقافت اور خطوط کے لوگ یہاں آئے اور علم کے عظیم ماسٹرز کے قدموں میں بیٹھ کر بے تکلف علم و فن کے چشموں میں گہرائی سے پانی پیا۔ یہاں سے علم کی مشعل لے کر دور دراز کے ممالک میں اساتذہ کو روانہ کیا اور وہاں سے جہالت کے اندھیروں کو دور کیا۔ شاردا (Sharda) قدیم علم اور زیارت کا ایک مشہور مقام تھا۔ یہ ایک ایسی یونیورسٹی سمجھی جاتی تھی جہاں دور دور سے علماء آتے تھے۔ مشہور کشمیری رسم الخط شاردا (Sharda) یہاں تیار ہوا۔ یہ اس وقت پاکستان کے زیر قبضہ کشمیر کے حصے میں ہے۔ یہ نہ صرف کشمیر بلکہ اس سے بھی آگے کا مشہور تعلیمی مرکز ہونے کا لطف اٹھاتا ہے۔ کلہن، بذات خود، للیتادتیہ (Lalitaditya) کے دورِ حکومت کے اپنے بیان میں، گوڑا یا بنگال کے بادشاہ کے کچھ پیروکاروں کا حوالہ دیتا ہے، جو شاردا (Sharda) کے مزار پر جانے کے بہانے کشمیر آئے تھے۔

4.9 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس یونٹ سے کلہن کے تاریخ نویسی کے نظریات کا پتہ چلتا ہے کہ اس نے کشمیر کے سماج، سیاست، مذہب، جغرافیہ، معاشی اور کشمیر کے قدیم تاریخ بہت تفصیل کے ساتھ لکھتا ہے۔ اس اکائی سے کشمیر سے کاشی کے درمیان تعلقات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس دور میں تجارتی راستہ پر حکمرانوں نے کس حد تک اپنی نظر ثانی رکھتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ کشمیر کی تعلیمی مرکزیت کی شکل میں ایک عظیم مرکز نظر آتا ہے جو

اس وقت کشمیر سے بھی بڑھ چڑھ کر تھا۔ کشمیر میں بدھ مذہب کی ارتقاء کشان دور سے ہی دیکھنے کو ملتی ہے اور اسی کے نتیجتاً کشمیر علم کے علاقہ میں ایک اپنا اہم مقام حاصل کیا۔

4.10 کلیدی الفاظ (Keywords)

الفاظ	:	معنی
ترنگ	:	حصہ
راجپوترا	:	سماجی طبقہ جس کا کام حفاظت تھا
ڈومبا	:	کشمیر کی نچلی ذاتی کو ڈومبا کہتے ہیں
چنڈالا	:	نچلی ذاتی جسکا کام قبروں کو کھودنے کا تھا
ڈامرا	:	کشمیر کا امیر طبقہ جن کے پاس بہت زمین ہوتی تھی
کیاستھ	:	عالم طبقہ
ملیچھ	:	گریک اور سینٹرل ایشیاء سے آنے والے لوگ
ہاکھ	:	کشمیر کی ایک عام سبزی جسے ہر گھر میں پایا جاتا ہے
کرم	:	اس جنم میں جیسا کروگے اگلے جنم میں ویسا ملے گا۔

4.11 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

4.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. مارٹنڈ مندر (Martand Mandir) کس نے بنایا۔
2. ہاکھ کیا ہے۔
3. ڈامر اطبقہ کس حصّہ میں مقبول میں تھا۔
4. راج ترنگنی کس بارے میں جانکاری فراہم نہیں کرتی ہے۔
5. راج ترنگنی کس صدی میں لکھی گئی۔
6. بادشاہ سنکر ورمن کی ملکہ کا نام کیا تھا۔
7. میلچھ کن لوگوں کو کہا جاتا تھا۔
8. نریپاولی کس کی کتاب ہے۔
9. لفظ ہسٹوریا (Historia) کس زبان کا لفظ ہے۔

10.ابوالفضل کس بادشاہ کے تاریخ دان تھے۔

4.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. کشمیر کی معیشت پر راج ترنگنی کی نظر سے روشنی ڈالیئے۔
2. راج ترنگنی میں زہر الفاظ خرافات اور حکایات کو اپنے لفظوں میں لکھیے۔
3. جگرافیائی لحاظ سے راج ترنگنی کس طرح کارآمد کتاب ہے؟
4. کشمیر اور کاشی کس لحاظ سے یکساں تھے۔
5. راج ترنگنی میں کشمیر کی دی ہوئی سماجی حالت پر روشنی ڈالیے۔

4.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات(Long Answer Type Questions)

1. راج ترنگنی میں کلہن نے کشمیر کی علمی تاریخ کو کس انداز سے بیان کیا ہے؟
2. کلہن ایک تاریخ دان تھے۔اس پر روشنی ڈالیے۔
3. کشمیر کے انتظامی پہلوں پر روشنی ڈالیے جسے کلسانہ نے بڑے تندسے بیاں کیا ہے۔

4.12 مزید مطالعہ کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

---

1. *Kalhana's Rajatarangini* by M.A. Stein
2. *Hindu History of Kashmir* by Horace Hayman Wilson
3. *Kings of Kashmir* by Jogesh Chandra Dutt
4. *Tales from the Rajtarangni* by S.L. Sadhu
5. *Tales from the Rajtarangni* by S.L. Sadhu

6۔راجترنگنی۔رام تیج شاستری پنڈت(اردو)

اکائی 5۔ عرب تاریخ نویسی

(Arab Historiography)

اکائی کے اجزا

5.0		تمہید
5.1		مقاصد
5.2		عربی تاریخ نویسی کا پس منظر
5.3		عربی تاریخ نویسی کے محرکات
5.4		قرآنی تعلیمات کا اثر
5.5		عربی تاریخ نویسی پر احادیث کا اثر
5.6		عربی تاریخ نویسی میں سیرت و مغازی کا کردار
	5.6.1	سیرت و مغازی
	5.6.2	شہاب زہری
	5.6.2	محمد بن اسحاق راہویہ
	5.6.4	عمر الواقدی
	5.6.5	محمد ابن سعد الزہری
5.7		عربی تاریخ نویسی کا آغاز وارتقا
	5.7.1	محمد بن جریر الطبری
	5.7.2	حسین بن علی ابوالحسن المسعودی
5.8		تاریخ نویسی کے فروغ میں عرب سیاحوں کا کردار
5.9		اکتسابی نتائج
5.10		کلیدی الفاظ
5.11		نمونہ امتحانی سوالات

5.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
5.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
5.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
5.12 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

5.0 تمہید (Introduction)

عرب ان قوموں میں سے ایک ہے جن کو مورخین سامی اقوام کہتے ہیں۔ جن میں اشوریوں، عبرانیوں، آرامیوں اور حبشیوں کی قومیں شامل ہیں، یہ تمام اقوام سام بن نوح سے نکلیں، جہاں انہوں نے پرورش پائی اور پھر مختلف مقامات پر بس گئیں، کوئی عراق، تو کوئی حبشہ کچھ فلسطین تو کچھ شام کے ساحلی علاقے تک پہنچ گئے اور بہتوں نے یمن، حجاز اور نجد کو اپنا مسکن بنایا۔ قحطان وعدنان کے خاندان انہی علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔

ماہرین لسانیات نے جس طرح آریائی زبانوں کو تین حصّوں لاطینی، یونانی اور سنسکرت میں تقسیم کیا ہے اسی طرح سامی ماہر لسانیات نے بھی زبان کے تین حصے کیے ہیں: آرامی، کنعانی اور عربی۔ آرامی سے کلدانی، سریانی وغیرہ۔ کنعانی سے عبرانی، قینقی اور عربی سے مضرِ کی شستہ اور بلیغ زبان نیز متفرق بولیاں وجود میں آئیں، جن کو یمنی اور حبشی قبائل بولتے ہیں۔ عربی زبان دوسری زبان کے مقابلہ انقلابات دہر سے زیادہ متاثر نہیں ہوئی اور آرامی اور کنعانی کی بنسبت اپنی اصل سے زیادہ قریب ہے۔

شمالی اور جنوبی عرب کے باسیوں کی متعدد بولیوں کے باہمی اختلافات اور ایک دوسرے پر تسلّط کی کشمکش نے ان میں باہم سیاسی وتجارتی تعلق پیدا کر دیا۔ یہ کشمکش چھٹی صدی عیسوی تک جاری رہی۔ یمنیوں میں حمیری حکومت کا زور آہستہ آہستہ کم ہوتا چلا گیا، حالانکہ عدنانیوں کو بازاروں، میلوں اور حج بیت اللہ کی شرکت نیز حمیری اور ایرانی حکومتوں سے مقابلہ آرائی اور روم وحبشہ سے تجارتی تعلقات نے ترقی کی راہ پر گامزن کر دیا۔ اور قریش کی زبان کو دینی، اقتصادی اور اجتماعی لحاظ سے دوسری زبانوں پر فوقیت حاصل ہو گئی۔

عربوں کی شاعری کا تاریخی منظر نامہ اقوام عرب کی بود و باش، سماجی، معاشی و معاشرتی حالات کا بھرپور عکّاس ہے، ان کا سرمایۂ ادب دیگر اقوام عالم کے سرمایۂ ادب سے ہر گز کم نہیں ہے۔ اقوامِ عالم کے تاریخی ورثہ میں تاریخی واقعات حکایات، اساطیر اور قصص دستیاب ہیں جو فصاحت وبلاغت میں معیاری قرار پائے، جیسے مہابھارت جو رزمیہ داستانوں میں سے ایک ہے جسے گرو ویاس نے سنسکرت میں صدیوں قبل مسیح نظم کیا یا شاہنامہ فردوسی جسے حسن بن اسحق فردوسی (۴۱۱ھ/۱۵۲۰ء) نے فارسی زبان میں قلم بند کیا ہے۔ یہ دراصل رستم وسہراب کے درمیان جنگی واقعات پر مشتمل ایران کی قدیم تاریخ ہے۔ شاہنامہ فردوسی میں ساٹھ ہزار اشعار ہیں۔ تاہم عربی زبان کی گہرائی وگیرائی کے سامنے دوسری زبانیں کم معیاری ہیں، یہی وجہ ہے کہ عرب اپنے کو عرب (بولنے والا) اور دوسری اقوام کو عجم (گونگا) کہتے ہیں۔

تجارتی مراکز کو عربی زبان وادب کے ارتقاء میں اہم مقام حاصل ہے۔ عرب خانہ بدوش سال کے مختلف حصوں میں علاقے کے مختلف بازاروں اور میلوں میں شرکت کرتے۔ ایک بازار سے دوسرے بازار تک تجارتی مال لے جاتے ہوئے آپس میں گفت وشنید اور شعر وشاعری کرتے۔ان بازاروں میں 'سوق عکاظ'، 'ذوالمجاز' (عرفات کے عقب میں ایک مقام) اور 'دُبّا' کے میلے خاص اہمیت کے حامل ہیں، یہاں وہ حسب ونسب، بلند کارنامے، فخر ومباہات کو اشعار میں پیش کرتے اور اس طرح 'الشعر دیوان العرب' اشعار ہی عربوں کی تاریخ بن گئی۔

5.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- طلبا عرب اقوام اور ان کے ابتدائی حالات جان سکیں گے۔
- طلبا عربی تاریخ نویسی کے آغاز وارتقا پر گفتگو کر سکیں گے۔
- طلبا عرب تاریخ نویسی کے فروغ میں قرآن واحادیث کے کردار کو بیان کر سکیں گے۔
- طلبا عربی تاریخ نویسی میں سیرت ومغازی کی اہمیت کی وضاحت کر سکیں گے۔
- طلبا عربی زبان میں لکھی گئی اہم تاریخی تصنیفات سے واقف ہو سکیں گے۔
- طلبا اہم عرب مورخین اور ان کی تاریخی خدمات کا جائزہ لے سکیں گے۔

5.2 عربی تاریخ نویسی کا پس منظر (Origin and Development of Arab Historiography)

عربوں میں تاریخ نویسی کا باقاعدہ شعور اس وقت پیدا ہوا، جب قرآن کریم نازل ہونا شروع ہوا بلاشبہ اس احساس کی شروعات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے۔تاریخ کی ابتدا وہ وحی ہے جس نے علم کا درس دیا''، قلم سے لکھنا سکھایا اور انسان کو وہ کچھ سکھایا جس سے وہ آشنا نہ تھا۔ قرآن جس کا تدریجی نزول ۲۳ سال کے طویل عرصے پر محیط ہے، گذشتہ قوموں کے عروج وزوال کی داستان کے ساتھ سرکش قوموں کے دردناک انجام اور نیک اور صالح لوگوں کو انعام واکرام سے نوازے جانے کو مدلل مفصل دلنشیں پیرائے میں فصاحت وبلاغت سے بھرپور زبان میں بیان کرتا ہے۔قرآن جس زبان میں اترنا شروع ہوا وہ ایسی فصیح زبان تھی جس سے زمانۂ جاہلیت کے شعراء بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ قرآن کی فصاحت وبلاغت اور معیار کی بلندی کے سامنے ان کو سرنگوں ہونے پر مجبور ہونا پڑا اور ان میں کئی ایسے شعراء تھے جنہوں نے قرآنی اعجاز کو دیکھ کر اپنی شاعری ترک کر دی، قرآن کے عظیم اور دلنشیں اثرات دیکھتے ہی دیکھتے دور دور تک پھیل گئے، عربوں کی زندگی میں انقلاب برپا ہو گیا، عرب جو ایک بدو قوم تھی مختلف قبیلوں میں بٹی ہوئی تھی سماجی اور معاشرتی اعتبار سے انتہائی پستی میں تھی وہ قوم اب نبی رحمت کے سائے میں پرورش پاکر سیاسی، سماجی اور معاشرتی اعتبار سے عزت وسربلندی کے اس مقام پر پہنچ چکی تھی جس مقام پر نہ کوئی قوم اس سے پہلے پہنچی اور نہ قیامت تک کبھی کوئی قوم پہنچ سکتی ہے، خواہ زمانہ کتنا ہی ترقی کر لے، تہذیب وتمدن کے جتنے بھی دعوے کر لے۔

قرآن مجید عربی زبان کی پہلی مرتب اور مدوّن کتاب ہے اور عرب تاریخ نویسی کی اساس ہے۔ قرآن مجید میں آسمانی صحیفوں اور کتابوں جیسے تورات وزبور وانجیل کا ذکر ملتا ہے جہاں انبیاء بنی اسرئیل کی سرگزشتیں ہیں، یہود ونصاریٰ کی تحریفات اور ان کی ریشہ دوانیوں اور ان کی پیش کردہ تاریخ پر تنقید وتبصرہ ملتا ہے۔ قرآن کریم کے مطالعہ سے یہ عُقدہ کھلتا ہے کہ ان صحیفوں کا سرچشمہ بلاشک وشبہ وہی ہے جو قرآن کا ہے، قرآن کے حکیمانہ وفلسفیانہ انداز بیان کو سمجھنے میں جو مدد ان صحیفوں سے ملتی ہے وہ بہ مشکل کسی دوسری ذریعہ سے ملتی ہے، خاص طور پر تورات وزبور اور انجیل کے اندر انداز بیان کی وہ حلاوت ملتی ہے جو قرآن وحدیث کے علاوہ کہیں اور نہیں ملتی ہے۔

5.3 عربی تاریخ نویسی کے محرکات (Factors of Arab Historiography)

عربوں کا اپنے حسب ونسب پر بڑا زور تھا۔ اس پر وہ فخر کرتے تھے، اس کا اثر قبائیلی زندگی پر پڑا، زمانۂ جاہلیت میں فخر ومباہات بیان کیے جاتے تھے وہ سمجھتے تھے کہ نسب کا عنصر اخلاق کی تعمیر وترقی میں اہم رول ادا کرتا ہے، اس لیے ہر قبیلہ اپنے آباء واجداد کے کارناموں کو محفوظ رکھتا۔ اسلام نے نسل پرستی کو یکسر خارج کر دیا تاہم اجتماعی تقاضوں کے تحت نام کے ساتھ قبیلے کا اندراج باقی رہا، اس اہمیت نے ''علم الانساب'' کو ایک مستقل فن بنادیا جس کا آغاز پہلی صدی ہجری کے نصف اوّل سے ہوا۔ جس سے عرب تاریخ نویسی کی راہ ہموار ہوئی۔

ابتدا میں انتظامی ضرورتیں بھی عرب تاریخ نویسی کا محرک بنی تھیں، وظائف کی تقسیم میں یہ ضروری سمجھا گیا کہ کس نے کب کس صورتِ حال میں اسلام قبول کیا ہے۔ اسی کی بنیاد پر وظائف کی شرحیں مقرر ہوتی تھیں وظیفے کی تقسیم میں حسب ونسب کی بھی اہمیت تھی۔ اس مقصد کے پیش نظر قبولِ اسلام کے زمانے کی چھان بین ہوتی اور متعلقہ اشخاص سے متعلق تحقیق کی جاتی، ان انتظامی ضرورتوں کے تحت فوجوں کا رجسٹر تیار کیا جاتا کہ مال غنیمت کی تقسیم اور تنخواہوں کا ریکارڈ رکھا جائے۔ یہ کام حضرت عمر کے دور میں شروع ہوا۔ انہوں نے قاضیوں کا تقرر کیا، مشہور قاضی شریح ۶۰ سال تک قاضی رہے۔

جب عربوں کی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا اور ممالک مفتوحہ میں زمینوں پر لگان اور تقسیم کے مسائل پیدا ہوئے تو حکومت نے اپنی توجہ سب سے پہلے ممالک کی نوعیت کا تعین پر مبذول کی۔ یہ پتہ لگانے کی کوشش کی گئی کہ کون سا علاقہ لڑائی، صلح یا معاہدہ کے تحت ان کے منٹرول میں آئے یا ان کی نوعیت کوئی اور ہے، اس لیے لوگ فتوحات کو ضبط تحریر میں لانے کی طرف متوجہ ہوئے، یہی ضبطِ تحریر تاریخی مواد ثابت ہوئی جس کو حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں شروع کیا تھا۔

5.4 قرآنی تعلیمات کا اثر (Impact of Quranic Teachings)

قرآن تاریخی مقامات گزشتہ قوموں کے حالات، مثلاً عاد وثمود، قوم لوط اور فرعون کی تباہی کا ذکر کرتا ہے، ساتھ ہی اس میں ابتدائے آفرینش سے قوموں کے معتقدات، ان کے نبیوں کی دعوت وتبلیغ پر ان قوموں کے کفر وعناد کا تذکرہ ملتا ہے، علاوہ ازیں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی خطہ عرب میں آمد، ان کی قربانی، ان کی دعوت، ان کے ہاتھوں اللہ کے گھر کی تعمیر اور ان کے وجود سے

عرب کے اخلاقی، تمدنی، معاشرتی اور معاشی حالات میں رونما ہونے والی تبدیلی کا مختلف انداز میں بیان موجود ہے۔

بعد ازاں قریشِ نے دینِ ابراہیم کو جس طرح مسخ کر دیا اور اللہ کے گھر کو جو مرکزِ توحید تھا مرکزِ شرک بنا دیا اور جو رسوم اور بدعات ظہور میں آئیں جگہ جگہ ان کے حوالے دئے ہیں۔ ان ساری باتوں کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ماضی کی تاریخ پر پوری نظر ہو، چنانچہ یہود حضرت ابرہیمؑ و حضرت اسماعیلؑ کی تاریخ کے اس حصے سے جس کا تعلق عرب میں ان کی آمد اور ما قبل تعمیر بیت اللہ سے تھا یکسر بدل ڈالا، علاوہ ازیں قرآن میں ایسے تاریخی مقامات کا بھی ذکر ہے جو کھنڈرات کی شکل میں بطور نشانی آج بھی موجود ہیں، ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جن کو قرآن نے پہلی بار متعارف کرایا اور وہ تاریخ کا حصہ بنے مثلاً حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کا ذکر اقوامِ عالم میں قرآن کی وجہ سے متعارف ہوا۔ اس سے پہلے دنیا اس حقیقت سے واقف ہی نہ تھی۔

قرآن مجید باعث رحمت، ذریعہ نصیحت ہونے کے ماسوا ایک عظیم تاریخی شاہکار بھی ہے، کوئی شخص اس کتاب پر ایمان رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو لیکن وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ جتنا بڑا انقلاب اس کتاب نے دنیا میں برپا کیا اتنا بڑا انقلاب کسی کتاب نے کبھی برپا نہیں کیا، اس سے لوگوں کے سوچنے کے انداز بدل گئے، ایک جداگانہ تہذیب و تمدن کی بنیاد پڑی، آئین و قانون وجود میں آیا، لوگوں کا ذہن و ایمان بدل گیا، اتنی ہمہ گیر و عالم گیر تبدیلی لانے والی کتاب کسی کے نزدیک اچھی بھی ہو سکتی ہے بری بھی لیکن غیر اہم نہیں ہو سکتی۔

عالمِ انسانی کی ایک بڑی تعداد اس کو نہ صرف مصحفِ رشد و ہدایت بلکہ ایک ایسی معجزاتی کتاب تصور کرتا ہے، جو اپنی وضاحت آپ کرتا ہے، ماضی کے واقعات کو دلائل و ثبوت کے ساتھ اور تاریخی پس منظر میں پیش کرتا ہے اور مستقبل کی طرف رہنمائی کرتے ہوئے انسان کو دلنشیں پیرائے میں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے تاکہ انسان فلاح پا سکے۔

قرآن کے مطالعہ سے مورخین یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ اگر نبوت و رسالتِ محمدی آخری کڑی ہے تو گزشتہ قومیں اور ان کے درمیان مبعوث ہونے والے کون کون سے انبیاء تھے، ان قوموں کے احوال و کوائف کیا تھے۔ چنانچہ قرآن کے ظہور سے ان کے تاریخی شعور میں وسعت پیدا ہوئی، انہوں نے تاریخ اقوامِ عالم سے اپنا رشتہ جوڑا اور گزشتہ انبیاء کی تاریخ سے واقفیت حاصل کی، ایمان لانے والوں میں کچھ ایسے اصحاب رسول بھی تھے جن کا تعلق اہلِ کتاب سے تھا، وہ بذریعہ تورات و انجیل، قدیم قصص و اخبار سے واقف تھے، وہ لوگ براہِ راست ان کتابوں سے استفادہ کرتے تھے، عبداللہ بن سلام، کعب الاحبار اور وہب بن منبہ وغیرہم اس کی واضح مثالیں ہیں۔

عرب تاریخ نویسوں میں عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سب سے کم عمر مفسر قرآن پاک اور حدیث کے راوی ہیں، انہوں نے انبیاء کرام کے حالات و واقعات کو وہب ابن منبہ اور کعب الاحبار کے حوالے سے اپنی تفسیر میں جمع کیا، وہب ابن منبہ کی معلومات سب سے زیادہ تھیں چنانچہ عبداللہ ابن عباس زیادہ تر انھی پر انحصار کرتے تھے، اس کے علاوہ احادیث اور مغازی پر بھی ان کو عبور تھا۔

5.5 عربی تاریخ نویسی پر احادیث کا اثر (Impact of Hadiths on Arab Historiography)

تاریخ نویسی کو قرآن کے بعد حدیث سے تقویت ملی، سیرت و مغازی کی تدوین میں فن حدیث سے تقویت ملی، اور فنّ حدیث کے پہلو بہ پہلو ترقی کی، ابتداء میں سیرت و مغازی کے مؤلفین بھی حدیث جمع کرتے تھے، انھیں بھی محدث کہا جاتا تھا، بعد میں یہ فن الگ ہو گیا اور سیرت و مغازی کو صحابہ اور تابعین نے علیحدہ موضوع بنایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول و فعل، گفتگو و عمل حدیث کہلاتی ہیں۔ قرآن مجید کے بعد دینی و ثقافتی امور میں حدیث کا دوسرا درجہ ہے، قرآنِ کریم کی تفاسیر کے ماخذوں میں سب سے زیادہ نمایاں ذخیرۂ احادیث و آثار ہے، محدثینِ کرام نے حدیثوں کی چھان بین، جرح و تعدیل کے اصول مرتب کیے، روایت اور درایت کا ادراک کیا، اس علم کو پرکھنے کے لیے اسماء الرجال کا فن ایجاد کیا، محدثین ایک ایک حدیث کی معتبریت کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے بے انتہا محنت اور مشقت سے گزرے اور انہوں نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ راوی کی دوسرے راوی سے ملاقات ہے یا نہیں، کس نے کس سے حدیث نقل کی، درمیان کی کڑیاں مضبوط ہیں یا ٹوٹی ہوئی اور اگر روایت اور اس کا متن مبینہ اصولوں پر پورا اتر رہا ہے تو کیا بیان کرنے والے کی لِقاء (ملاقات) آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی ہے یا نہیں، آیا متن کسی اور راوی نے بھی بیان کیا ہے یا نہیں، خلاصہ یہ کہ محدثین نے بے انتہا جانفشانی سے احادیث کو جمع کیا، سب سے زیادہ احادیث حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہیں، چونکہ وہ ہمہ وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتے تھے جب کہ بالعموم مہاجرین اور انصار صحابہ کرام کی اور بھی دوسری مصروفیات تھیں ان کی جمع کردہ احادیث کا مجموعہ جو انہوں نے اپنے شاگرد ابن ابی ہمامؒ کو نقل کرایا اس میں پانچ ہزار احادیث کا تذکرہ ہے۔ یہ مجموعہ صحیفہ ابن ابی ہمامؒ کے نام سے پیرس کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس کا ایک حصہ ڈاکٹر حمید اللہ مرحوم نے ایڈٹ کر کے شائع کرایا ہے۔ غرض بعض اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے اپنے مجموعۂ احادیث مرتب کیے تھے۔

احادیث پر کام کرنے والوں میں مالک ابن انس (۹۵ھ/۷۱۴ء۔۱۷۹ھ/۷۹۵ء) کو اولیت حاصل ہے، انہوں نے روایت اور درایت کے اصولوں کو بنیاد بنا کر احادیث و فقہ کا ایک مجموعہ ''موطا'' کے نام سے لکھا جس کی اہمیت مسلم الثبوت ہے، اس دور میں فقہ میں اپنی افضلیت اور برتری ثابت کرنے کا دور شروع ہو چکا تھا۔ احادیث کی روایت اور درایت میں کذب و افتراء کی آمیزش شروع ہو چکی تھی اور حق لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا، کذب و افتراء کی پہچان کی غرض سے اسحاق ابن راہویہ (۲۳۸ھ/۸۵۲ء) نے اس موضوع پر قلم اٹھایا، انہوں نے حدیث کو فقہ سے الگ کیا، اس طرح احادیث کے چھ مجموعے (صحاحِ ستہ) وجود میں آئے اور لوگوں نے ان مجموعوں کی صحت پر اتفاق کیا، اب جتنے بھی مجموعے ہیں ان کی تلخیص و تشریح سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔

5.6 عربی تاریخ نویسی میں سیرت و مغازی کا کردار

(Impact of Sirah and Maghazi on Arab Historiography)

5.6.1 سیرت و مغازی (Sirah and Maghazi)

قصص و حکایات کے ذریعہ تاریخ نویسی کی ابتدا پہلی صدی ہجری (چھٹی صدی عیسوی کے نصف آخر) میں شروع ہوئی اسی دور میں

سیرت و مغازی کی کتابیں تدوین ہونے لگیں۔ مغازی وہ جنگیں کہلاتی ہیں جن میں پیغمبرِ اسلام بذاتِ خود شریک ہوئے، لیکن سیرت نگاروں اور مغازی نویسوں نے اس کا دائرہ اور زیادہ وسیع کر دیا اور اسے پیغمبر اسلام کی مکمل سیرت اور عہدِ رسالت کے تمام واقعات کا مجموعہ قرار دیا۔ اگرچہ سیرت کا لفظ دیگر اہم شخصیات کی سوانح کے لیے بھی استعمال ہوا ہے جیسے کہ کتاب سیر الملوک، کتاب سیرۃ معاویہ وغیرہ۔ لیکن السیرۃ کا لفظ بالعموم مغازی کے لیے ایک خاص مفہوم یعنی سیرت النبی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس کا السیرۃ والمغازی یا السیر والمغازی یعنی نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل سوانح حیات۔

خلافت راشدہ کے قیام کے بعد قرآنِ کریم کی جمع وتدوین اور احادیث کی جرح وتعدیل شروع ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ پیغمبرِ اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور ان کی زندگی کی دیگر اہم سرگرمیوں سے متعلق تاریخ نویسی شروع ہوئی۔ اس کی بنیاد احادیثِ نبوی کے مجموعے و سوانح تھے۔ جن کا تعلق آپ کی سیرت اور مغازی دونوں سے تھا۔ یہ معلومات کتب سیر میں ابتدائی زمانے میں استعمال ہونے لگیں۔ چنانچہ تاریخ نویسی کے اسلوبِ تالیف پر اسناد کے استعمال کی وجہ سے بہت گہرا اثر پڑا۔ جس کی وجہ سے عرب تاریخ نویسوں کو معلومات کی چھان بین، تفتیش و تحقیق میں بڑی آسانی ہوئی۔ پہلی بار یہ احساس ہوا کہ علمِ تاریخ کے اعتبار سے ہم ٹھوس زمین پر کھڑے ہیں۔

سیرت و مغازی پر کتابیں تالیف کرنے والوں میں ابان بن عثمان (۲۰ھ/۶۴۰ء وفات ۹۵ھ/۷۱۴ء) عروۃ بن زبیر (۲۲ھ/۶۴۲ء وفات ۹۴ھ/۷۱۲ء) کے نام اہمیت کے حامل ہیں، ان لوگوں کی بیشتر علمی روایتیں مغازی اور سیر سے متعلق ہیں کیونکہ ان دونوں کا گھرانا علمی تھا اور ان کا سلسلۂ نسب قریش سے ملتا ہے۔ ان کا گھرانہ جاہلی اور اسلامی ادوار میں طبقۂ امراء و شرفاء میں شمار ہوتا ہے۔

5.6.2 شہاب زہری (Shahab Zehri)

مغازی پر مشتمل کتابوں میں زیبائش وآرائش سے آراستہ و پیراستہ کرنے کا سہرا عروۃ بن زبیر کے شاگرد محمد بن مسلم بن عبید اللہ بن شہاب الزہری (۵۰ھ/۶۷۱ء وفات ۱۲۴ھ/۷۴۲ء) کو جاتا ہے۔ جنہوں نے سب سے پہلے مختلف ذرائع سے حدیثیں جمع کر کے انھیں ایک مسلسل بیان کی صورت میں مرتب کیا، تاریخی مواد کو پیش کرنے میں ترقی کی جانب یہ پہلا قدم تھا، یہ وہ زمانہ تھا جب خلافت بنو امیہ اپنے استحکام کی آخری حدیں چھو رہی تھی اور زوال کا عمل شروع ہو چکا تھا، عربی اور عجمی تعصبات کو بڑی مقدار میں غذا مل رہی تھی، تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فتوحات کا دائرہ وسیع تر اور علم وادب کی قدر و منزلت آخری حد تک بڑھ گئی تھی اور مدینہ منورہ دینی و دنیوی سرگرمیوں کا مرکز بن چکا تھا۔

چنانچہ ایسے ماحول میں زہری نے تفسیر، حدیث، تاریخ و فقہ کی جمع وتدوین شروع کی، ان کا شمار علماء کبار میں ہوتا ہے، اس زمانے میں قابلیت اور علم کا انحصار بڑی حد تک حافظے پر تھا۔ یادداشت کی مدد سے چیزوں کو لکھ لیا جاتا تھا۔ زہری کا حافظہ قوی اور معتبر تھا، تحصیل علم کا بڑا شوق تھا۔ اس کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ وہ جب کسی مجلس میں جاتے تو سامنے سے داخل ہونے کے بجائے پیچھے کے دروازے سے داخل ہوتے۔ اس کے بعد اس مجلس کے ہر ایک سے خواہ جوان ہو یا بوڑھا، اس سے اپنے کام کی بات پوچھتے۔ گھر لوٹتے ہوئے انصار کے گھروں سے ہو

کر گزرتے ان گھروں کے بوڑھے، جوان، مردوں اور عورتوں سب سے سوالات کرتے اور جو کچھ سنتے اسے لکھ لیا کرتے۔ اسی بنیاد پر زہری نے کئی کتابیں مرتب کی ہیں، ان میں ایک احادیث کا مجموعہ ہے جو کئی ہزار صفحات پر مشتمل ہے، احادیث نبوی کو جمع کرنے کی وجہ وہ عقیدت و محبت تھی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستہ تھی جس کو وہ ذریعہ نجات سمجھتے تھے۔ وہ معلومات کو بڑی محنت و مشقت سے یکجا کرتے اور اس کو عبادت کی عمدہ ترین شکل سمجھتے تھے ان کی دلچسپی کے دائرے میں احادیث، صحابہ کرام کے کارنامے، تاریخ خلفائے راشدین اور انساب جیسے مضامین ہوتے تھے۔ ان موضوعات پر انہوں نے معلومات کا انبار جمع کر لیا، اسی لیے وہ اپنے دور کے جید علماء میں شمار ہوتے ہیں، انہوں نے پہلی بار علم کو مدون کیا اور سب سے پہلے فن مغازی کو مرتب کیا اس کی وضاحت اس طرح سے کی جاسکتی ہے کہ انہوں نے متفرق روایت کو پہلی بار الگ الگ موضوع کے تحت جمع کیا، ان کی دلچسپی اور محنت کی بدولت مختلف موضوعات پر خاصا مواد جمع ہو گیا۔

زہری نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کارناموں کی تصدیق یا تشریح کے لیے قرآن پاک کی آیات سے بھی استشہاد کیا ہے، کیونکہ آپؐ کی زندگی اور قرآن کے مابین جو گہرا ربط تھا زہری کو اس کا شعور تھا۔ خاص طور پر غزوات کے سلسلہ میں جو آیات نازل ہوئی ہیں ان کو بطور تصریح پیش کیا، مزید برآں انہوں نے واقعات کو مرتب کرتے وقت ان میں تاریخی تسلسل کو باقی رکھا۔ اسناد جو کہ فن حدیث کی جان ہے، جس کے ذریعہ ہر راوی (روایت بیان کرنے والے) کو جانچا اور پرکھا جاتا ہے، یہی طریقہ مغازی میں بھی اختیار کیا گیا، چنانچہ زہری نے مغازی میں قصّہ گوئی اور رنگ آمیزی سے پرہیز کیا، اسی لیے ان کے یہاں اسرائیلیات کا اثر نہیں پایا جاتا، اس کے علاوہ خلافِ عقل باتوں کے ذکر سے اجتناب نظر آتا ہے۔

زہری کو شعر و شاعری سے بہت دلچسپی تھی وہ اچھا ذوق بھی رکھتے تھے، مگر انہوں نے اپنی مغازی میں اشعار کا استعمال بالکل نہیں کیا ہے۔ اس سے ان کے معروضی اندازِ فکر کا پتہ چلتا ہے جسے انہوں نے تاریخی مضامین کی ترتیب میں استعمال کیا ہے۔ لیکن کہیں کہیں داخلیت بھی نظر آتی ہے جیسے زہری کے جدّ امجد (پردادا) عبد اللہ ابن شہاب جنگ بدر میں اہل مکّہ کے ساتھ تھے اور جنگ احد میں وہ مکیوں کے اس گروپ میں شامل تھے جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو زخمی کیا تھا، لیکن زہری اپنے مغازی میں اس واقعہ کا ذکر کرنے سے پہلو تہی کرتے نظر آتے ہیں۔ تاہم زہری کے مغازی کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک اہم خاصیت پر نظر مرکوز ہو جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جہاں انہوں نے اسناد کی پابندی بڑی احتیاط سے کی ہے وہیں ایک ہی موضوع کی بہت سی روایات کو جمع کر کے ایک روایت بنا دیا ساتھ ہی تمام راویوں کے اسماء درج کر دئے ہیں، زہری کا یہ ایک بہترین اور جرأت مندانہ قدم تھا، اس سے بعد کے مورخین کے لیے آسانیاں پیدا ہو گئیں اور تاریخ نویسی کے لیے یہ موزوں ترین طریقہ ہے، زہری کے رسالے، کتابیں، مسودے مرورِ زمانہ کی نذر ہو گئے لیکن اس کے بعد کچھ مؤلفین ایسے پیدا ہوئے جنہوں نے مغازی پر کام کیا اور زہری کی تحریروں کے اقتباسات وغیرہ کو اپنی مغازی میں ذکر کر کے اس کو زندۂ جاوید بنا دیا۔ ابن شہاب زہری نے سیرت و مغازی کے ابتدائی دور میں اس فن کی تدوین میں اہم کردار ادا کیا، ان کا یہ کام عہد اسلام کی تاریخ نویسی کے لیے بیش بہا کوشش تھی اور تاریخی مواد محفوظ کرنے میں ترقی کے منازل کی طرف پہلا قدم تھا۔

زہری کی جمع کردہ معلومات سیرت و مغازی کے میدان میں ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے ایک خاص مقام تک آگئی جہاں کمال میں پختگی اور ٹھہراؤ نظر آنے لگا۔اس وقت ایک ایسے فرد کی ضرورت تھی جو ان ارتقائی مراحل کو اپنے اندر سمیٹ کر اسے علمی اور فنی کمال تک لے آئے اور اب تک کی تمام معلومات کو بہ نظر غائر تنقید و تحقیق کی کسوٹی پر پرکھ کر رطب و یابس میں تمیز کر کے ایک جامع کتاب مرتب کرے، جس کے اندر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق تمام معلومات یکجا ہوں اور سیرت کا کوئی بھی پہلو تشنہ نہ رہے۔اس کام کو بہت ہی عرق ریزی، تلاش و جستجو، مخلصانہ ایمانداری اور تحقیق و عمل کے ساتھ محمد ابن اسحاق بن یسار (۸۵ھ/۷۰۴ء۔ ۱۵۱ھ/۷۶۸ء) نے سیرت ابن اسحاق کے نام سے مرتب کیا، جو اپنے پیش رؤوں اور معاصرین کی تصانیف کے مقابلے میں ایک وسیع تر تصور کا نتیجہ ہے۔

5.6.2 محمد بن اسحاق راہویہ (Mohammad Bin Ishaq Rahviya)

محمد بن اسحاق یسار مدینے کے رہنے والے اور زہری اسکول یا وسیع تر معنٰی میں مدنی مکتب فکر کے نمائندے تھے۔ان کا شمار تابعین میں ہوتا ہے، انہوں نے اپنی کتاب کو تین حصّوں میں تقسیم کیا ہے، حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر زمانۂ جاہلیت تک کے حصّے کو المبتدأ (یا مبتدأ الخلق) کا نام دیا ہے دوسرے حصے کو المبعث کا نام دیا، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے حالات اھ تک درج ہیں اور تاریخ نبوت کا بھی اہتمام کیا ہے۔المغازی میں آپ کے حالات زندگی وصال تک درج کیے ہیں، تیسرا حصہ کتاب الخلفاء کے نام سے ہے، جو بہت زیادہ شہرت نہ پاسکے بہت کم مورخین نے اس حصے کو نقل کیا ہے تاہم ابن جریر طبری نے اپنی تاریخ میں کہیں کہیں حوالہ دیا ہے۔کتاب کا دوسرا حصہ جو سیرت نبوی اور مغازی سے متعلق ہے ابن ہشام نے اپنی کتاب میں اس کا خلاصہ درج کیا ہے۔اس کے علاوہ واقدی، محمد بن سعد، ابن جریر طبری وغیرہ نے اس حصے کو اپنی کتابوں میں درج کیا ہے۔اس حصے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب، ولادت، مکہ کی زندگی، بعثت اور ہجرت مدینہ سے متعلق واقعات جمع کیے ہیں۔ابن اسحاق نے اس حصے کو اسناد کی پابندی کے ساتھ اپنے ان مدنی اساتذہ کا بھی ذکر کیا ہے جس سے وہ واقعات لیتا ہے۔اس کے علاوہ حضرت ابو بکرؓ کی تبلیغ سے اسلام قبول کرنے والوں کی فہرست بھی پیش کی ہے۔ابن اسحاق نے مغازی کے باب میں بھی کئی فہرستیں درج کی ہیں، مثلاً غزوۂ بدر اور جنگ احد میں شرکاء کی تعداد، خندق، خیبر، موتہ اور طائف کے شرکاء کی تعداد وغیرہ جو کہ تقریباً ۸۳ ہوتے ہیں۔

ابن اسحاق نے تاریخ الانبیاء کے مواد کو اکٹھا کر کے انھیں بعثتِ نبوی سے جوڑ کر اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ نبوت محمدی ایک طویل تاریخی سلسلۂ نبوت کی ایک کڑی ہے۔تاریخ الانبیاء کے موضوع پر تحریری مواد کے علاوہ انہوں نے یہودی اور عیسائی علماء سے زبانی معلومات بھی حاصل کیں جس سے اقوام ماضیہ کی تاریخ سے بھی ان کی گہری دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے۔تاریخ کے اس حصے کو عربوں کی جدید تاریخ سے جوڑ کر ابن اسحاق نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ گروہِ انسانی کی تاریخ کو ٹکڑوں میں بانٹ کر نہیں سمجھا جاسکتا بلکہ اس کا مربوط مطالعہ ہی صحیح اور نتیجہ خیز مقصد تک پہنچا سکتا ہے۔اس طرح اقوام عالم کی تاریخ ایک خاص سطح پر آکر ایک اکائی بن جاتی ہے۔چنانچہ ابن اسحاق نے اپنی کتاب کا خاکہ اس طرح مرتب کیا کہ خلفاء راشدین اور بنی امیہ کی تاریخ شامل ہو جائے۔ابن اسحاق سے پہلے کے مغازی و سیر کے لکھنے والوں نے اپنی تالیفات کو اس طرح مرتب کیا تھا کہ خلفاء راشدین اور بنی امیہ کی تاریخ بھی شامل ہو جائے۔ابن اسحاق سے ماقبل مغازی و سیر کے لکھنے

والے اپنی کتابوں کو اسی پر ختم کر دیتے تھے لیکن ابن اسحاق نے تاریخ کے ابتدائی دور کو شامل کر کے اپنے ہم عصر مورخین کے اثرات کو قبول کیا اور ما قبل تاریخ کو تاریخ اسلام سے جوڑ کر تاریخی واقعات کو تسلسل اور عقل کی کسوٹی پر پرکھا۔ اس کوشش کی ابتداء دوسری صدی کے نصف اوّل سے ہوئی اور اسی بنیاد پر تیسری صدی کے علماء نے اپنی تاریخی کتابوں کو مرتب کرنا شروع کیا۔ چنانچہ مدینہ اور عراق میں فنِّ تاریخ نویسی اور فکری رجحانات جو الگ الگ فنون پر مشتمل تھے ان سب کو یکجا کرنے والے ابن اسحاق ہی تنہا وہ مورخ ہیں جن کی کتاب کا بڑا حصّہ ہم تک پہنچ سکا۔ بعد کے دور میں ان کے مباحث کو جو منتشر ہو گئے تھے عبد الملک ابن ہشام (متوفی ۲۱۸ھ/۸۳۳ء) نے مکمل کیا، ابن اسحٰق کی تحریروں اور تقریروں کا زیادہ تر حصہ انھی کی مرہونِ منت ہے۔ بعد کے دور میں تاریخ کے مطالعے اور تاریخ نویسی کا کام وسیع تر ہوتا چلا گیا۔

5.6.3 عمر الواقدی (Umar al Waqdi)

اور اس کے جانشینوں میں سیرت و مغازی کی ایک جماعت نے اس کام کو آگے بڑھایا جن میں اہم نام ابو عبد اللہ بن عمر الواقدی (۱۳۰ھ/۷۴۸ء–۲۰۷ھ/۸۲۳ء) کا ہے۔ جو اعلیٰ درجہ کے سیرت نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے سیرت و مغازی کے موضوع کے علاوہ احداث اسلامی اور فتوح پر بھی کتابیں تالیف کیں، خوش قسمتی سے اس کی کئی کتابیں ہم تک پہونچی ہیں، واقدی کے شاگرد محمد بن سعد نے اپنے استاذ کی یہ بات نقل کی ہے کہ کسی انسان نے اپنے حافظے کی مدد سے اتنا کبھی نہیں لکھا اور میرا ذخیرۂ حافظہ میری کتابوں سے کہیں زیادہ ہے۔ واقدی کا حافظہ بہت مضبوط تھا، اپنی معلومات کو وسیع تر کرنے کے لیے انہوں نے بلادِ اسلامیہ کا دورہ کیا اور معلومات کا خزانہ اپنے دماغ میں محفوظ کر لیا، چنانچہ بہت کم ایسے مراکز اور فوجی اہمیت کے حامل مقامات ایسے ہوں گے جنھیں واقدی نے نہ دیکھا ہو۔

فن مغازی پر واقدی کی کتاب مبسوط ہے، اس کا نام کتاب التاریخ والمغازی ہے جس کا تعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی سے ہے، انہوں نے فرمودات، احکام، فیصلوں کے مواد اور دستاویزات کو اپنی کتاب میں نقل کیا ہے جسے انہوں نے اپنے اساتذہ کرام سے لیا ہے،'' انہوں نے واقعات درج کرنے کا ایک نیا طریقہ ایجاد کیا جو کسی دوسرے سیرت و مغازی نگار کے یہاں نہیں ملتا۔ وہ فوجوں کی روانگی اور واپسی کی تاریخیں علی الترتیب لکھتے ہیں اس کے بعد پورے واقعے کو نئے سرے سے بیان کرتے ہیں۔ جس سے پورے واقعہ کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ نیز قرآنی آیات سے واقعہ کا استشہاد بھی گاہے گاہے کرتے جاتے ہیں جن آیتوں کا تعلق کسی خاص معاملہ یا واقعہ سے ہوتا ہے۔

مغازی اور فنّ حدیث کے درمیان خط فاصل اور علیحدگی پیدا کرنے والے شخص واقدی ہیں جنہوں نے سیرت نگاری کے فن کو وسعت دی اور اس کا دامن وسیع تر کرتے چلے گئے، پہلی بار ایسا ہوا کہ انہوں نے ان حکام کی فہرست مرتب کی جو کبھی کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر موجودگی میں مدینے کا انتظام وانصرام سنبھالتے تھے۔ مدنی مکتب فکر کی نمایاں خصوصیت سند کی پابندی تھی، واقدی نے اس کو اپنایا اور سختی سے اس پر عمل پیرا رہے، اس کے علاوہ واقعات کی چھان بین، تحقیق و جستجو کو اپنی تحریر کا نکتۂ نظر بنایا، انہوں نے صحابیوں اور تابعین کے بیٹوں اور آزاد کردہ غلاموں سے براہِ راست پوچھ تاچھ کی، مزید یہ کہ وہ مکین اور باسیوں کے گھر تک گئے یہ معلوم کرنے کے لیے آیا آپ کے گھر کا کوئی فرد جنگ میں شریک رہا، یا اس نے شہادت پائی، کس میدان جنگ میں کون شریک رہے، انہوں نے بذات خود میدان کا عملی معائنہ

کیا جس سے واقدی کے تاریخی ذوق اور حقیقت پسندانہ رویہ کا پتہ چلتا ہے کہ وہ واقعات و حوادث کی چھان بین کے لیے کس قدر محنت کرتے تھے۔

واقدی کی دلچسپیاں صرف مغازی و سیر تک محدود نہ تھیں بلکہ انہوں نے دیگر موضوعات پر بھی قلم اٹھایا اور صدر تاریخِ اسلام پر مبنی کئی کتابیں تحریر کیں مثلاً ارتداد، مقتل عثمان، جنگ جمل اور صفین، عراق و شام کی فتوحات، سیرت پر اہم کتاب "کتاب الطبقات ہے، جو سیرتِ نبوی کے علاوہ صحابہ اور تابعین کی تاریخ پر مشتمل ہے، اس کے علاوہ انہوں نے فقہ پر بھی ایک کتاب الفقہاء کے نام سے لکھی، واقدی نے اپنی تاریخی کتابوں کے ذریعہ ابتدائے اسلام کے اکثر و بیشتر واقعات کو اپنی کتابوں میں محفوظ کر دیا۔ انہوں نے عہدِ ہارون تک کے واقعات کو اپنی کتاب، کتاب التاریخ الکبیر میں درج کیا ہے، اس طرح فنِ تاریخ جو علمِ حدیث پر قائم ہوا، تاریخی مواد سے فائدہ اٹھانے لگا اور عرب تاریخ نویسی کے فنّی پہلوؤں کو نمایاں کر دیا۔

5.6.5 محمد ابن سعد الزہری (Mohammad Bin Saad Al Zehri)

واقدی کے مواد کے ایک بڑے حصہ کو ان کے ایک شاگرد محمد ابن سعد بن منیع الزہری (۱۶۸ھ/۷۸۴ء—۲۳۰ھ/۸۴۵ء) نے اپنی کتابوں میں استعمال کیا، انہوں نے مغازی و تاریخ اسلام پر کئی کتابیں لکھی ہیں، ابن سعد عرصہ دراز تک واقدی کے ساتھ رہے اور سکریٹری کے فرائض انجام دیتے رہے، اس طرح ان کی معلومات میں اضافہ ہوتا رہا اور واقدی کی فراہم کردہ معلومات سے فائدہ اٹھاتے رہے، ان کی کتاب طبقات ابن سعد جو تقریباً پندرہ جلدوں پر مشتمل ہے، اس کتاب میں انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام، تابعین اور خلفاء کی تاریخ اور سیرت نگاری کی ہے، اس طرح کی معجم تراجم کا تصور فن تاریخ میں ایک جدید ارتقاء کی دلیل ہے اور دیکھا جا سکتا ہے کہ اس دور کا فن تاریخ فن حدیث سے کتنا قریب تھا۔

ابن سعد کی تصنیف کا وہ حصہ جس کی ترتیب و تدوین اس نے خود کی وہ سیرت نبوی سے متعلق ہے اور اس کام کی اہمیت مسلم ہے۔ تاریخ مغازی میں انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوامر و نواہی اور خطوط کا اضافہ کیا واقدی کی اتباع میں ایسے اسناد و وثائق سے فائدہ اٹھایا جو اس وقت دستیاب تھے، اس سے بھی زیادہ وہ ابواب اہم ہیں جن میں صفات نبی اور علامات نبوت کا ذکر ہے، یہی مواد بعد کے ادوار میں کتبِ شمائل و دلائل کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔

5.7 عربی تاریخ نویسی کا آغاز و ارتقا (Origin of Arab Historiography)

حقیقی معنوں میں تاریخی تالیفات کی شروعات تیسری صدی ہجری (ساتویں صدی عیسوی) کے نصف سے ہوئی، سیرت کے مواد، مفرد رسائل اور تاریخ خلفاء کے استفادہ سے مربوط تاریخی کتابیں مرتب کی گئیں، اس صنف کے مصنف احمد بن یحی البلاذری (م ۲۷۹ھ/۸۹۲ء) ہیں جنہوں نے قدیم روایت کو باقی رکھا وہ ابن سعد اور المدائنی دونوں کے شاگرد ہیں۔ ان کی تصنیف تنقیدی مذاق کا بہترین نمونہ ہے ان کی دوسری اہم اور خصوصیت کی حامل تصنیف تاریخِ عالم ہے، جس میں ابتدائے آفرینش سے اقوام عالم کی تاریخ کا خلاصہ ہے۔ گو کہ

یہ تصور کوئی نیا نہیں ہے بلکہ ابن اسحاق کی وضع کردہ تصنیفی نظریہ کی توسیع ہے جس میں امتِ مسلمہ کی تاریخ کے ساتھ ساتھ زمانۂ جاہلیت کی تاریخ کا بھی ایک بڑا حصّہ شامل کر دیا گیا ہے۔

تیسری صدی ہجری (ساتویں صدی عیسوی) میں پہلی مرتبہ عربی تاریخ نویسی کی صف میں ایرانی روایات شامل ہو جاتی ہیں، عبد اللہ ابن المقفع (۱۰۶ھ/۷۲۴ء وفات ۱۴۲ھ/۷۵۹ء) نے بہت پہلے ایرانی خدائے نامہ کا عربی ترجمہ پیش کیا تھا یہودی اور نصرانی افسانوی مواد بہت پہلے تفسیر کے پردے میں عربی میں شامل ہو چکے تھے۔ ابن مقفع سیر ملوک العجم کو عربی منتقل کر چکے تھے۔ قدیم واقعات کو اسلامی تاریخ کا دیباچہ خیال کرنے کی روایت کے ڈانڈے یہودی و مسیحی روایت سے ملتے ہیں، تاہم پیشکش کا انداز وہی اسلامی روایت کا سا رہا۔

مورخین نے قصّوں، روایتوں، سوانح اور بیانوں کی بنیاد پر باضابطہ تاریخی کتابیں مرتب کرنا شروع کیا جن میں محمد ابن الدینوری (م ۲۸۲ھ/۸۹۵ء) بھی شامل ہیں جن کی تحریر کردہ تصنیف کتابُ المعارف کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ان کا ایک ہم عصر ابو حنیفہ احمد ابن داؤد الدینوری (م ۲۸۴ھ/۸۹۷ء) نے اصفہان اور دینور میں شہرت پائی، ان کی کتاب کا نام الاخبار الطّوال ہے، فارسی نکتۂ نظر سے یہ ایک عالمی تاریخ ہے۔ یہ دونوں ایرانی النسل تھے، تاریخ کے علاوہ ادب اور لسانیات (لغت) پر بھی کتابیں لکھیں۔ اسی دور میں جغرافیہ نویس اور مورخ ابن واسخ یعقوبی (م ۲۸۴ھ/۸۹۷ء) نے بھی شہرت پائی انہوں نے مجموعۂ تواریخ میں قدیم اور مقبول شیعی روایت کو محفوظ رکھا ان کی تصنیف کو تاریخِ عالم کے بجائے ایک قسم کا تاریخی انسائیکلوپیڈیا (دائرۃ المعارف) کہہ سکتے ہیں، اسی زمرے میں ابن قتیبہ (م ۲۷۶ھ/۸۸۹ء) کی کتاب المعارف اور بعد کی صدی میں حمزہ الاصفہانی (م ۳۶۰ھ/۹۷۰ء) بھی آتے ہیں، ایک اور فارسی الاصل مورخ مسکویہ (وفات ۱۰۳۰ء/۴۲۱ھ) تھے جنہوں نے ہمہ گیر تاریخ مرتب کی وہ فلسفی اور طبیب بھی تھے۔

اس طرح کی تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی تاریخ نویسی کے فن میں ایک نیا فکری عنصر داخل ہو چکا تھا کہ علم کی خواہش علم کی بنیاد پر۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ یعقوبی اور مسعودی صرف مورخ ہی نہیں تھے بلکہ وہ جغرافیہ داں بھی تھے اور انھیں یہ جغرافیائی معلومات زیادہ تر لمبی سیاحت و مسافت سے حاصل ہوئی تھیں۔

5.7.1 محمد بن جریر الطبری (Mohammad Bin Jarir Al Tabri)

محمد بن جریر الطبری (م ۳۱۱ھ/۸۳۸ وفات ۹۲۳ء ۳۱۱ھ) کی مشہور زمانہ تصنیف 'اخبار الرسل والملوک، جامع البیان فی تفسیر القرآن اور تاریخ عالم ہے۔ بحیرۂ قلزم کے جنوب فارس کے کوہستانی علاقے طبرستان میں اس کی پیدائش ہوئی، جہاں قدیم تاریخی روایت اپنے عروج پر تھی چنانچہ طبری محدّث پہلے تھے کچھ اور بعد میں اپنی تاریخ نویسی میں انہوں نے اس بات کو ملحوظ نظر رکھا کہ جس طرح وہ تفسیر میں تاریخی و تنقیدی روایت کے پابند رہے ٹھیک اسی طرح تاریخ نویسی میں بھی اسی اصول پر کار فرما رہے۔ اس طرح اپنی تاریخ کو تفسیرِ قرآن کا تکملہ وتتمّہ بنا سکے۔ یہ کتاب دراصل اس عظیم الشان کتاب کا خلاصہ ہے جو بنیادی تخلیق تھی البتہ تفسیر میں جہاں مصنف کی تنقید صریحی ہے تاریخ میں وہ تنقید ضمنی ہے عالمی تاریخ پر عربی زبان میں ان کی یادگار تصنیف مکمل اور شاہ کار ہے جو بعد کے مورخین مسکویہ، ابن الاثیر اور ابو الفداء

کے لیے ماخذ ثابت ہوئی۔ اکثر مورخین کی طرح طبری نے بھی واقعات کو زمانی ترتیب میں پیش کیا ہے۔ دراصل ان کی تاریخ کی شروعات ابتدائے آفرینش سے ہوتی ہے اور ۹۱۵ء/۳۰۲ھ تک آتی ہے۔ جس کو بعد میں ذہبی (۱۲۷۴ء-۱۳۴۸ء) نے بھی اختیار کیا۔

طبری نے متعدد فارسی تراجم اور ادبی ذرائع کا استعمال کیا ساتھ ہی زبانی ادبیات سے بھی فائدہ اٹھایا جو انہوں نے اپنے سفر کے دوران، فارس، عراق اور مصر کے علمی مراکز سے حاصل کی تھیں۔ تاریخ طبری پر تاریخ نویسی کا ایک دور ختم ہو گیا۔ بعد کے کسی مصنف نے اسلام کی ابتدائی تاریخ سے متعلق مواد کو از سرِ نو جمع کرنے اور جانچنے پرکھنے اور مزین کرنے کا قصد نہیں کیا، زیادہ تر تصنیف نگاروں نے یا تو طبری کے ذریعے حاصل شدہ مواد کا خلاصہ تیار کیا، یا اپنی تاریخ وہاں سے شروع کی جہاں طبری نے اپنی کتاب ختم کی تھی۔ تاریخ نویسی کے لیے محض محدثانہ روایات پر اعتماد کرنے کا زمانہ اب ختم ہو گیا، دفتری نظام حکومت کے قیام کی وجہ سے اہل کار اور درباری صف اوّل میں آگئے جن کی طرف سیاسی تاریخ مرتب کرنے کے لیے رجوع لازم ہو گیا، اس طرح تیسری صدی ہجری/ساتویں صدی عیسوی کا وہ زمانہ جو عربی تاریخ نویسی کا زمانہ تھا، اختتام کو پہونچا۔

علمِ تاریخ کو جب ایک مستقل علم کی حیثیت حاصل ہو گئی، اس کی توسیع بڑی تیزی سے ہونے لگی۔ تیسری صدی ہجری اور چھٹی صدی ہجری کے درمیان بہت سی تصانیف معرض وجود میں آئیں۔ تیسری صدی ہجری میں رواج کے مطابق مختلف علاقوں کے علماء و فضلاء مقامی روایت کو جمع کرنے لگے تاریخ مکہ (ازرقی) کے ماسوا جو تالیفِ سیرت کے زمرے میں آتی ہے، ان میں قدیم ترین علاقائی تاریخ جو مصر اور فتوحات مغرب کے حالات پر مشتمل ہے عبد الرحمن بن عبداللہ ابن الحکم (م ۲۵۷ھ ۸۷۱ء) کی ہے۔ اس کی کتاب میں وہی امتیازی خصوصیات ہیں جو دوسری تاریخی کتابوں میں ہیں، لیکن انداز تنقیدی نہیں ہے۔ فتوحات کا ذکر زیادہ تر مدنی اور غیر مقامی روایات پر مبنی ہے، افسانوں اور صحیح روایات کی جرح و تعدیل سے عاری عبدالملک ابن حبیب (م ۲۳۸ھ/۸۵۳ء) کی تصنیف میں اندلس کے ابتدائی دور کی تاریخ ہے۔ یہی حال ہمدانی (م ۳۳۴ھ/۹۴۵ء) کی الاکلیل کا بھی ہے جو یمنی قدیم روایات کا گنجینہ ہے۔ حقائق پر مبنی اور معتبر تاریخیں جو مقامی شہروں پر مشتمل ہیں تیسری صدی میں لکھی گئیں، لیکن زیادہ تر تاریخی مواد ضائع ہو چکے ہیں۔ بعد کی صدیوں میں اس قسم کی تاریخوں کی فراوانی ہے، جن میں تراجم یا تاریخی وقائع پر زور دیا جاتا تھا۔ تاہم چوتھی صدی کے وسط کے بعد علم تاریخ میں کوئی امتیاز قائم رکھنا مشکل ہو گیا، اس زمانے میں خالص تاریخ نویسی اپنے زمانے کے واقعات و حوادث بیان کرنا تھا جس کے ساتھ بسا اوقات تاریخ عالم کا ایک دیباچہ بڑھا دیا جاتا اور معروضیت کہیں کھو جاتی چنانچہ سیاسی تاریخ نویسی کا کام زیادہ تر سرکاری آفیسروں اور درباریوں میں منتقل ہو گیا اور تاریخ نویسی میں یہ تبدیلی ہوئی کہ اب مفصّل (مکمل) اسناد کے بجائے مختصراً ماخذ کا ذکر کیا جائے اور ان کی وقائع نگاری میں ان کے اپنے طبقے کے تمدنی، سیاسی اور مذہبی تعصبات اور تنگ نظری بھی منعکس (ظاہر) ہو۔ قدیم دینی تصور کو جس کی وجہ سے علمِ تاریخ کی شان اور وسعت کو چار چاند لگ گیا تھا بالکل ہی ترک کر دیا گیا اور سالنامے کے طرز کی تاریخ نویسی کا رجحان زیادہ سے زیادہ کسی حکمراں اور اس کے دربار کی سرگرمیوں پر ہی مرکوز ہونے لگا۔

محدثین اور علماء نے سیرت نگاری کا وسیع میدان اپنے پاس رکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب سیاسی تاریخ نویسی کو بادشاہی خاندانوں کے

سالناموں کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا تو سیرت نگاروں نے تاریخ نویسی کے قدیم تصوّرات کو محفوظ رکھا۔ کیونکہ اہلِ علم کی نظروں میں علماء کے تذکرے، سیاسی اداروں کے مقابلے میں، حقیقی تاریخ اور زیادہ صداقت سے پُر ہوتے تھے۔ اس طرح کی قدیم تصنیف جواب تک محفوظ چلی آئی ہے، وہ خلیفہ عمر (ثانی) ابن عبدالعزیز کی سیرت ہے، جس کا مواد کچھ تحریری دستاویزات اور ثقہ (معتبر) بزرگوں کی روایات سے لیا گیا ہے جو مدینے کے رہنے والے تھے، اسی طرح ابو نعیم اصفہانی (۴۳۰ھ/۱۰۳۸ء) کی تصنیف خلیفۃ الاولیاء اور خطیب بغدادی (م ۴۶۳ھ/۱۰۷۰ء) کی تصنیف چودہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس طرح کی تمام کتب سیرت اور زمانہ مابعد کی اسلامی سیرت نگاری میں بہت کچھ مشترک باتیں ملتی ہیں۔ طریقۂ اسناد کی پابندی عموماً بڑی احتیاط سے کی گئی ہے، تاریخوں کا ترتیب وار مواد خصوصاً سالِ وفات انتہائی صحت کے ساتھ متعین کیا گیا اور مترجم کی زندگی کے ضروری حالات مختصراً بیان کیے گئے ہیں۔

5.7.2 حسین بن علی ابوالحسن المسعودی (Hussain Bin Ali Abul Hasan Al Masudi)

عربوں میں تاریخ نویسی کو نئے انداز میں متعارف کرانے کا سہرا مسعودی کے سر جاتا ہے۔ علی ابن حسین بن علی ابوالحسن المسعودی (پ ۲۸۳ھ/۸۹۶ء، م ۳۴۶ھ/۹۵۷ء) وطن بغداد، (مشہور صحابی حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے خاندانی نسبت، اس لیے مسعودی کہلائے) عربوں کے ہیروڈوٹس نے تاریخ نویسی، جغرافیہ نویسی اور سیر و سیاحت کے لیے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ وقف کر دیا، انہوں نے واقعات کو سال در سال ترتیب دینے کے بجائے، سلاطین اور لوگوں کے احوال و کوائف کو بنیاد بنایا، بعد ازاں ابن خلدون اور دوسرے تاریخ نویسوں نے یہی روش اپنائی۔ مسعودی ان اولین تاریخ نگاروں میں شامل ہیں جنہوں نے تاریخی حقائق اور جغرافیائی معلومات کو استعمال کیا۔ انہوں نے علم کی تلاش میں تحقیقی سفر، شام، آرمینیاء، روم، افریقہ، سوڈان کے علاوہ چین، تبت، ہندوستان اور سری لنکا کا بھی کیا۔ اپنی زندگی کے آخری پڑاؤ پر، جمع کردہ علمی مواد کو مروج الذہب و معادن الجوہر کی شکل میں پیش کیا، اپنی اس دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) میں انہوں نے تاریخ و جغرافیہ کے علاوہ حقیقی سائنسی تجسس کے ساتھ مسلم موضوعات سے ماوراہو کر ہند، فارس، روس اور یہودی تاریخ و مذہب پر بھی تحقیقات کیں۔ اس نے اپنے فلسفۂ تاریخ و فطرت اور معدنیات، نباتات و حیوانات سے متعلق معاصر فلسفیانہ نظریات کا خلاصہ ایک کتاب التنبیہ والاشراف کی شکل میں پیش کی۔ ان کی کتاب مروج الذہب بہت ہی عمدہ اور مفید معلومات سے پُر ہے، انہوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا، لوگوں کے رہن سہن، بود و باش، معاشی حالات وغیرہ قلمبند کیے، پہاڑوں دریاؤں، شہروں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، راجہ مہاراجہ، ان کے علاقے، مہمان نوازی کو ربط باہمی سے مثالی قرار دیا ہے کھمبات کے کپڑوں، جوتوں کے علاوہ خوشبو، عود، لونگ مشک وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے۔

تاریخ عمرانیات اور فلسفۂ تاریخ پر تنقیدی نظر ڈالنے والے عبدالرحمن ابن خلدون (۷۳۲ھ/۱۳۳۲ء—۸۰۸ھ/۱۴۰۶ء) ہیں، جنہوں نے اپنی کتاب مقدمہ ابن خلدون میں اقتصادیات اور فلسفۂ تاریخ کو انسان کی عادات واطوار سے جوڑ کر عمرانیات میں شامل کیا ہے اور اپنے مقدمہ میں تاریخی واقعات و حوادث سے استشہاد پیش کیا ہے، وہ لکھتے ہیں تاریخ ایسا فن ہے جسے دنیا کی قومیں ہاتھوں ہاتھ لیتی ہیں اور جس کو حاصل کرنے کے لیے زادِ سفر باندھتی ہیں۔ عوام و خواص کے باہمی ربط سے تاریخ آگے بڑھتی ہے، نواب و سلاطین پُر جوش انداز میں اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ تاریخ بظاہر لڑائیوں، واقعاتِ گزشتہ اور حکومت کی خبروں سے آگے نہیں بڑھتی، اس میں اقوال کی کثرت اور مثالوں کی بھر

مار ہوتی ہے، مجالس میں تاریخ ہی ہمارے سامنے دنیا کا حال رکھتی ہے کہ لوگ کس طرح نازک ادوار سے گزرے، کیسے دنیا آباد کیا اور اچانک کوچ کا نقارہ بجا اور انہوں نے بوریا بستر باندھ لیا۔ لیکن اگر بغور دیکھا جائے تو تاریخ میں تحقیقی نظریات، اور کائنات کے لطیف علل و مبادی ہیں جس میں واقعات و حالات، اسباب و علل کا گہرا علم ہوتا ہے، تاریخ سے گہری وابستگی ہے اور وہ اس لائق ہے کہ علومِ حکمت میں شمار کی جائے، ابن خلدون مورخین پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اسلام کی مکمل تاریخیں لکھی گئیں اور دنیا کے واقعات قلم بند کیے گئے لیکن جھوٹے اور خود ساختہ واقعات کی آمیزش کر دی گئی، اسباب و علل کی تحقیق نہیں کی گئی، ایک مورخ کو محدّث کی طرح واقعات کی جرح و تعدیل (چھان پھٹک) کرنی ہی چاہئے، مورخین کی تعداد بہت ہے اور تاریخ کی کتابیں بھی بے شمار ہیں، قوموں کے عروج و زوال سے متعلق خوب لکھا ہے، کچھ ایسے بھی ہیں جنہوں نے قدماء کی کتابوں کا قطرہ قطرہ اپنی کتابوں میں نچوڑ دیا، جیسے ابن اسحاق، ابن جریر طبری، ابن مکی، محمد بن عمر واقدی اور سیف بن عمر اسدی، وغیرہم یہ مورخین مشہور اور ممتاز ہیں۔ ابن خلدون نے مسعودی اور واقدی پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر ان کی کتابوں پر تنقیدی نظر ڈالی جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صحیح اور غلط کی تمیز کرنے میں ان سے تساہل ہوا، کیونکہ تاریخ کا تعلق عمرانی حالات وطبائع سے بہت گہرا ہے اور انھی پر آثار و روایت کو پرکھا جاتا ہے۔ رہے اختصار نویس مورخین یہ انتہائی مبالغہ کرنے والے ہیں، یہ صرف سلاطین کے ناموں پر اکتفا کر لیتے ہیں، ان کے نسب و حالات سے تعرض نہیں کرتے بس ان کے ایّامِ حکومت کی تعداد باریک حرفوں میں لکھ دیتے ہیں، جیسا کہ ابن رشیق نے میزان العمل میں کیا ہے، جن لوگوں نے ایسا طریقہ اپنایا ان کی کتابیں ناقابلِ اعتبار، ناقابلِ ثبوت ہیں اور ان میں سے کوئی بات نقل کیے جانے کے لائق نہیں ہے، کیونکہ وہ فوائد سے بالکل ہی خالی ہیں، غلطیوں سے پر ہیں اور تاریخ نویسوں کی عادتوں اور طریقوں سے انحراف کرتی ہیں۔

ابن خلدون نے اپنی کتاب مقدمہ ابن خلدون میں اسناد، واقعات و حوادث پر مفصل بحث کی ہے اور اپنے دعوی کی دلیل اور ثبوت بھی پیش کیے ہیں، جس سے اس کی اصابت رائے صدقِ نظر، وسعتِ معلومات اور جرح و تعدیل میں حیرت انگیز قدرت کا ثبوت ملتا ہے، تاہم علمائے مورخین نے ان کی تاریخ میں کچھ ایسی خامیاں بھی نکالی ہیں، جن میں وہ بذاتِ خود اپنے مقرر کردہ اصول و ضوابط سے منحرف دکھائی دیتے ہیں اور وہی غلطیاں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں جن پر وہ خود معترض ہیں۔

5.8 تاریخ نویسی کے فروغ میں عرب سیاحوں کا کردار

(Role of Arab Travellers in the Development of Historiography)

عرب تاریخ نویسی کا دور اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک ان سیاحوں پر نظر نہ ڈالی جائے جنہوں نے ہندوستانی تہذیب کو دنیا میں متعارف کرایا اور ہندوستان دنیا کی پہچان بنا۔ قدیم ہندوستانی تاریخ میں میگیس تھنیز، فاہیان اور ہیون سانگ کا جو مقام و مرتبہ ہے وہی مرتبہ عرب سیاحوں، جغرافیہ نویسوں اور تاریخ نگاروں کا ہے جنہوں نے تقریباً ساتویں صدی عیسوی سے لے کر پندرہویں صدی عیسوی تک ہندوستان کی بندرگاہوں کا رخ کیا۔ اس زمانہ میں بندرگاہیں جنوبی ہند، گجرات، سندھ، بلوچستان، مالابار، سرندیپ،، کولم (ٹرنکور) وغیرہ میں

تھیں جہاں انہوں نے مستقل سکونت اختیار کرلی، تجارت کے ساتھ ساتھ یہاں کی تہذیب و تمدن کا گہرا مشاہدہ کیااور تحریریں ضبط کرنا شروع کیا۔ان سیاحوں میں کچھ ایسے ہیں جنہوں نے سن کر حالات لکھے، کچھ ایسے بھی ہیں جنہوں نے رختِ سفر باندھااور حالات قلم بند کیے ان میں سے کچھ کے مشاہدات تاریخ نویسی کی معروضیت پر پورے اترتے ہیں،

ان میں ابن خرداذبہ (ابوالقاسم عبید اللہ بن عبد اللہ بن خرداذبہ (۸۲۰ھ/۹۱۳ء) خراسانی فارسی الاصل مورخ ہیں، یہ بذات خود ہندوستان نہیں آئے لیکن ہندوستان سے واپس آئے ہوئے سیاحوں سے معلومات اکٹھا کیں اور اس کو اپنی کتاب المسالک والممالک میں درج کیا۔وہ بتاتے ہیں کہ کونسی سی چیز کہاں پیدا ہوتی ہے اور کس ملک کو بھیجی جاتی ہے، لوگوں کا رہن سہن کیسا ہے، ان کی عبادت کا طریقہ کیا ہے، بغداد سے مختلف ملکوں کی آمد و رفت کے راستوں اور مسافتوں کے علاوہ تاریخی معلومات برّی و بحری مسافتوں اور مختلف ذاتوں کے علاوہ عود، صندل، کالی مرچ کافور، ناریل، تلواریں، کپڑے، ہاتھی کے دانت، سوتی کپڑے، تاڑی، بانس اور بید کی لکڑی کا ذکر کیا ہے۔

ہندوستانی حالات کا مشاہدہ کرکے اس کو قلم بند کرنے والا عرب سیاح سلیمان تاجر (۸۵۱ء) ہے جس نے تیسری صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں عراق کی بندرگاہ سے آرمینیا، ایشیا، افریقہ، سوڈان، چین، تبت اور ہندوستان کے تمام سواحل کا سفر کیااور ان علاقوں کی معلومات کو اپنی کتاب سلسلۃ التواریخ میں درج کیا ہے، ہندو معاشرہ، مذہبی رسم و رواج، معاشی و سماجی حالات کے علاوہ راجاؤں کے بعض تعذیری قوانین (جرم و سزا سے متعلق) کا ذکر کیا ہے۔

عرب سیاحوں، جغرافیہ نویسوں نے تاریخی حیثیت سے بھرپور فائدہ اٹھایااور انہوں نے تاریخ نویسی کو آگے بڑھایا جن کی تحریریں تحقیق پر کام کرنے والوں کے لیے مشعلِ راہ ہیں، ان میں جاحظ (۲۵۵ھ/۸۶۴ء) ابوزید حسن سیرافی (تیسری صدی ہجری) ابن فقہ ہمدانی (تیسری صدی ہجری) بزرگ بن شہریار (ایرانی جہازراں تیسری صدی ہجری) مسعودی، مظہر بن طاہر مقدسی (دسویں صدی عیسوی/تیسری صدی ہجری) اصطخری (۹۵۱ء) ابن حوقل (۳۷) (م ۹۷۷ء) بشاری مقدسی (م ۳۸۰ھ/۹۹۰ء) ابن ندیم (۳۸) (م ۳۹۰ھ/۱۰۰۰ء) عبد القاہر بغدادی (م ۴۲۹ھ/۱۰۳۸ء) قاضی صاعد اندلسی (م ۴۶۲ھ/۱۰۶۹ء) شریف ادریسی (۳۹) (۴۹۳ھ ج/۱۱۰۰ء تا ۵۰۶ھ/۱۱۶۵ء) ابن ابی اصیبعہ (م ۶۶۱ھ/۱۲۹۶ء) ابوریحان البیرونی (۹۷۳ء ۱۰۴۸ء)

ابوالریحان محمد ابن احمد البیرونی جسے طبعی اور ریاضیاتی علوم کی اقلیم میں مسلمانوں کا اچھوتا اور گہرائی و گیرائی رکھنے والا مفکر مانا جاتا ہے، ان کا خیال ہے کہ کرۂ ارض اپنے محور پر گھومتی ہے وہ عرض البلد اور طول البلد کا تعین بالکل درست کرتے ہیں، ان کی کتاب میں جہاں جیومٹری (علم الہیئت) ریاضی، فلکیات اور علم النجوم کا ذکر ملتا ہے وہیں ہندوستان میں رہنے والے لوگوں کے رہن سہن کی تفصیل بھی ملتی ہے، وہ ہندو فلسفہ اور تہذیب سے بہت متأثر نظر آتے ہیں، اس سے قبل سیاحوں نے لکھتے وقت جن باتوں کو نظر انداز کیا تھا البیرونی نے تمام باتیں بیان کی ہیں۔ابویحیی عماد الدین القزوینی ایرانی نزاد ہیں، ان کی کتاب عجائب المخلوقات و غرائب الموجودات ہے جس میں ہندوستان کے مختلف علاقوں کے رسم و رواج اور شادی بیاہ کی تفصیلات درج ہیں۔

ابن بطوطہ (محمد بن عبد اللہ ابراہیم بن یوسف کنیت ابو عبد اللہ شرف الدین (پیدائش ۱۳۰۳ء/۷۰۳ھ ——وفات ۷۷۹ھ —— ۱۳۷۷ء) سلطان محمد بن تغلق کے عہد میں مراکش سے ہندوستان پہنچے اور اکثر و بیشتر علاقے دیکھے، قاضی کے عہدے پر فائز ہوئے، ان کی کتاب الرحلۃ ابن بطوطہ کے نام سے مشہور ہوئی، انہوں نے اس کتاب میں ہندوستان کے جغرافیائی، تمدنی، معاشرتی اور مذہبی حالات کے علاوہ قوموں، جماعتوں، حیوانات و نباتات سے متعلق اپنے مشاہدات اور تجربات کو یکجا کیا ہے جو اس عہد کے ہندوستان کی تاریخی اہمیت کو سمجھنے کے لیے انتہائی ناگزیر ہے۔

مذکورہ بالا تمام سیاحوں، جغرافیہ دانوں کی تصانیف کا مطالعہ کیا جائے تو ان کی تاریخ نویسی کے ذریعہ ہندوستان کی تہذیب و تمدن کے ہر گوشے پر روشنی پڑتی ہے اگرچہ ان سیاحوں اور واقع نگاروں کی تحریریں کہیں کہیں ایک دوسرے کی نفی اور اثبات کرتی ہوئی نظر آتی ہیں، لیکن زیادہ تر انہوں نے ایک دوسرے سے فائدہ اٹھایا ہے، ان کی تحریریں پیچ نامہ سے کہیں میل کھاتی ہیں، تو کہیں یکسر مختلف ہیں، یہ تمام تحریریں ضبطِ تحریر میں لانے والے مختلف ممالک سے تعلق رکھتے ہیں، جن میں افریقہ، ایشیاء شامل ہیں، لیکن قدرے مشترک ان کی مادری زبان عربی و فارسی ہی ہے۔

5.9 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

آپ نے اس سبق میں پڑھا کہ عربوں میں تاریخ نویسی کا باقاعدہ شعور اس وقت پیدا ہوا، جب قرآن کریم نازل ہونا شروع ہوا بلاشبہ اس احساس کی شروعات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے۔ تاریخ کی ابتدا وہ وحی ہے جس نے علم کا درس دیا''، قلم سے لکھنا سکھایا اور انسان کو وہ کچھ سکھایا جس سے وہ آشنا نہ تھا۔ قرآن جس کا تدریجی نزول ۲۳ سال کے طویل عرصے پر محیط ہے، گذشتہ قوموں کے عروج و زوال کی داستان کے ساتھ سرکش قوموں کے دردناک انجام اور نیک اور صالح لوگوں کو انعام و اکرام سے نوازے جانے کو مدلل مفصل دلنشیں پیرائے میں فصاحت و بلاغت سے بھرپور زبان میں بیان کرتا ہے۔ احادیث کی تدوین، جرح و تعدیل اور سیرت و مغازی کی تصنیفات نے عربی تاریخ نویسی کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ علاوہ ازیں ان عرب سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں کا بھی اہم رول رہا ہے جو یا تو بذاتِ خود ہندوستان آئے اور اپنے ذاتی مشاہدات و لم بند کیے۔ یا پھر یہاں آنے والے زائرین کی چشم دید روایتوں کو قلم بند کیا۔

تاریخ نویسی کو قرآن کے بعد حدیث سے تقویت ملی، سیرت و مغازی کی تدوین میں فن حدیث سے تقویت ملی، اور فنّ حدیث کے پہلو بہ پہلو ترقی کی، ابتداء میں سیرت و مغازی کے مؤلفین بھی حدیث جمع کرتے تھے، انھیں بھی محدث کہا جاتا تھا، بعد میں یہ فن الگ ہو گیا اور سیرت و مغازی کو صحابہ اور تابعین نے علیحدہ موضوع بنایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول و فعل، گفتگو و عمل حدیث کہلاتی ہیں۔

5.10 کلیدی الفاظ (Keywords)

نسب جمع انساب : خاندان

علم الانساب	:	نسب ناموں کا علم
لسانیات	:	زبانوں کا علم
غزوہ	:	جنگیں، خاص طور پر وہ جنگیں جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم شریک رہے۔
سند جمع اسناد	:	تصدیق روایت
سیرت جمع سیر	:	احوال و کوائف
عمرانیات	:	انسانی معاشرے کا علم، لوگوں کے رہن سہن کے اصولوں کا علم
قرآن	:	تمام کائنات کے لیے کتاب ہدایت جو پیغمبر محمد پر نازل کی گئی
حدیث	:	پیغمبرِ اسلام کے اقوال، افعال اور اعمال
قاضی	:	جج

5.11 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

5.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. عرب سے کون لوگ مراد ہیں؟
2. اسلام سے پہلے کا زمانہ زمانۂ جاہلیت کہلاتا ہے، وضاحت کیجیے۔
3. اشعار ہی عربوں کی تاریخ ہے 'الشعرُ دیوان العرب' کا کیا مطلب ہے۔
4. عربوں میں تاریخ نویسی کا احساس کب ہوا اور اس کی شروعات کس سے ہوئی؟
5. قرآن مجید عربی زبان میں سب سے پہلی مدوّن کتاب ہے، جس سے تاریخ نویسی کی بنیاد پڑی، روشنی ڈالیے۔
6. اسماء الرجال کسے کہتے ہیں، مختصر نوٹ لکھیے۔
7. جرح و تعدیل (چھان پھٹک) کسے کہتے ہیں، وضاحت کیجیے۔
8. حدیث اور مغازی کا فرق بتائیں۔
9. مال غنیمت، وظائف اور مقبوضہ زمین پر لگان کا رجسٹر ریکارڈ لکھنے کا رواج کس نے شروع کیا؟
10. سیرت اور مغازی کے فرق پر ایک نوٹ لکھیے۔

5.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. مغازی پر پہلا کام ابن شہاب زہری نے کیا، ایک مختصر نوٹ لکھیے۔
2. زہری کے بعد ان کے شاگرد (ابن اسحاق) نے اس فن کو کیسے آگے بڑھایا۔ ذکر کیجیے۔

3. عمرالواقدی نے مغازی اور فن حدیث کو الگ الگ موضوع بنایا۔
4. اس طرح دو فن ہو گئے۔ دونوں کے درمیان فرق کو واضح کرتے ہوئے واقدی کی کتاب المغازی کا جائزہ لیجیے۔
5. واقدی کے بعد بلاذری نے اس فن کو وسعت دی۔ وضاحت کریں

5.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. عربی تاریخ نویسی میں قرآنی تعلیمات کی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔
2. عربی تاریخ نویسی میں سیرت و مغازی کے کردار کا تفصیل سے جائزہ لیں۔
3. عربی تاریخ نویسی کے فروغ میں عرب سیاحوں اور ان کی اہم تصنیفات پر روشنی ڈالیں؟

5.12 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. تاریخ ادب عربی. حسن زیات ترجمہ عبدالرحمان سورتی، مطبوعہ البلاغ پبلی کیشن نئی دہلی ۲۰۱۵ء
2. پروفیسر محب الحسن: ہندوستانی دورِ وسطی کے مورخین، مطبوعہ، قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی ۲۰۰۴ء
3. فلپ. کے. ہتّی.:—تاریخ عرب ص ۳۱۵
4. تاریخ ادب عربی، حسن زیات، مطبوعہ البلاغ پبلی کیشن نئی دہلی ۲۵، ۲۰۱۵
5. مولانا امین احسن اصلاحی—تدبر قرآن جلد اول، ص ۳۹ مطبوعہ نئی دہلی ۲۱۷ء
6. معین الدین احمد ندوی:—ہندوستان عربوں کی نظر میں، ص ۲۳۱ تا ۳۳۷، دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۶۱ء

اکائی 6۔ فارسی تاریخ نویسی

(Persian Traditions)

اکائی کے اجزا

6.0		تمہید
6.1		مقاصد
6.2		ہندوستان میں فارسی تاریخ نویسی کا آغاز
	6.2.1	امیر خسرو اور ضیاءالدین برنی
	6.2.2	یحیٰی بن احمد سرہندی اور شمس سراج عفیف
	6.2.3	خواجہ عبدالملک عصامی
6.4		مغل عہد میں فارسی تاریخ نویسی
	6.4.1	حیدر دوغلت اور ابوالفضل
	6.4.2	احمد ٹھٹھوی اور جعفر بیگ آصف خاں
	6.4.3	نظام الدین احمد اور عبدالقادر بدایونی
	6.4.4	محمد قاسم ہندو شاہ استر آبادی
	6.4.5	عبدالحمید لاہوری اور مرزا محمد کاظم
	6.4.6	محمد صالح کنبوہ اور محمد ہاشم خافی خان
	6.4.7	عاقل خاں رازی اور مرزا محمد حسن
	6.4.8	بھیم سین، ایشور داس اور سجان رائے
6.5		اکتسابی نتائج
6.6		کلیدی الفاظ
6.7		نمونہ امتحانی سوالات
	6.7.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات

6.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
6.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
6.8 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

6.0 تمہید (Introduction)

چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی سے فارسی زبان کی اہمیت اور اس کے احیاء کی کوششیں شروع ہوئیں۔اس کا آغاز فارسی زبان میں لکھے سفر ناموں سے ہوا۔ابوریحان البیرونی (۹۷۳ء/۱۰۴۸ء) نے ہندوستانی سماج کا مطالعہ کیا، یہاں کے ادبی اور نیم ادبی مآخذوں سے استفادہ کیا۔اس نے سنسکرت کے ادبی حوالوں سے علمِ نجوم، تاریخ، جغرافیہ اور علم فلکیات کا مطالعہ کیا اور دنیا کو ہندوستانی تہذیب و تمدن سے آشنا کیا۔اس سے قبل عبداللہ ابن مقفّع نے سنسکرت کی کہانیوں کو عربی زبان میں ترجمہ کیا اور ہندوستانی رسم و رواج، معاشی حالات، رہن سہن عادات و اطوار کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔رفتہ رفتہ عربی و فارسی زبان کی تاریخ نویسی میں تبدیلی آنا شروع ہوئی۔ایرانی ترکی ثقافت کے فروغ سے ادبی زبان کی حیثیت سے عربی کی جگہ فارسی لے رہی تھی۔فارسی بولنے والوں کی ہندوستان آمد سے یہاں فارسی کا چلن شروع ہوا۔فارسی تاریخ نویسی میں اضافہ ہوا۔تاہم فارسی کے ساتھ عربی زبان میں بھی تاریخ نویسی چلتی رہی۔جنوبی ایشیا میں دہلی سلطنت کا قیام ایسی عمدہ کتابوں کی تصنیف کا محرک بنا جس کی بنیاد منہاج سراج کی طبقاتِ ناصری اور علاؤالدین عطاء ملک جوینی (م ۶۸۱ھ/۱۲۸۳ء) کی تاریخ جہاں کشا پر مبنی تھی۔سیاسی تاریخ نویسی کا زیادہ تر کام سرکاری دانشوروں اور درباری قلم کاروں کے ذریعہ کیا گیا۔طرز تحریر کی اس تبدیلی سے تاریخ نویسی کے اسلوب تحریر اور مضمون نگاری پر کافی گہرا اثر پڑا۔سرکاری منشیوں اور کاتبوں کے لیے یہ آسان تھا کہ وہ وقائع نگاری کیجیے۔ان کی معلومات کا ذریعہ سرکاری دستاویزات اور امرا کے آپسی اور ذاتی تعلقات تھے۔تفصیلی اسناد کے بجائے مختصر مآخذوں کے ذکر کا رجحان بڑھا۔بعد کے تاریخ نگاروں نے تو اکثر و بیشتر سندوں کا ذکر چھوڑ دیا۔ان کی تاریخ نویسی میں ان کی طبقاتی، تمدنی، سیاسی اور مذہبی تعصب اور تنگ نظری نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔لیکن رشید الدین فضل اللہ (م ۷۱۸ھ/۱۳۱۸ء) کی تصنیف جامع التواریخ فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں لکھی گئی اس کا پہلا حصہ شاہی خاندان کی تاریخ پر مشتمل ہے جو زیادہ تر منگول روایات پر مبنی ہے، بعد میں الجائتو کے عہد کی تاریخ سے اس کو مکمل کیا گیا۔دوسرا حصّہ عرب تاریخ نویسی سے مربوط ہے کیونکہ اس میں ہندوستان، چین اور یورپ کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔یہ دیگر کتابوں سے مختلف ہے کیوں کہ اس کا مواد ہم عصر راویوں سے اخذ کیا گیا ہے۔تاریخ نویسی کا یہ تخیل خوب تھا۔

دلّی سلطنت کے مورخین پر فارسی روایات کی چھاپ دکھائی دیتی ہے۔عرب تاریخ نویسوں نے اپنے گرد و پیش کے حالات، سماجی واقعات، معاشی تبدیلیوں کو تاریخ میں جگہ دی جب کہ فارسی تاریخ نویسوں کی تاریخ نویسی زیادہ تر دربار سے متعلق ہوتی، یا وہ شاہی سرپرستی کے طلب گار ہوتے، انھیں افراد کے ارد گرد یہ تاریخی کتابیں گھومتی نظر آتی ہیں، امیر خسرو، عصامی، برنی، عفیف، یحیٰ سرہندی کی تاریخ نویسی امراء و سلاطین، شہزادوں اور حکمرانوں کی تاریخ تھی، عوام کی تاریخ، ان کے رہن سہن، سماجی و معاشی حالات کا ذکر نہیں ملتا۔ان مورخین نے

تاریخ کو مذہب کا مقصد حاصل کرنے اور عظمتِ اسلام کے تفوق و برتری کے لیے استعمال کیا ہے۔ بقول برنی تاریخ انبیاء، خلفاء، سلاطین وامراء، حکومت اور مذہب کے دوسرے بڑے لوگوں کے واقعات اور روایات کا علم ہے اگر وہ کمتر یا نااہل لوگوں کے کام بیان کرنے لگے تو اس کی اہمیت وافادیت ختم ہو جاتی ہے، ایسے اشخاص کو عام طور پر علم کا ذوق نہیں ہوتا اور اس کے مطالعے سے انھیں کوئی فائدہ پہونچنے والا نہیں ہے۔ خدا کے حکم سے ہونے والی تاریخ انسانی فعل نہیں بلکہ ایک ایسا عمل ہے جس میں صرف انسان معمولی کارکنوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

6.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ

- طلبا فارسی تاریخ نویسی کے آغاز وارتقا کو جان سکیں گے۔
- فارسی مورخین کی تصنیفات سے واقف ہو سکیں گے۔
- عہدِ سلطنت کی اہم فارسی تاریخی ماٰخذ کا جائزہ لے سکیں گے۔
- اہم فارسی مورخین اور ان کی تحریروں کا تجزیہ کر سکیں گے۔

6.2 ہندوستان میں فارسی تاریخ نویسی کا آغاز وارتقا

(Origin and Development of Persian Historiography in India)

ہندوستان ترکوں کی آمد اور دہلی سلاطین کی حکومتیں قائم ہونے کی وجہ سے ہندوستان میں عربی و فارسی تاریخ نویسی کی ابتدا ہوئی اس کا سلسلہ بعد کی صدیوں تک ہندی فارسی تاریخ نویسی میں چلتا رہا جس میں بیانیہ اسلوب اور روایتی طرز غالب تھا۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی تاریخ یمنی یا عتبی (عربی) میں ملتی ہے، جس کا لکھنے والا ابو نصر محمد بن الجبار العتبی (۴۱۱ھ/۱۰۲۰ء) ہے اس کے خاندان کے افراد فرمانروا ؤں کے ماتحت اہم عہدوں پر تھے، سلطان محمود کا معتمد ہونے کی وجہ سے وہ سیاسی سرگرمیوں سے واقف تھا۔ اس کی کتاب میں سلاطین غزنویہ سبکتگین کے پورے حالات درج ہیں اور سلطان محمود کے حالات ۴۰۹ھ/۱۰۱۸ء تک ملتے ہیں جو اُن مہمات کے لیے اصل ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے، تاہم اس میں جغرافیائی معلومات بہت کم ہے، وہ اپنی کتاب میں قرآنی آیات سے مثالیں دیتا ہے تاکہ محمود کی فوجی مہموں اور کاروائیوں کو اس پس منظر میں پیش کیا جا سکے۔ غزنویوں کی مکمل اور جامع تاریخ ابو الفضل بیہقی (۹۹۶ھ۔۱۰۷۷ء) نے کئی جلدوں میں مرتب کی جس میں اس نے اپنے تجربات، مشاہدات، تعلقات اور اپنے زمانے کے امراء و سلاطین کے حالات کا بڑی وضاحت سے ذکر کیا ہے، شہنشاہ مسعود بن سعود کی عادات واطوار، مشاغل، شراب نوشی اور شراب چھوڑنے کی قسم کھانا، شراب کے پیالے کو دریائے جہلم میں پھکوانا، وغیرہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے، اس کی کتاب سے دربار، اس کی کارروائی کا طریقہ، شریک ہونے والے افراد اور غزنی کی مجلس میں زیر بحث موضوعات کا پتہ چلتا ہے۔

6.2.1 حسن نظامی اور منہاج سراج (Hasan Nizami and Minaj Siraj)

ہند فارسی تاریخ نویسی سے مربوط طرز بیان تاریخ فخر مدبر جسے Sir Edward Denison Ross نے اس میں سے تاریخی حصہ الگ کر کے تاریخ فخر الدین مبارک شاہ کے نام سے الگ تدوین کی ہے اور تاج المآثر کے مصنف تاج الدین حسن نظامی متوفی (۱۵۔۶۱۴ھ۔۱۲۲۷ء) کے یہاں ابتدائی زمانہ کی تاریخ میں ملتا ہے، جس کو خراسان کے سیاسی ہنگاموں کی وجہ سے اپنا وطن سمرقند چھوڑ کر دہلی آنا پڑا، اس کی تحریر سے شدّتِ محرومی کا احساس ہوتا ہے وہ صاحبِ علم و فضل تھا اور علماء و فضلاء سے اس کے تعلقات تھے، وہ سماج میں اعلی حیثیت کا مالک تھا، اس نے اپنی کتاب کی شروعات (۶۰۲ھ/۱۲۰۵ء) اپنے دوستوں کی فرمائش اور شاہی حکم کو پورا کرنے کے لیے کی تھی، تاکہ وہ واقعات و مہمات کو قلم بند کر سکے، چنانچہ اس نے جزوی طور پر محمد غوری (م ۱۲۰۶ء) قطب الدین ایبک ۱۲۰۶ء تا ۱۲۱۰ء اور ایلتتمش ۱۲۱۰ء ۱۲۳۶ء کی تاریخ لکھی، ان کی کتاب تشبیہات و استعارات سے پُر ہے، اس نے نظم و نثر میں اپنے علم کا مظاہرہ کیا ہے، لیکن اس کی کتاب کے مطالعہ سے یہ تاثر نہیں ملتا کہ وہ بذاتِ خود کسی مہم یا کسی فرمانروا کے کارناموں میں شریک رہا ہو، یا بذاتِ خود مشاہدہ کیا ہو۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ترائن کی پہلی جنگ میں محمد غوری کی ہار کا ذکر بالکل ہی نہیں کرتا، لیکن دوسری جنگ میں جیت کا ذکر کرتا ہوا نظر آتا ہے، وہ لکھتا ہے کہ ابتدائی مسلم فاتح اچھے مسلمان اور حامیٔ مذہب تھے اور جنگ و فتح، انتظام و انصرام سے متعلق ان کی رائے، یا ارادے سیاسی یا معاشی نہیں بلکہ مذہبی تھے۔ وہ دراصل اس کتاب کو عربی میں لکھنا چاہتا تھا مگر حالات زمانہ نے اسے فارسی میں لکھنے پر مجبور کر دیا۔

دہلی سلطنت کے قیام (۱۲۰۶ء تا ۱۵۲۶) سے ہی ان مورخین کی تاریخ نویسی اور کارناموں کو پرکھنے کے لیے کئی باتوں پر نظر رکھنی ہوگی، ان باتوں میں تاریخ کی نوعیت، مورخین کا عام رویّہ، ان کا اسلوبِ بیان، خاندانی پس منظر، تعلیم و تربیت، سرکاری تعلقات خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان سے مورخ کے رویّے اور نظریے کو سمجھنے میں مدد ملے گی اس طرح سے اس کی داخلیت یا معروضیت معلوم ہوگی۔ اس سلسلے کا پہلا قدم طبقاتِ ناصری میں ہم کو دیکھنے ملتا ہے، اس کتاب کا لکھنے والا منہاج الدین سراج معروف بہ قاضی منہاج سراج (۱۲۵۹) مملوک خاندان کی سرپرستی میں مختلف اہم عہدوں پر فائز رہا اور دور دراز کے علاقوں میں تعیناتی کے مواقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی کتاب طبقات میں بہت سی معلومات درج کیں، اس نے اپنے سرپرست ناصر الدین پوتا شمس الدین ایلتتمش کی تعظیم میں اپنی کتاب کا نام اس کے نام پر رکھا اور تحریر کرتے وقت بہت ہی تعریف و توصیف کے پل باندھے اور خوب دعائیں دی ہیں، یہ کتاب بائیس مختلف طبقات پر منقسم ہے، قاضی منہاج سراج غیاث الدین بلبن (۱۲۶۶ء تا ۱۲۸۷ء) کے زیر سرپرستی رہا، چنانچہ اس نے اس کے حالات بہت ہی تفصیل سے لکھے ہیں، تاتاری حملے کے بعد وسط ایشیا کے لوگوں پر جو قیامت آئی، اس کی سرگزشت ایسی ہے جو کسی دوسرے ماخذ میں نہیں ملتی، یہ کتاب اس نے ۶۵۸ھ/۱۲۵۹ء میں مکمل کی، علمی نقطہ نظر سے اس نے معلومات بہتر اور معتبر ذرائع سے لی ہیں اور اپنی اسناد کا حوالہ بھی دیا ہے، مورخین کا خیال ہے کہ وہ شاذ و نادر ہی مبالغہ آرائی اور بے جا توصیف کرتا ہے، وہ حقائق کو ہو بہو بیان کرتا ہے جس سے اس کے بیانات کی سچائی اور علم کی وسعت پر اعتماد روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتا ہے۔

6.2.2 امیر خسرو اور ضیاءالدین برنی (Amir Khusrau and Ziauddin Barani)

امیر خسرو (۱۲۵۱تا۱۳۲۵) کا شمار طبقۂ اُمراء میں ہوتا تھا چونکہ ان کے والد التتمش کے عہد میں ایک امیر تھے۔ ان کی والدہ عماد الملک (جو بلبن کے عہد میں اعلی عہدے پر تھے) کی بیٹی تھیں، جس کی وجہ سے امیر خسرو نے دہلی کے درباری حلقوں میں اہم مقام پالیا تھا، انہوں نے دہلی کے تقریباً چھ سلاطین کے ماتحت ملازمت کی تھی جس کی وجہ سے انھیں اس دور کے صحیح حقائق اور سماجی تعلقات کا مشاہدہ کرنے کا موقع ہاتھ آگیا اور اس موقع سے انہوں نے خوب فائدہ اٹھایا، ان کی تاریخی کتابیں تقریباً ۳۶ برسوں (۱۲۸۹ء تا ۱۳۲۵ء) کا احاطہ کرتی ہیں، ان کی کچھ کتابیں شہزادوں اور سلطانوں کی فرمائش پر لکھی گئیں، بعض انعام واکرام یا ادبی شہرت کے لیے موقع بہ موقع حیطۂ تحریر میں آئیں اس لیے موصوف تاریخ نویسی میں کم اور مدح سرائی میں زیادہ نظر آتے ہیں، تاہم ان کی کچھ کتابیں تاریخی مواد بھی فراہم کرتی ہیں، شاعری میں قران السعدین (دو ستاروں کا ملن ۱۲۸۹) کئی طویل بیانیہ نظموں پر مشتمل ہے جس میں وہ سوال وجواب شامل ہے جو باپ (بغرا خاں حاکم لکھنوتی) اور بیٹے (سلطان معزالدین کیقباد) کے درمیان ہوئے۔ خزائن الفتوح یا تاریخ علائی میں امیر خسرو نے علاؤالدین کے ابتدائی سولہ برسوں کی معتبر اور مستند تاریخ نویسی کی ہے، جس میں ادبی مہارت، تشبیہات، استعارے، شاعرانہ شوخی، وسیاسی موقع پرستی اور ہر ہندوستانی چیز سے انسیت ومحبت کا ذکر ملتا ہے، قرآنِ کریم کی آیات مثالوں کے لیے کثرت سے استعمال ہوئی ہیں، وہ علاؤالدین خلجی کی فوجی مہمات بیان کرتے وقت وہ کارنامے بھی بیان کرتے ہیں جن کا تعلق استحکام سلطنت، نظم وضبط اور انصرام سلطنت سے ہوتا ہے جس کو عوام الناس کی فلاح وبہبود کے لیے اٹھایا گیا ہو، لیکن امیر خسرو نے علاؤالدین خلجی کی اس دھوکہ بازی کو نہیں بیان کیا ہے جو اس نے حصولِ تخت کے لیے اپنے چچا سے غداری کی تھی اور ان کو دھوکے سے قتل کرکے خود سلطان بن گیا تھا۔ افضل الفوائد میں نظام الدین اولیاءؒ کے اخلاقی کردار کا ذکر اور ان سے امیر خسرو کے تعلقات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اپنی نظم تغلق نامہ میں خسرو نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ غیاث الدین تغلق نے کس طرح دلّی پر قبضہ کیا اور سلطان بذاتِ خود نیکیوں کا مجموعہ ہے اور اس نے کس طرح اسلام کی خاطر باطل قوتوں سے لڑائی کی جس کی نمائندگی خسرو خاں (باطل کا سرچشمہ) کررہا تھا۔ امیر خسرو نے بعض مقامات، واقعات اور شہادتوں پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے اور ان کو ثبوت کے طور پر استعمال کیا ہے، لیکن وہ اپنے ذرائع معلومات ظاہر نہیں کرتے۔ بہت سی جگہوں پر وہ اخلاقی اور مذہبی زبان استعمال کرتے ہیں اور معاملات کو حکمِ خداوندی پر محمول کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

تاریخ فیروز شاہی (Tarikh e Firoz Shahi)

برنی ایک ایسی تاریخ لکھنا چاہتا تھا جو حضرتِ آدم سے شروع ہوتی اور اس کے زمانے تک کا احاطہ کرتی لیکن ارادہ بدلا اور تاریخ فیروز شاہی لکھی جسے اس نے فیروز شاہ تغلق کے نام منسوب کیا۔ یہ کتاب بلبن کے سالِ جلوس (۶۶۸ھ/۱۲۶۶ء) سے اس کی دورِ حکومت تک (۱۲۸۷ء) نیز فیروز شاہ تغلق کے چھٹے سالِ حکومت تک کے حالات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس کتاب پر ایک عالمانہ مقدمہ دو مقاصد کی تکمیل کے لیے تھا۔ ایک خدا کی نذر تاکہ اس کے گناہ معاف ہوں، دوسرے سلطان کی نذر تاکہ اس کی سرپرستی حاصل ہو اور اسے تنگ دستی سے نجات ملے۔ اس کی کتاب میں کل آٹھ بادشاہوں کا تذکرہ ملتا ہے، یہ تذکرہ اس جگہ سے شروع ہوتا ہے جہاں منہاج سراج نے تقریباً اپنی تاریخ

ختم کی تاکہ لوگ معمولی مدت کے بعد ملک کے حالات وواقعات پڑھ سکیں اور اس کی معلومات سے فائدہ اٹھا سکیں۔ برنی نے منہاج سراج کی تنقیدی انداز کی پیروی نہیں کی بلکہ اسناد کا لحاظ کیے بغیر ہر ایک کے حالات وواقعات کو قصّہ گوئی کے انداز میں بیان کیا اور نتائج کو اچھے یا برے اعمال کی کسوٹی پر پرکھا، یعنی سلطان کی کامیابی وناکامی ان کے مذہبی وسیاسی نظریات کی پابندی یا عدم پابندی پر ہے جو برنی نے پیش کیے ہیں، مثال کے طور پر سلطان علاؤالدین خلجی کو اس اعتبار سے کامیاب حکمراں مانا جائے کہ اس نے ہندوؤں کو مطیع کیا، فتنہ وفساد پر قابو پایا، شراب پر پابندی لگائی اور اشیاء کے بھاؤ کو متعین کر کے معاشی حالات کو بہتر بنایا، اس سب کے باوجود علاؤالدین نہ ہی مذہبی تھا اور نہ ہی دین دار کیونکہ اس نے بقول برنی ادنی اور کم تر لوگوں کو ملازم رکھا تھا اور دین داروں کی صحبت سے بھی گریز کرتا تھا، برنی کے بقول اگر اس کا عہد روزِ روشن کی مانند تاباں رہا تو صرف اور صرف حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی فیوض وبرکات سے رہا۔ برنی خود اعتراف کرتا ہے کہ اس کتاب میں کچھ واقعات سنے ہوئے ہیں، کچھ ذاتی مشاہدات پر مبنی ہیں، بلبن کے بارے میں اپنے والد، دادا اور بلبن کے ماتحت افسروں سے معلومات حاصل کیں، کیقباد کے عہد میں اپنے والد اور اساتذہ سے معلومات نیز اپنے مشاہدات پر اضافے کیے جلال الدین فیروز خلجی کے دورِ حکومت کے واقعات ومعاملات اس کی کتاب کے اختتام تک، خود اس کی نظر سے گزرے ہیں۔

6.2.3 یحیٰ بن احمد سرہندی اور شمس سراج عفیف

(Yahya Bin Ahmad Sarhindi and Shams Siraj Afif)

تاریخ مبارک شاہی (Tarikh e Mubarak Shahi)

یحیٰ بن احمد بن عبداللہ سرہندی (وفات ۷۰۸ھ/۱۳۹۹ء) نے اِس کتاب کو تاریخ مبارک شاہی کے نام سے لکھا ہے کتاب کی ابتداء میں وہ لکھتا ہے کہ ابوالفتح مبارک شاہ کی تخت نشینی کے موقع پر وہ تحفہ میں اس کتاب کو دینا چاہتا تھا۔ اس نے دہلی سلاطین کے واقعات منہاج سراج، برنی اور امیر خسرو سے جو اس کے پیشرو تھے جمع کر لیے ہیں اور فیروز تغلق کے سالِ جلوس ۱۳۵۱ء سے ۱۴۲۵ء تک کے واقعات ثقہ روایات اور عینی مشاہدات کی بنا پر قلم بند کیے ہیں، اس نے امیروں سپاہیوں کے کام ادوارِ حکومت کے اعتبار سے سلسلہ وار تاریخ اور ترتیب یعنی تخت نشینی، تقرر، فوجی مہمات بغاوتوں کو علی الترتیب تحریر کیا ہے اور لوگوں کی شہادتوں اور گواہیوں پر بھروسہ کیا ہے۔ اس کی کتاب در حقیقت ایک علاقائی روزنامچہ تھی۔ وہ تاریخ کو فوجی اور سیاسی واقعات کا مجموعہ بنا دیتا ہے اور وہ تاریخ نویسی کو داخلیت پر محمول کرتا ہے گویا سب کچھ خدا کی مرضی سے ہوا، وہ ہر دور کی تاریخ اس جملے پر ختم کرتا ہے کہ اصل حقیقت خدا ہی جانتا ہے، محمد غوری کے زمانے سے ہندستان میں بدلتی ہوئی اسلامی تصویر کو تقدیر اور خدا کی مرضی پر منحصر کرتا ہے اور محمد بن تغلق کی دشواریوں کا تجزیہ کرتے ہوئے انسانی افعال اور فیصلوں سے منسوب کرتا ہے۔

تاریخ فیروز شاہی (Tarikh e Firoz Shahi)

شمس سراج عفیف (۱۳۴۲ء تا ۱۳۹۹ء) نے اپنی کتاب میں دلّی سلطنت کے تین فرمانرواؤں (غیاث الدین تغلق، محمد بن تغلق اور

فیروز شاہ تغلق) کی خوبیوں، خامیوں اور تیمور کے ہاتھوں دلّی کی تباہی کا ذکر کیا ہے، وہ برنی، عصامی کی طرح شکستِ آرزو یا صلاحیت کی ناقدری کے احساس کا ذکر نہیں کرتا بلکہ اخلاقی قدروں کی پامالی پر آزردہ ہے اور اس کی اصلاح چاہتا ہے اور یہ بھی چاہتا ہے کہ لوگ اس پر عمل کریں، اس نے واقعات کو اسناد کی مدد اور معتبر لوگوں کی گواہیوں کی بنیاد پر جانچا، پرکھا اور قابلِ قبول جانا، نزاعی اور مختلف فیہ معاملات پر فیصلہ کرنے کے لیے دلائل و ثبوت نہیں پیش کیے بلکہ تاریخی حقائق کی تصدیق کے لیے آخری معیار مذہب اور خدا کو مانا، وہ تاریخ میں غیر تاریخی حقائق کی مدد سے فہم و بصیرت تلاش کرتا ہے اور اس کی متلاشی (ڈھونڈتی) نگاہیں اس پوشیدہ نظام کی طرف جاتی ہیں جسے خدا نے تخلیق کیا ہے، برنی کی طرح وہ بھی تاریخ سے جذباتی لگاؤ رکھتا ہے اور تاریخ کے فوائد کا بھی ذکر کرتا ہے۔ لیکن تاریخ فیروز شاہی کے پہلے ایڈیشن میں جو فیروز شاہ کے چار سال پر محیط ہے، محمد بن تغلق کے بارے میں اچھی رائے رکھتا ہے۔

6.2.4 خواجہ عبدالملک عصامی (Khwaja Abdul Malik Isami)

فتوح السلاطین (Futuh al Salatin)

خواجہ عبدالملک عصامی (۱۳۱۱ء) دہلی میں پیدا ہوا، اس کے دادا عزالدین عصامی، اسماعیل بلبن کے عہد میں سپہ سالار تھے، اس نے اپنے والد کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بہت ہی کم عمر میں باپ کی شفقت سے محروم ہو گیا ہو گا جب محمد بن تغلق نے ۱۳۲۷ء میں دہلی کے امراء کو اور صوفیا وغیرہ کے تقریباً ۱۲۰۰ خاندانوں کو دیوگیر جانے پر مجبور کیا تو عصامی بھی اپنے نوّے سالہ دادا کے ساتھ روانہ ہوا، اس کے دادا تلپت ہی میں (دلّی کے قریب) فوت ہو گئے لیکن عصامی بعافیت دیوگر پہنچ گیا اور آئندہ بائیس سال کے دوران وہ ایک غیر معمولی ادیب کی حیثیت سے تلخی و ناکامی کی زندگی بسر کرتا رہا، اپنے معاصرین سے متنفر ہو کر وہ حجاز جانا چاہتے تھے، چنانچہ انہوں نے اپنی مثنوی ۴۹-۱۳۵۰ء میں مکمل کرنے کے تھوڑے دنوں بعد رختِ سفر باندھا اور مدینہ میں سکونت اختیار کی اور وہیں پر وفات پائی۔ عصامی کی شہرت کا دار و مدار اس کی تصنیف مثنوی فتوح السلاطین پر ہے۔ جسے اس نے بہمنی خاندان کے بانی علاؤالدین حسن بہمن شاہ کی سرپرستی میں نظم کیا، یہ مثنوی تقریباً آٹھ ماہ کی مدّت میں مکمل ہوئی اس میں کل گیارہ ہزار چھ سو تیرانوے ۱۱۶۹۳ اشعار ہیں۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی مثنوی فتوح السلاطین شاہ نامہ ثابت ہو، اس لیے وہ بہمنی سلطان کے لیے فردوسی بن گیا، اسی کے نام سے اس کو معنون کیا تاکہ اس کی سرپرستی حاصل رہے اور ایک دائمی شہرت حاصل ہو، اس نے محمد بن تغلق کو جو سخت و سست کہا اس کا بنیادی سبب اس کے اپنے مصائب تھے۔ حالانکہ وہ تغلق دور کا اکیلا مصنف ہے جو سلطان کے خوف و عنایات سے اوپر ہے۔ فتوح السلاطین (۵۰-۱۳۴۹ء) ہندوستان میں غزنوی حکومت (۹۹۷ء-۱۱۷۳ء) غوری حکومت (۱۱۷۳ء-۱۲۰۵ء) اور دہلی سلطنت کے زمانے تک مسلمانوں کے کارناموں کا ایک سرسری جائزہ ہے جو طویل رزمیہ نظم کی صورت میں ہے، تاریخی نقطۂ نظر سے اس کی قدر و منزلت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس میں حقائق بیان ہوئے ہیں اور شاعرانہ مبالغہ آرائی سے پرہیز کیا گیا ہے، نظام الدین احمد نے طبقاتِ اکبری میں اور بدایونی نے منتخب التواریخ میں اس کی تصنیف کو ماخذ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ عصامی حسن نظامی کا مرہونِ منت ہے، جس کا وہ اعتراف کرتا ہے جس کی اس نے پیروی کی لیکن وہ اس بلندی کو نہ پا سکا جس کو نظامی نے حاصل کیا کیونکہ وہ تاریخی کتاب نہیں لکھنا چاہتا تھا بلکہ رزمیہ نظم کہنا چاہتا تھا۔

6.4 مغل عہد میں فارسی تاریخ نویسی (Persian Historiography during Mughal Period)

ہندوستان کی تاریخ نویسی کی شروعات میں مختلف سمتوں کے اتصال و باہمی ملاپ سے عربی، فارسی، سنسکرت اور ترکی زبانوں سے ایک امتیازی روایت قائم ہوئی، اپنی سوانح عمریاں لکھنے والے بادشاہ تیمور، بابر، جہانگیر، تزک نگار مرزا حیدر دوغلت، ہمایوں کی سرگزشت لکھنے والے جوہر آفتاب چی، گلبدن بیگم کا ہمایوں نامہ اپنے دور کی بہترین معلومات اور ذاتی نقطۂ نظر سے لکھی گئیں جو نظریہ اور طرز ادا کے اعتبار سے مختلف تھیں، چنانچہ تاریخ نے غیر مذہبی انداز اختیار کر لیا اور مورخین اسباب و علل پر توجہ دینے لگے۔

6.4.1 حیدر دوغلت اور ابوالفضل (Haider Doghalat and Abul Fazl)

تاریخِ رشیدی (Tarikh e Rashidi)

مرزا حیدر دوغلت (۱۴۹۹ء تا ۱۵۵۱ء) کی کتاب تاریخ رشیدی کے نام سے فارسی زبان میں لکھی گئی، مرزا حیدر محمد حسین مرزا اور بابر کی خالہ کا لڑکا تھا، ورثے میں اسے بڑی جسمانی قوّت اور لیاقت ملی تھی، ہرات میں (۱۵۰۸ء) اس کے باپ کا قتل شیبانی خاں کے ہاتھوں ہوا، تو بابر نے پدرانہ شفقت اور نگرانی کا ذمہ لیا، وہ بابر کی بڑی تعریف کرتا ہے اور اس کا احسان مند بھی ہے، اس نے بہت سے مقامات پر غیر معمولی فوجی سرگرمی دکھائی۔ ادبی صلاحیتوں اور قوّتِ مشاہدہ کا مالک ہونے کی وجہ سے اس نے بابر کی تقلید کی، اس نے جو کچھ بھی سنا، چھان بین کر کے اسے ضبطِ تحریر میں لایا اس نے اپنی کتاب کا انتساب کاشغر کے سلطان سعید کے نام کیا، کاشغر کی تاریخ کے لیے یہ ایک اہم کتاب ہے، ہندوستان سے متعلق خبریں اور واقعات بہت کم ہیں، جن میں وہ شریک رہا ان کے بارے میں بیانات عینی شہادت پر مبنی ہیں، جیسے قنوج کی جنگ کی کمان اس کے ہاتھ میں تھی، وہ ہمایوں کا وفادار اور جانثار تھا، اس نے ہمایوں سے کہا تھا کہ سلطنت کی دوبارہ حصولیابی کے لیے وہ کشمیر کو صدر مقام کے کے طور پر استعمال کرے۔

آئینِ اکبری (Ain-i-Akbari)

اکبر نامہ کا تیسرا حصہ شمار کیا جاتا ہے تاہم وہ ایک مستقل تالیف ہے جس میں اکبر کی سلطنت کے اعداد و شمار، نظم و نسق، انتظام و انصرام کی تفصیلات، عقائد اور رسم و رواج، دربار اور اس کے آداب، حرم سرا، متوسلین اور متعلقینِ دربار، سالِ الٰہی، مالیات (معاشی نظام)، عمرانیاتِ صوبہ جاتِ ہند، ان کے رہن سہن، ان کے ادارے، مذہبی مقامات ان کی تفصیلات، تیرتھ گاہیں، ہندوستان پر باہر کے حملہ کرنے والے، ہندوستان آنے والے سیّاح، مسلم صوفیہ کرام اور گوشۂ زندگی کے ہر پہلو، کھان پان، جمادات و نباتات پھول ان کی قسمیں، جانور، چڑیا، چرند و پرند، ہر طرح کے پکوان کھانے اور اس کی قسمیں وغیرہم کو شامل کیا ہے جس سے اس کی خلاقانہ ذہنیت اور قابلیت کا پتہ چلتا ہے، ابوالفضل اکبر کے دور کی مالی اصلاحات کا ذکر کرتا ہے لیکن وہ ٹوڈر مل کا نام نہیں لیتا اور بادشاہ کو آئینِ دہ سالہ کا موجد بتاتا ہے۔

6.4.2 احمد ٹھٹھوی و جعفر بیگ آصف خاں (Ahmad Thathvi and Jafar Baig Asaf Khan)

تاریخ الفی (Tarikh e Alfi)

ملّا احمد ٹھٹھوی و جعفر بیگ آصف خاں۔ ہجرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہزار سال ختم ہونے کی یادگار میں اکبر کے حکم (۱۵۸۵ء) پر ملّا احمد نے مدوّن کی، اصل مؤلف ملّا احمد ابن نصر اللہ ٹھٹھوی ہیں، ان کی موت کے بعد (۱۵/ جنوری ۱۵۸۸ء) میں جعفر بیگ آصف خاں نے اس کام کو مکمل کیا اور بادشاہ نے ہجرتِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہزار سال مکمل ہونے پر اس کی کتاب کا نام تاریخ الفی (ہزار۔الف) رکھا یہ کتاب چار جلدوں میں مکمل ہوئی۔ پہلی دو جلدوں پر نظر ثانی (۲۔۱۵۹۱ء) عبد القادر بدایونی نے کی بعد کی جلدوں کو آصف خاں، ملّا نظام الدین اور دیگر کئی مصنفین نے مرتب کیا۔

6.4.3 نظام الدین احمد اور عبد القادر بدایونی (Nizamuddin Ahmad and Abdul Qadir Badauni)

طبقات اکبری (Tabqat-i-Akbari)

نظام الدین احمد ہروی (۱۵۵۱ء تا ۱۵۹۴ء) نے غیر سرکاری تاریخ نویسی کی معلومات میں اضافہ کیا، اس دور میں بادشاہوں کی ادب نوازی میں سرکاری تاریخ نویسی کے ساتھ غیر سرکاری تاریخ نویسی سے ایسی معلومات سامنے آرہی تھیں جن سے اس دور کی صحیح تصویر ابھر کر سامنے آئی، جو مُغل حکومت کے عین مطابق اور مفصل علاقائی تاریخ کا پیش خیمہ بنی، ان میں طبقاتِ اکبری شامل ہے۔ نظام الدین کے والد احمد خواجہ مقیم ہروی نے بابر، ہمایوں اور اکبر کے ماتحت ملازمت کی تھی۔ لہذا وہ اپنے والد کے ساتھ مختلف مقامات پر تربیت پاتا رہا۔ اور اس کا مطالعہ وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ وہ تاریخ و ادب کا شیدائی تھا۔ تاریخ نویسی کی قدر اس نے اپنے والد سے سیکھی تھی، پہلے نظام الدین اکبر کا دیوان رہا۔ پھر گجرات کا بخشی اور دیوان مقرر ہوا، تاریخی کتابوں کے مطالعہ سے اس کا ذہن پختہ ہو گیا اور ان یادداشتوں کو جو اُسے ورثے میں ملی تھیں ان کو بحسن و خوبی استعمال کیا اور طبقاتِ اکبری کو ۳۔۱۵۹۲ء میں تین جلدوں میں مکمل کیا۔ جلد اوّل سبکتگین سے ابراہیم لودھی تک جلد دوم اکبر کے حالات جلد سوم ان مسلم حکومتوں سے متعلق ہے جو اس خطّہ میں تھی، مثلاً دکن، سندھ، کشمیر، بنگال اور جون پور کی حکومتیں۔ میر معصوم بھکری (ذخیرۃ الخوانین) اور شیخ محمد اسحاق بھکری نے اس کی اعانت کی تاکہ وہ اپنی کتاب مرتب کر سکے۔ تاریخ نویسی میں اس نے برنی اور عصامی کی پیروی کی۔ تاہم اس کی یہ کتاب تاریخ دانوں کے لیے ایک معیاری تاریخ کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئی اور بعد کے مصنفوں نے جیسے فرشتہ وغیرہ نے اس کی پیروی کی اور معلومات کو پورے اعتماد کے ساتھ پیش کیا۔

منتخب التواریخ (Muntakhab al Tawarikh)

عبد القادر بدایونی (۱۵۴۰ء تا ۱۶۱۵ء) عہد اکبری کے مشہور عالم اور مورخ ہیں، ان کی ابتدائی زندگی بیساور (ٹوڈا قدیم ریاست جے پور کے قریب) میں گزری، بنیادی تعلیم میر سید محمد مکی سے ملی، عربی تعلیم اپنے نانا مخدوم اشرف سے حاصل کی، ۱۵۵۳ء میں اسے سنبھل آنا پڑا تاکہ شیخ حاتم سنبھلی اور شیخ ابوالفتح سے علم حاصل کر سکے، وہ اپنے والد کے ساتھ ۱۵۵۸ء/۹۶۶ھ میں آگرہ آگیا اور یہیں پر وہ مبارک ناگوری سے

تعلیم حاصل کرنے لگا، فقہ حنفی اس نے قاضی ابو المعالی سے پڑھی، علومِ دینیہ کے شوق نے اسے شیخ نظام الدین امبیٹھوی، شیخ ابن امر وہوی شیخ بخش گڈھ مکتیسوری اور سکندرہ کے شیخ محمد حسین سے ملاقات کرائی، اکبر نے جلال الدین خاں تورجی اور عین الملک کی سفارش پر (۱۵۷۴ء) اس کو درباری امام مقرر کیا اور ایک ہزار بیگھ زمین مدد معاش کے طور پر دی اور حکم ہوا کہ بست سواری منصب دار کی حیثیت سے گھوڑوں کو داغ دیا کرے۔

ابو الفضل نے تقریباً اسی زمانے میں دربار اکبری میں حاضری کا موقع پایا، چنانچہ وہ اپنے خیالات اور وسعتِ نظر کی وجہ سے بادشاہ کا مقرب بن گیا اور بدایونی آپسی رقابت کی بنیاد پر دربار سے الگ کر دیا گیا، یہ اس وجہ سے ہوا کہ ابو الفضل کے خیالات اکبر کو متاثر کرنے لگے اور دربار نے نیا رنگ اپنایا جس کو بدایونی ضبط کرنے سے قاصر رہا، دربار سے غیر حاضری پر اس کی مدد معاش ضبط کر لی گئی تاہم خواجہ نظام الدین (مصنّف طبقاتِ اکبری) کی وجہ سے اس کی مدد معاش بحال ہوئی۔ بدایونی عربی و فارسی کا صاحبِ طرز ادیب ہی نہیں بلکہ علمِ نجوم، ریاضی اور ہندوستانی راگ وراگنی پر بھی دسترس رکھتا تھا۔ وہ تاریخ کی اہمیت وافادیت پر زور دیتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ تاریخ ایک بہترین علم ہے، اہلِ خیر کے لیے سرمایۂ عبرت اور اہلِ دانش و بینش کے لیے آئینہ تجربات ہے، اصحابِ قصص اور سیر نے حضرت آدم سے لے کر زمانۂ حال تک اس فن میں گرانقدر معتبر اور مستند کتابیں لکھی ہیں اور اس کی حقیقت کا ثبوت دلائل سے واضح کیا ہے۔

بدایونی نے اپنی کتاب منتخب التواریخ کے مآخذ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس نے نظام الدین احمد کی طبقاتِ اکبری سے فائدہ اٹھایا ہے تاہم آخر کے دو سال کے حالات اس نے خود جمع کیے ہیں اور آخری کسوٹی معیارِ شریعت ہے، وہ دیکھتا ہے کہ دیانت دار علماء پر جبر کیا جا رہا ہے اور عیّار و مکار لوگ کرسیٔ انصاف پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایسے غیر یقینی حالات میں سرکاری علماء کی آراء واحکام، شریعت کے خلاف ہوں تو عوام کے جذبات کو بھڑکانے کا کام ہوگا جب کہ شریعت کے احکام پر اسلامی طرز زندگی کا دار و مدار ہوتا ہے، تباہ ہو جائے گی لہذا وہ اپنا سارا زور ان لوگوں کے خلاف استعمال کرتا ہے جن کا رویّہ شریعت کے بارے میں منفی اور تحقیر آمیز تھا اور وہ لوگ (سرکاری علماء) بادشاہ کے دل سے شریعت کا احترام ختم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ تاریخ الفی کے ایک رکن، نقیب خاں کے ساتھ مہابھارت (رزنامہ) کے ترجمہ نگاروں کے حیثیت سے بدایونی شریک رہے۔ منتخب التواریخ میں بدایونی نے اس عہد کا نچوڑ بہت ہی گہرائی سے پیش کیا ہے، اس کے بیان میں جگہ جگہ اشعار، قطعات، قصیدے اور مادۂ تاریخ ملتے ہیں گو وہ یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ شاعری سیاسی واقعات کے مقابلہ میں زیادہ اہم ہے مثلاً رضیہ کی تخت نشینی اور اس کے عہدِ حکومت کے درمیان وہ شاعری پر بحث کرتا ہوا نظر آتا ہے اور اشعار کے نمونے پیش کرتا ہے۔ ناصر الدین محمود (۱۲۸۷ء) کے دورِ حکومت چار صفحات پر مشتمل ہیں اور بلبن کے ولی عہد شہزادہ محمد ۱۲۸۵ء کی وفات پر کئی طویل مرثیوں کی تفصیلات نظر آتی ہیں۔ تاہم اپنے ذرائع سے منتخب کے گئے واقعات سے صوفیوں اور شاعروں کے حوالے تاریخوں کے تعین میں مدد دیتے ہیں، شاید ہی کوئی ایسی موت ہو جس کا ذکر قطعہ تاریخ کے بغیر کیا گیا ہو، منتخب التواریخ میں محمد بن تغلق کے دورِ حکومت سے متعلق چھبتا ہوا جملہ شاید ہی کہیں اور ملے وہ لکھتا ہے کہ سلطان کو لوگوں سے اور لوگوں کو سلطان سے نجات مل گئی۔ اس کی تحریر شوخیوں سے پُر ہے وہ لکھتا ہے کہ اس سال ایک بہت بڑے عالم میر مرتضیٰ شیرازی دارِ فانی سے کوچ کر گئے پہلے ان کو امیر خسرو کے مزار کے قریب دفن کیا گیا، لیکن قاضی الاسلام نے بادشاہ (عالی جاہ) سے شکایت کی

کہ امیر خسرو سنّی اور میر مرتضیٰ شیرازی اور رافضی امیر خسرو کو ان سے تکلیف ہو گی لہذا سلطان نے ان کی میت وہاں سے نکال کر کہیں اور دفنانے کا حکم دیا۔ بدایونی دوسری جگہ لکھتا ہے کہ اس سال شیخ ابراہیم چشتی فتح پور میں اپنی موت مرے۔ انہوں نے سونے کے انبار چھوڑے اور مالکِ حیات کے سامنے اپنا کچّا چٹھا پیش کیا۔ ان کے دولت کے انبار سے پچیس کروڑ زرِ نقد، اس کے علاوہ ہاتھی، گھوڑے اور دیگر چیزیں خزانے میں آئیں بقیہ ان کے دشمنوں، بیٹوں پوتوں اور وارثان کے ہاتھ آیا۔

مخدوم الملک ملاّ عبد اللہ سلطان پوری (۱۵۸۲ء) کی وفات پر بدایونی لکھتا ہے کہ ان کا انتقال احمد آباد میں ہوا، ان کا ترکہ اور اثاثہ اتنا زیادہ تھا کہ لاہور سے قاضی علی کو فہرست تیار کرنے کے لیے بھیجا گیا، انہوں نے مال و دولت کا بے انتہا اور اتھاہ دفینہ تلاش کر لیا جس کو کسی انسانی وہم و گمان کی چابی بھی نہیں کھول سکتی تھی، خزانے کا ایک بہت بڑا حصہ مخدوم الملک ملّا عبد اللہ سلطان پوری کے آبائی قبرستان میں سونے وچاندی کے اینٹوں سے بھرے صندوقوں میں تھا اور اس طرح دفنایا گیا تھا گویا لاشیں ہوں، مال واسباب اتنا زیادہ کہ خالقِ کائنات ہی اس کا حساب کر سکتا تھا وہ ساری اینٹیں اور مال وزر اور ان کے ساتھ وہ کتابیں جن کی قیمت معمولی اینٹوں سے زیادہ نہ تھی ضبط کر کے شاہی خزانے میں داخل کر دی گئی۔ اس کے علاوہ مادۂ تاریخ نکالنے میں بدایونی کو مہارت حاصل تھی، بعض لوگوں کی وفات پر ان کی نکالی گئی تاریخ تحقیر وتذلیل کے زمرے میں آجاتی ہے جیسے شیخ ابراہیم چشتی کے لیے ''شیخ بخیل'' اور شیخ گدائی کے لیے ''جسمِ خنزیر۔''

بدایونی کی کتاب اکبر کے دور میں مصلحت کے تحت پوشیدہ رہی اور جہانگیر کے عہد میں یہ منصہ شہود پر آئی اور دنیا سے متعارف ہوئی، تاہم اس کی کتاب تاریخ نویسی کی کسوٹی پر معروضیت لیے ہوئے نظر آتی ہے۔ اور اس نے حقائق کا پردہ فاش کیا ہے۔ بلاشبہ وہ جو محسوس کرتا ہے بغیر کسی نفع ونقصان، آزادانہ طور پر لکھتا ہے، وہ آزادئ رائے کا متلاشی ہے اور پسند کی زندگی خود گزارنا پسند کرتا ہے اور دوسروں کے لیے بھی وہی پسند کرتا ہے وہ زندگی کو ہر سمت سے دیکھ کر لطف اٹھاتا رہا ہے اس نے جو کچھ لکھا وہ زندہ اور متحرک ہے خود اس کا اور اس کے عہد کا آئینہ دار ہے۔ اس نے یہ لکھا ہے کہ مندروں کو اکبر نے بہت سی مدد معاش دی تھی۔ صحیح ہے جب کہ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا میں موجود فرامین اس کی تائید کرتے ہیں۔ بدایونی مہابھارت کے فارسی ترجمہ 'رزم نامہ' کے ساتھ تاریخ الفی کے ممبران میں شامل تھا، اس نے رامائن کو بادشاہ کے حکم پر چھ سال کی مدت میں فارسی میں مکمل کیا۔ ''تاریخ رشیدی'' (مرزا حیدر دوغلت) کو ابوالفضل کے مشورہ پر ترجمہ کیا، بحر الاثمار جو کشمیر کی تاریخ ہے نامکمل تھی پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ نجات الرشید اور انتخابِ تاریخ کشمیر کو بادشاہ اکبر کے حکم پر مکمل کیا جسے اس نے ۱۵۸۶ء میں فتح کیا تھا جو اس دور کی تاریخ نویسی کی آئینہ دار ہے۔

6.4.4 محمد قاسم ہندو شاہ استرآبادی (Mohammad Qasim Hindu Shah Astrabadi)

تاریخ فرشتہ (Tarikh-e-Farishta)

محمد قاسم ہندو شاہ استرآبادی (پیدائش غالباً ۱۵۷۲ء/۹۸۰ھ) کے والد غلام علی ہندو شاہ بیجاپور میں آباد ہوئے۔ مرتضیٰ نظام شاہ (۱۵۶۵ء تا ۱۵۸۸ء) کی ملازمت میں فرشتہ کو اس کے حفاظتی دستے میں جگہ ملی، مرتضیٰ شاہ کی وفات کے بعد وہ میرا حسین (۱۵۸۹ء) کے

ساتھ رہا، میر احسین کے قتل کے بعد فرشتہ بیجاپور میں ابراہیم عادل شاہ کی ملازمت میں (۱۸۹۰ء) آیا، جب ابراہیم عادل شاہ کی بیٹی بیگم سلطان کی شادی اکبر کے بیٹے شاہزادہ دانیال سے طے ہوئی تو (جولائی ۱۶۰۴ء) اس نے بیگم کے ہمراہ سفر کیا اور اپنی تالیف ۱۶۰۶ء میں مکمل کی، ابراہیم عادل شاہ ہی کی نسبت اس نے اپنی کتاب کا نام گلشنِ ابراہیمی رکھا جو بعد کے زمانہ میں تاریخِ فرشتہ کے نام سے مشہور ہوئی، اس کتاب کے دو نسخے دستیاب ہیں، ایک نسخہ ۱۶۰۷ء کا لکھا ہوا ہے جب کہ دوسرا ۱۶۰۹-۱۰ء کا ہے اور یہی دوسرا نسخہ تاریخِ نورس نامہ کے نام سے معروف و مشہور ہے۔ ہندوستانی دورِ وسطی میں جو بھی روزنامچے لکھے گئے ان میں تاریخ فرشتہ (گلشنِ ابراہیمی) اہم ترین ہے۔ اس کتاب کی شروعات ایک مقدمہ سے ہوتی ہے جس میں ہندوؤں کی تاریخ کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے، مقدمہ کے بعد شاہانِ اسلام کے واقعات اور مشائخ عظام کی سوانح ہے، جن کا تعلق سلطان سبکتگین غزنوی کے زمانے سے ہندستان سے رہا ہے، کتاب کے اختتام پر ہندوستان کے جغرافیائی حالات، ہندوؤں کی تاریخ شناسی اور ہندو راجاؤں کا ذکر ہے جو فرشتہ کے زمانے میں باجگزار حکمراں تھے۔

فرشتہ کے زمانے میں ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ نویسی کا انداز آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر مسلم حکمرانوں کے حالات تک محیط ہوتے تھے اور علاقائی فرمانرواؤں اور مشائخ کا خاص تذکرہ غزنوی دور سے شروع ہوتا تھا۔ نویں صدی ہجری/پندرہویں صدی عیسوی سے عام تاریخوں میں ان فارسی تاریخوں کی پیروی ہونے لگی جو مغل اور گجراتی سلاطین کی سرپرستی میں لکھی گئیں (ان میں میر خواند کی روضۃ الصفا، خواند میر کی خلاصۃ الاخبار (۱۵۰۰ء) حبیب السیر (۱۵۲۳ء) شامل ہیں ۔ روضۃ الصفا کا اثر عبد الکریم بن محمد کی الطبقات المحمودیۃ شاہیہ (۱۴۹۹ء-۱۵۰۰ء) اور فیض اللہ کی تاریخ صدرِ جہاں (۲-۱۵۰۱ء) میں بھی نظر آتا ہے (دونوں مورخ محمود شاہ بیگڑا کی سرکار میں ملازم تھے)۔

اکبر نے مقامی اور علاقائی تاریخ نویسی کی حوصلہ افزائی اس لیے کی تھی کہ اس کی سلطنت کی کڑیاں مغلوں سے قبل مسلم سلاطین سے ملائی جاسکیں اور یہ تاثر پیدا ہو کہ اس کی حکومت اسلامی حکومت کے تسلسل کا درجہ رکھتی ہے ان میں عباس خاں شیروانی کی تحفۂ اکبر شاہی (۱۵۷۹ء) اور ابوالفضل کا اکبر نامہ شامل ہے۔ اس کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ مغل سلطنت کی شان و شوکت کے مطابق ایک عام اور مفصل علاقائی تاریخ لکھوائی جائے اس کی مثال نظام الدین احمد کی طبقاتِ اکبری (۱۵۹۳-۱۵۹۲ء) ہے۔ فرشتہ عبد الکریم اور فیض اللہ کی تصانیف سے متعارف تھا وہ کہتا ہے کہ ابراہیم عادل شاہ نے اسے روضۃ الصفا کا ایک نسخہ عطا کیا اور کہا کہ مملکتِ ہند کی تاریخ لکھتے وقت اس میں سلاطینِ دکن کے حالات، نظام الدین احمد کی طبقات سے زیادہ واضح اور مفصل ہو۔

گلشن ابراہیمی (تاریخ فرشتہ) ایک سن وار تاریخ ہے جو تمام قدیم تاریخ، زبانی روایات اور خود فرشتہ کے ذاتی مشاہدات پر مبنی ہے۔ اس کا مقصد مسلمانوں کے عظیم الشان دورِ حکومت کی تاریخ نویسی ہے ایسا لگتا ہے کہ یہ طبقات اکبری کا تتمہ یا خلاصہ ہے۔ فرشتہ کے یہاں ہندو راجاؤں کی اور ان کے دور کی تفصیل ہے، عربوں کی ہندوستان میں آمد، افغانوں کی اصل اور ان کے کارنامے کابل میں عربوں کا اقتدار اور سبکتگین کی حکومت کے واقعات طبقاتِ اکبری (نظام الدین احمد) میں بیان کیے گئے واقعات سے زیادہ ہیں، فرشتہ واقعات و حادثات کی چھان بین میں اپنا وقت صرف نہیں کرتا بلکہ تاریخ الفی اور طبقاتِ اکبری سے واقعات کو ہو بہو نقل کر دیتا ہے۔ اور بعض جگہوں پر ایسا بھی ہوا ہے کہ

طبقاتِ اکبری کی عبارتیں ویسے ہی نقل کر دیتا ہے۔ گلشنِ ابراہیمی یا تاریخِ فرشتہ کی تاریخ نویسی کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھنے کی ضرورت ہے تاکہ اس کے متضادات اور مختلف بیانات اور تاریخی اغلاط کو از سرِ نو مرتب کیا جا سکے۔

6.4.5 عبدالحمید لاہوری اور مرزا محمد کاظم

(Abdul Hamid Lahauri and Mirza Mohammad Kazim)

پادشاہ نامہ (Padshah Nama)

عبدالحمید لاہوری (متوفی ۱۶۵۶ء) کی شہرت سن کر شاہ جہاں نے اس کو اپنے دور کے وقائع نویسی پر مامور کیا، اس نے دو جلدوں میں دس دس سال کے دور کی تاریخ پادشاہ نامہ کے نام سے لکھی جس پر نظر ثانی بادشاہ کے وزیر سعد اللہ خاں نے کی۔ پہلی جلد (۱۶۲۷ء تا ۱۶۳۷ء انداز میں لکھا جس کے اختتام پر منصب داروں، علماء، حکماء، شعراء جو عہدِ شاہ جہانی میں تھے کی فہرست ہے جس کے آخر میں ۸۰۰۰ منصب داروں کا ذکر کیا گیا ہے۔ دوسری جلد میں (۱۶۳۷ء تا ۱۶۴۷ء) تاریخی حالات و واقعات جو عہد شاہ جہاں میں رونما ہوئے درج کیے ہیں، ان میں سال بہ سال جنگی مہمیں، شورش پسندوں کی سرکوبی، نوروز کا جشن، انعامات کی تقسیم، نئی عمارتوں کی تعمیرات کے ساتھ، رسومِ نکاح وسگائی، شمسی و قمری مہینے نیز اسلامی تقریبات اور درباری حالات و کوائف بیان کیے ہیں۔ دونوں جلدوں کے اخیر میں شہزادوں اور امراء کے منصب جو وقت بہ وقت بدلتے رہے ہیں درج ہیں، دونوں جلدوں کا اختتام علماء و مشائخ، شعراء و حکماء کے مختصر احوال پر ہوتا ہے۔ البتہ پادشاہ نامہ کی تیسری جلد وہ نہ لکھ سکا۔ تیسری جلد اس کے شاگرد محمد وارث (متوفی ۱۶۸۰ء) نے مرتب کیا اور اس پر نظر ثانی علاء الملک تونی المعروف بہ فاضل خاں (۱۶۶۳ء) نے کی جو پادشاہ نامہ عنایت خاں کے نام سے مشہور ہوئی۔ عنایت خاں دراصل شاہ جہاں کی لائبریری کا لائبریرین تھا، اس نے شاہ جہاں کے عہد کے تمام ادوار کو دیکھا تھا اس لیے اس نے واقعات و حادثات کو لکھا۔

عالمگیر نامہ (Alamgir Nama)

فارسی تاریخ نویسی منزل بہ منزل آگے بڑھتی رہی، لیکن عہدِ اورنگ زیب میں صرف دس سالہ دور تک تاریخ لکھی گئی اور اس کے بعد سرکار کی سرپرستی نہ مل سکی اور نگ زیب عالمگیر کو خیال آیا کہ یہ طریقہ مناسب نہیں ہے کہ حکومت اپنے عہد کی تاریخ عالم گیر نامہ اپنی مرضی سے لکھوائے، تاہم ابتدائی دس سالہ دورِ حکومت کو مرزا محمد کاظم (متوفی ۱۶۸۱ء) نے عالمگیر نامہ کے نام سے مرتب کیا، جس سے اس دور کے تاریخی و معاشی حالات اور سماجی تفاوت (نابرابری) کا پتہ چلتا ہے۔ تاہم محمد ساقی مستعد خاں (متوفی ۱۷۲۴ء) نے اپنی کتاب مأثر عالمگیری میں محمد کاظم (عالمگیر نامہ) کے دس سالہ دور کا خلاصہ اور چالیس سالہ دورِ اورنگ زیب کو ملا کر ایک اجمالی تاریخ مکمل کی اس طرح اس کی کتاب مأثر عالم گیری میں کل پچاس سالہ دور کی تاریخ جمع ہو گئی۔ اس نے اپنی خواہش کے مطابق واقعات کا بہترین انداز میں انتخاب کیا اور تقریباً ۱۷۱۰ء کو یہ کتاب مکمل کی۔

6.4.6 محمد صالح کنبوہ اور محمد ہاشم خافی خان

(Mohammad Saleh Kanboh and Mohammad Hashim Khafi Khan)

عمل صالح (Amal-i-Saleh)

محمد صالح کنبوہ۔ یہ کتاب شاہ جہاں کے عہد کی تاریخ ہے، اس نے اپنی کتاب کی ابتداء بابر کے عہد سے کی ہے، اکبر، جہانگیر کی تاریخ اور اس کے دور کی سرگرمیوں کو تفصیل سے بیان کیا ہے، اس کے علاوہ شاہ جہاں کے عہد کے واقعات اور عالمگیر کے آغازِ حکومت تک کے واقعات بہت ہی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ کتاب کا اختتام ان امراء، شعراء، حکماء اور علماء کے تذکرے پر کیا ہے جن کا شاہ جہاں کے دربار سے تعلق تھا۔ تین جلدوں پر مشتمل اس نے اپنی کتاب ۱۶۶۰ء میں مکمل کی۔

منتخب اللباب (Muntakhab-ul-Lubab)

محمد ہاشم خوافی (خافی) خاں (۱۶۶۳ء تا ۱۷۳۱ء) کی کتاب خاندان تیمور سے محمد شاہ (۱۷۳۳ء) تک کی مکمل تاریخ ہے۔ محمد ہاشم خوافی خاں نے اورنگ زیب کے دور میں ترقی حاصل کیا اور مختلف سیاسی و فوجی عہدوں پر تعینات رہا (۱۷۱۴ء-۱۷۱۳ء)۔ فرخ سیر کے دور میں حیدرآباد کے نظام الملک نے اسے دیوان مقرر کیا چنانچہ وہ نظام الملک کے نام سے مشہور ہو گیا۔ اس کی کتاب منتخب اللباب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ تیمور سے شاہ جہاں کے عہد تک مختصراً تاریخ ہے، تمہید حضرت نوح علیہ السلام سے کی ہے، بابر سے مغلوں اور تاتاریوں کی تاریخ کا خاکہ ہے۔ دوسرا حصہ اورنگ زیب سے فرخ سیر تک احوال و واقعات کا ذکر ہے۔ چونکہ اورنگ زیب نے تاریخ نویسی کو بند کر دیا تھا لیکن خافی خاں کی کتاب ہندوستان کی تاریخ نویسی کی ایک بہترین اور غیر جانب دار تاریخوں میں سے ایک ہے۔ جس نے اس دور کے واقعات کا بذاتِ خود مشاہدہ کیا، لوگوں سے زبانی روایات کو لیا اور اسے جمع کیا جنہوں نے اس وقت کے واقعات کو دیکھا اور سنا تھا۔ اس کے علاوہ اورنگ زیب کے عہد کے واقعات کی تصدیق کر کے اپنی کتاب میں درج کیا۔

خافی خاں نے دراصل شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے حالات کے دو غیر مطبوعہ مخطوطات سے ہو بہو نقل کیا ہے یہ دونوں مخطوطے برٹش لائبریری میں مل گئے ہیں، پہلا مخطوطہ صادق خاں کا ہے جس کا نام شاہ جہاں نامہ ہے دوسرا ابوالفضل معموری کا مخطوطہ ہے جسے تاریخ اورنگ زیب کہتے ہیں، مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ ابوالفضل معموری کا مخطوطہ دراصل صادق خاں کے مخطوطے پر شاہ جہاں نامہ کی تکمیل و تتمہ ہے، مصنف نے تسلسل اس لیے برقرار رکھا تاکہ وہ اورنگ زیب کے عہد کی تاریخ لکھ سکے، مگر خافی خاں نے منتخب اللباب میں اپنی اصلیت چھپالی اور اس نے ان دونوں مخطوطوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور ان کا ذکر تک نہ کیا۔

خافی خاں نے اپنی کتاب میں تاریخ نویسی کے آداب کو ملحوظ رکھا۔ اس نے بغیر کسی لالچ اور بغیر کسی خوف کے اپنی تاریخ نویسی کو جاری رکھا اور داخلیت (subjectivity) کو دور رکھا اور معروضیت (objectivity) کو اپنا شعار بنایا۔ اس نے سرکاری معلومات سے (جو لوگوں کی پہنچ سے دور تھے) واقعات کو لیا۔ لیکن اس کا اپنا نقطہ نظر کبھی کبھی سرکاری نظر آتا ہے۔ وہ شیواجی کو باغی اور افضل خاں کا قاتل لکھتا

ہے۔ شیواجی کی وفات پر تاریخِ وفات ''کافر جہنم رفت'' نکالی۔ اس کے باوجود شیواجی کی بہادری وشجاعت کی تعریف کرتاہوالکھتاہے کہ مرہٹوں نے مسجدوں، قرآن کریماور عورتوں کو نقصان پہنچانے کی سخت ممانعت کی تھی۔اس کے علاوہ خاندانِ دکن پر ایک تاریخی کتاب لکھی ہے جس میں بیجاپور، گولکنڈہ، خاندیش وغیرہ سے متعلق مفید معلومات ہیں، جسے منتخب اللباب کا حصہ سوم کہاجاتاہے۔

6.4.7 عاقل خاں رازی اور مرزا محمد حسن (Aaqil Khan Razi and Mirza Mohammad Hasan)

واقعاتِ عالمگیری (Waqiat-i-Alamgiri)

عاقل خاں رازی (۱۶۶۹ء) اس کا اصل نام میر عسکری تھا۔ فارسی کا بہترین شاعر، شیخ برہان الدین، رازالٰہی کا مرید ہونے کی وجہ سے رازی تخلّص کرتا تھا۔ اورنگ زیب کا زمانۂ شہزادگی سے خاص دوست تھا۔ اس کی بہترین کارکردگی پر اس کو عاقل خاں خطاب ملا، ۱۶۸۰ء میں دہلی کا حاکم مقرر ہوا، بعد میں اس نے اورنگ زیب سے گوشہ نشینی کی درخواست کی، بادشاہ نے اس کا وظیفہ مقرر کردیا۔ واقعاتِ عالمگیریاور نگ زیب کے دور شاہزادگی کے حالات اور تخت نشینی کی جنگ سے متعلق بہترین اور معتبر ماخذ ہے اس نے شاہ جہاں کی وفات کا حال بھی لکھاہے۔

مرأتِ احمدی (Mirat-i-Ahmadi)

مرزا محمد حسن (پیدائش ۱۷۰۰ء) برہان پور میں پیداہوئے، جہاں اس کے والد اورنگ زیب کی فوج میں ایک اہم عہدے پر فائز تھے، ان کے والد وزیر سید عاقل کے وقائع نگار مقرر ہوئے۔ اپنے والد کی وفات کے بعد وہ کپڑا بازار کے نگراں مقرر ہوئے اور بالآخر ۱۷۴۷ء تا ۱۷۵۵ء تک صوبہ گجرات کے دیوان بنے۔ وہ بہت لائق، مدبّر اور فرض شناس تھے، انہوں نے بہت ہی سخت حالات دیکھے تھے، وہ صوبہ کے حالات سے واقفیت رکھتے تھے اور معلومات کو بڑی محنت اور لگن سے اکٹھا کیا تھا۔ بڑی تفصیل سے انہوں نے یہ ساری چیزیں اپنی کتاب میں لکھیں، گجرات کی یہ تاریخ تقریباً دس سالوں پر محیط ہے۔ (یعنی ۱۷۵۰ء تا ۱۷۶۰ء) گجرات کا پشتینی صوبہ نویس مٹھالال تھا اس نے مرزا محمد حسن کی بڑی مدد کی، اس کائستھ کی مدد سے انہوں نے اپنی کتاب کو جو دو حصوں پر مشتمل ہے، مکمل کی، ہر حصہ دوسرے حصے سے نمایاں ہے، انہوں نے اورنگ زیب کے دور کو مختصراً بیان کیاہے۔ کیونکہ وہ سابقہ کتابوں سے نقل کیا گیاہے۔ دوسرے حصے میں مصنف کا تعارف ہے اور اس کے عہد کے واقعات ہیں جن میں وہ بذاتِ خود شریک تھے۔ ضمیمہ کا خاتمہ گجرات کے جغرافیائی حالات، سرکاری طبقوں اور عام انتظامی کیفیات، صوفیاء کرام کی زندگی کے احوال پر مشتمل ہے۔

6.4.8 بھیم سین، ایشور داس اور سجان رائے (Bhimsen, Ishvar Das, and Sujan Rai)

نسخۂ دلکشا (Nuskha-i-Dilkusha)

بھیم سین برہان پوری (پ ۱۶۴۹ء) کے والد کا نام رگھونندن داس تھا جو مغلوں کا موروثی کائستھ تھا۔ لہذا بھیم سین نے اپنی زندگی مغل شہزادوں اور دکن وکوچ بہار کے میدانوں میں گزاری۔ انہوں نے راس کماری سے دہلی تک بہت سے مقامات دیکھے، ان کے اعلیٰ مغل

عہدیداروں سے مراسم تھے بہت سے واقعات میں بذاتِ خود شریک رہے۔ دکن کی مہم میں راجہ بندیلہ اور نگ زیب کے سپہ سالار ذوالفقار خاں کے نائب کی حیثیت سے شامل ہوئے۔ انکی کتاب نسخۂ دلکشا دکن کے حالات ۲۸ سالوں (۱۶۸۱ء تا ۱۷۰۹ء) پر محیط ہیں۔ انہوں نے اور نگ زیب کے عہد کو ایک مورخ کی حیثیت سے دیکھا جو فارسی زبان پر قدرت رکھتا ہو۔ وہ یہ جانتے تھے کہ سچ کیا ہے اور کون سچ بولنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ انہوں نے بہت سی ایسی باتیں اور واقعات عہدِ اورنگ زیب فراہم کی ہیں جو اس دور کے سرکاری تاریخ میں نہیں ملتیں، جیسے واقعات کے اسباب و نتائج، ملک کی حالت، عوام کی روز مرّہ زندگی اور تفریحات، اشیاء کی قیمتیں، آمد و رفت کے ذرائع اور سڑکوں کی حالت، طبقۂ اشرافیہ کی سماجی زندگی، دکن میں مغلوں سے جنگ و جدال اور کسانوں کی حالت، کاشتکاروں کی حالتِ زار وغیرہ، بھیم سین لکھتے ہیں کہ اس وقت جاگیرداروں کی حالت بہت خراب تھی اور یہ توقع ختم ہو چکی تھی کہ کوئی جاگیر اب کسی عہدیدار کے پاس رہے گی یا نہیں؟ محصل لگان وصول کرتے وقت کسانوں پر بہت ظلم ڈھاتے تھے اور اس ظلم و زیادتی کی وجہ سے کاشتکاروں نے کاشت کرنی چھوڑ دی تھی۔ جاگیرداروں کو پیسہ نہیں ملتا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ مرہٹوں کی شورش کا سبب وہ انتظامی استحصال و ظلم تھا جو انہوں نے مہاراشٹر کے نزدیک کے علاقوں کے کسانوں پر ڈھا رکھا تھا۔ الغرض نسخۂ دلکشا اس وقت کے حالات پر ایک بہترین ماخذ کے طور پر جانی جاتی ہے۔ جس کو بھیم سین نے ۹۔۱۷۰۸ میں تصنیف کیا۔

فتوحاتِ عالمگیری (Futuhat-i-Alamgiri)

ایشور داس ناگر (پیدائش ۱۶۵۵ء) گجراتی برہمن اور پٹن کے رہنے والے، وہ قاضی القضاۃ شیخ الاسلام کے ۱۶۸۵ء تک ملازم تھے۔ اس کے بعد گجرات کے حاکم شجاعت خاں کی ۱۶۸۵ تا ۱۷۰۱ء تک ملازمت کی، انہوں نے دربار اور بادشاہ دونوں جگہوں سے صحیح واقعات اور حالات دریافت کیے اور اپنی کتاب میں درج کیے، انہوں نے اپنی کتاب فتوحاتِ عالمگیری کو ۱۷۳۱ء میں مکمل کیا اور اورنگ زیب کے ۳۴ویں برس (۱۷۰۷ء۔ ۱۶۷۲ء) تک کے حالات اور واقعات کو درج کیا۔

خلاصۃ التواریخ (Khulasa-ut-Tawarikh)

سجان رائے کھتری بھنڈاری نے اپنی کتاب میں راجہ یدھشٹر سے لے کر اورنگ زیب کی تخت نشینی کے عہد تک حکومت کے واقعات کو بیان کیا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب میں اورنگ زیب کے چالیس ۴۰ سالہ دورِ حکومت (۱۶۶۵ء تا ۱۷۰۷ء) کے واقعات کو قلم بند کیا اور اورنگ زیب کی تاریخ وفات کا ذکر کیا ہے اور احمد شاہ کو تخت نشین کرنے کے واقعہ کو بھی قلمبند کیا ہے۔

6.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

ہندوستان میں ترکوں کی آمد کے ساتھ عربی اور فارسی تاریخی روایات بھی آئیں۔ اس روایت کو ایران اور وسط ایشیا سے آنے والے مہاجرین نے بدستور قائم رکھا۔ گیارہویں صدی سے بارہویں صدی کے دوران کئی اہم تاریخی کتابیں لکھی گئیں۔ جن میں عمومی، علاقائی، حکومتی تاریخوں سے لے کر سوانح عمریاں اور تزک شامل ہیں۔ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں جن مورخین نے فارسی زبان میں تاریخ نویسی کو

فروغ دیاان میں امیر خسرو، ضیاالدین برنی، یحیٰ سرہندی، شمس سراج عفیف، عصامی، ابوالفضل، بدایونی، خافی خان، فرشتہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ان تمام مورخین نے عہد وسطیٰ کی فارسی تاریخی روایات میں گراں قدر اضافہ کیا۔ مغلوں کے عہد میں فارسی سرکاری زبان تھی حکومت کے تمام کام فارسی میں انجام پاتے تھے اس لیے ضروری تھا کہ تمام سرکاری ملازمین فارسی جانیں۔ چنانچہ مسلمانوں کے ساتھ ہندو اہل کروں نے بھی فارسی زبان سیکھی اور کئی لوگوں نے عمدہ تاریخیں تصنیف کیں۔ جن میں بھیم سین، ایشور داس ناگر اور سجان رائے بھنڈاری قابل ذکر ہیں۔اس اکائی میں ہم نے عہدِ سلطنت سے لے کر مغل عہد کے اہم فارسی نگارشات کا سرسری جائزہ لیا اور اہم فارسی تاریخی کتابوں اور ان کی طرزِ تحریر سے واقفیت حاصل کی ہے۔

6.6 کلیدی الفاظ (Keywords)

تسلّط	:	قبضہ
اقتصادی	:	معاشی
فوقیت	:	برتری
ارتقاء	:	آہستہ آہستہ ترقی کرنا
خانہ بدوش	:	جس کا کوئی گھر نہ ہو، بے ٹھکانہ
فخر ومباہات	:	شان وشوکت، شیخی
محلّ وقوعٍ	:	واقع ہونے کی جگہ
موزونیت	:	مناسبت
مُسجع	:	وہ عبارت جس میں قافیہ کا اہتمام ہو
مُقفّی	:	قافیہ دار
ثقیل	:	بھاری بھر کم
بلاغت	:	حسب موقع گفتگو، فصیح کلام
ایجاز	:	مختصر
ضرب الامثال	:	مقولے، مثالیں
آویزاں	:	لٹکانا
فصاحت	:	خوش کلامی، خوش بیانی

6.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

6.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. طبقاتِ ناصری کا مصنف کون ہے؟
2. قران السعدین کس کی تصنیف ہے؟
3. یحیٰ سرہندی کی لکھی کتاب کا نام بتائیے۔
4. ہمایوں نامہ کس نے لکھا ہے؟
5. جہانگیر کی لکھی خود نوشت تحریر کا کیا نام ہے؟
6. تزک بابری کس نے لکھا ہے؟
7. ضیاالدین برنی کس کا ندیم تھا؟
8. تاریخ رشیدی کس دور سے متعلق ہے؟
9. ابو لفضل کون تھا؟
10. نعت محمدی کا مصنف کون ہے؟

6.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. عبدالحمید لاہوری کے پادشاہ نامہ کی خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔؟
2. حسن نظامی کی تارج المآثر میں ہندی فارسی کی جو روایات ملتی ہیں ان کی وضاحت کیجیے۔
3. ضیاالدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی پر مختصر نوٹ لکھیے۔
4. ملا عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ پر روشنی ڈالیے۔
5. نسخۂ دلکشا کی خصوصیات بیان کیجیے۔

6.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. ابابر نے تزک بابری میں کن کن چیزوں کا ذکر کیا ہے، ایک تفصیلی نوٹ لکھیے۔
2. ابوالفضل کے اکبر نامہ کی اہمیت وافادیت بیان کیجیے۔
3. عمل صالح کی تاریخی اہمیت اور اس کی اہم خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔

6.8 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. پروفیسر محب الحسن: ہندوستانی دورِ وسطی کے مورخین، مطبوعہ، قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی ۲۰۰۴ء
2. حسن زیات، تاریخ ادب عربی، مطبوعہ البلاغ پبلی کیشن نئی دہلی ۲۵، ۲۰۱۵
3. معین الدین احمد ندوی:—ہندوستان عربوں کی نظر میں، دارالمصنفین، اعظم گڑھ ۱۹۶۱ء
4. فتوح السلاطین، خواجہ عبدالملک عصامی، مطبوعہ آگرہ ۱۹۳۸ و مدراس ۱۹۴۸ انگریزی ترجمہ آغا مہدی حسن ممبئی ۱۹۶۷ء۔
5. پیٹر ہارڈی۔ ہسٹورین آف میڈیول انڈیا، لندن ۱۹۶۰ء
6. تذکرۃ الواقعات ترجمہ ایس معین الحق۔ کراچی
7. ایشوری پرشاد، لائف اینڈ ٹائمس آف ہمایوں کلکتہ ۱۹۵۵ء
8. اقبال نامۂ جہانگیری۔ معتمد خاں بخشی ترجمہ مولوی ابوالوفاء محمد زکریا، عثمانیہ حیدرآباد ۱۹۲۸ء
9. ۹ مآثر جہانگیری انگریزی ترجمہ جادوناتھ سرکار اردو ترجمہ فدا علی طالب، عثمانیہ حیدرآباد ۱۹۲۳ء
10. ذاکر حسین۔ مغل ایڈمنسٹریشن آف دی ڈکن انڈر اورنگ زیب (پی، ایچ ڈی مقالہ، زیر طبع)۔

اکائی 7۔ منہاج سراج: طبقات ناصری

(Minhaj-Siraj: Tabaqat-i-Nasiri)

اکائی کے اجزا

7.0		تمہید
7.1		مقاصد
7.2		مورخ کا دائرہ مطالعہ
7.3		منہاج سراج کے حالات زندگی
7.4		مورخ کے ذرائع معلومات
7.5		منہاج سراج کا فلسفۂ تاریخ
7.6		حقائق کی تعبیر
7.7		اکتسابی نتائج
7.8		کلیدی الفاظ
7.9		نمونہ امتحانی سوالات
	7.9.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	7.9.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	7.9.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
7.10		مزید مطالعہ کے لیے تجویز کردہ کتابیں

7.0 تمہید (Introduction)

ہندوستان کے عہد وسطیٰ میں مسلم حکومت کا قیام بارہویں صدی عیسوی کے آخری دہے میں ہوا تھا۔ یہی وہ دور بھی تھا جب منگولوں نے وسط ایشیاء پر حملے کرنا شروع کر دئے تھے اور یہاں کی سلطنتوں کو تاخت وتاراج کر دیا تھا۔ جس کے نتیجے میں خراسان وماوراءالنہر کے علاقوں سے بڑی تعداد میں علماء و فضلاء نے ہندوستان کا رخ کیا کیونکہ ہندوستان میں وسط ایشیائی مسلم حکومتوں کے مقابلے زیادہ مستحکم سلطنت تھی۔ دہلی کے سلاطین کو بھی اپنی حکومت چلانے اور اسے مزید مستحکم بنانے نیز انتظامی اداروں کو چلانے کے لیے قابل افراد کی ضرورت جن کو وسط ایشیا سے آنے والے مسلمان علماء و فضلاء اور عسکری صلاحیت کے حامل افراد نے پورا کیا۔ سلاطین نے بھی ایسے افراد کو نہ صرف خوش آمدید کہا بلکہ سلطنت کے انتظام وانصرام کے لیے بلا صلاحیت و قابل افراد کو اہم مناصب پر فائز بھی کیا اور ان لوگوں نے بھی سلاطین کو اپنی کارکردگی سے مایوس نہیں کیا۔ وسط ایشیاء سے ہندوستان آئے ایسے ہی افراد میں وہ فارسی مورخین بھی تھے جنہوں نے عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ کو قلمبند کیا۔ چونکہ ان فارسی مورخین کا تعلق شاہی دربار سے تھا جو بنیادی طور پر شاہی عہدہ دار، امراء وملوک، مذہبی علماء و فضلاء کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان ہی میں کچھ درباری مورخ بھی تھے۔ جن کے تاریخ لکھنے کا مقصد حکمرانوں و سلاطین کی خوشنودی، انعام واکرام اور منصب ہائے جلیلہ حاصل کرنا تھا۔ قاضی منہاج سراج مولف ''طبقات ناصری'' کا تعلق بھی اسی طبقے سے تھا جو اپنے عہد کا ایک جید مذہبی عالم ، مبلغ، خطیب امام اور منتظم تھا اور صدر جہاں، قاضی القضاۃ جیسے عہدہ ہائے جلیلہ پر فائزرہ چکا تھا۔ جس کی پوری زندگی شاہی درباروں سے وابستہ رہی تھی۔ قاضی منہاج نے ''طبقات ناصری'' کے نام سے ایک عمومی تاریخ لکھی ہے جس میں حضرت آدمؑ سے لے کر ہندوستان میں سلطان ناصرالدین محمود کے پندرہویں سال جلوس 1260ء تک کے واقعات کو درج کیا ہے۔

7.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- منہاج سراج کے حالات زندگی کے بارے میں جان سکیں گے۔
- منہاج کے ذرائع معلومات کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- منہاج کا نظریہ تاریخ سمجھ سکیں گے۔
- طبقات ناصری کی تاریخی اہمیت کا جائزہ لے سکیں گے۔

7.2 مورخ کا دائرہ مطالعہ (Historian's Area of Study)

قاضی منہاج سراج زندگی بھر دربار شاہی سے منسلک رہا تھا۔ اس کی تالیف ''طبقات ناصری'' تیئس (23) طبقات پر مشتمل ہے۔ 'طبقات' کا لفظ تہہ در تہہ معلومات فراہم کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر ایک ہی وقت میں مختلف قوموں کے حکام کی تاریخ مرتب کی جائے تو ایک خاندان کی تاریخ یا ایک گروہ کی تاریخ کو ایک طبقہ کہا جاسکتا ہے۔ کچھ دانشوروں کے نزدیک ایک طبقہ بیس (20) سالہ واقعات و

حادثات پر محیط ہوتا ہے۔ قاضی منہاج نے یہ اصطلاح ایک حکمراں خاندان اور 'معین' دور کے لیے استعمال کی ہے۔ طبقات کی ساخت پر تاریخ قلمبند کرنے کا اہتمام خالصتاً مسلم مورخین کی اختراع ہے۔ ''طبقات ناصری'' ایک عمومی تاریخ ہے جو حضرت آدمؑ سے لے کر دہلی سلطنت کے سلطان ناصر الدین محمود کے پندرہویں سال جلوس یعنی 1260ء تک کے واقعات و حادثات کے تذکرے پر مبنی ہے۔ جیسا کہ قاضی منہاج سراج نے ''طبقات ناصری'' کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ ''اس ضعیف (قاضی منہاج) کے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ جدولوں میں لکھی ہوئی یہ تاریخ اسلام عرب و عجم کے تمام پہلے اور آخری سلطانوں اور بادشاہوں کے ذکر سے مزین کردے اور ہر ایک حکمراں خاندان کی شمع اس انجمن میں روشن ہو جائے۔ ہر ایک نسب کے بادشاہوں کے سر پر آثار و احوال کے بیان کی کلاہ سی کر رکھ دی جائے۔ چنانچہ یمن کے تبابعہ (فرمانرواؤں)، حمیر کے بادشاہوں اور خلفاء کے ذکر کے بعد خاندان آل بویہ، طاہریوں، صفاریوں، سلجوقیوں، رومیوں اور شنسبانیوں (جو غور، غزنی اور ہندوستان کے سلطان تھے)، خوارزم شاہیوں، کرد بادشاہوں (جنہوں نے شام میں فرمانروائی کی)، معزی سلطانوں اور بادشاہوں (جو غزنی اور ہندوستان کے تخت کی زینت بنے رہے) کے حالات موجودہ حکمرانی اور التتمش خاندان کی سلطنت کے عہد تک لکھ دوں، التتمش کی سلطنت کے تاج و تخت کا وارث سلطان معظم ناصر الدینا والدین ابو المظفر محمود بن السلطان التتمش یمین خلیفۃ اللہ قیم امیر المومنین (اللہ تعالیٰ اس کا دبدبہ و شکوہ ہمیشہ قائم رکھے) ہے۔ چنانچہ یہ تاریخ لکھی گئی ہے اور اسی بادشاہ کے مبارک لقب اور نام سے اس نے زینت پائی، یعنی اس کا نام ''طبقات ناصری'' رکھا گیا۔''

منہاج سراج نے 'طبقات ناصری' کو 658ھ/1260ء میں تحریر کیا تھا اور جس کو اس نے سلطان ناصر الدین محمود کے نام معنون کیا۔ عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ کے تناظر میں 'طبقات ناصری' میں خاندان غزنوی، خاندان غوری اور مملوک سلاطین ہند کے متعلق حصے نہایت اہم ہیں۔ اس کا اسلوب نگارش سادہ و سلیس ہونے کے ساتھ ساتھ بڑا پختہ اور استوار ہے۔ غلام رسول مہر لکھتے ہیں کہ ''طبقات ناصری کے بعض حصے بہت بیش بہا ہیں۔ مولانا (منہاج سراج) نے خراسان، غور اور ہندوستان کے متعلق بعض ایسی معلومات فراہم کردی ہیں جو میرے محدود علم کے مطابق کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتی۔ انھیں پر طبقات ناصری کی حقیقی اہمیت قائم ہے۔''

پروفیسر اشتیاق حسین قریشی لکھتے ہیں ''منہاج الدین بن سراج الدین کی 'طبقات ناصری' مسلم تاریخ کا خلاصہ ہے مگر وہ متعدد سلاطین دہلی کی حکومتوں کے واقعات زیادہ تفصیل سے لکھتا ہے۔ وہ اپنی تاریخ کو 658ھ/1260ء تک لاکر ختم کرتا ہے جب کہ ناصر الدین محمود تاجدار تھا۔ منہاج کچھ عرصہ مملکت کا قاضی القضاہ رہا تھا مگر بد قسمتی سے حکومت کا نظم و نسق اس کی دلچسپی کا موضوع نہیں تھا۔ بہر حال، سربرآوردہ امراء کے جو خاکے اس نے قلم بند کیے ہیں وہ مفید ہیں۔ کیونکہ اس نے ان کی زندگیوں کے مختلف مراحل کو مجملاً بیان کیا ہے۔ ان میں سے بہت سوں نے اپنی زندگی کا آغاز محل کے معمولی غلاموں کی حیثیت سے کیا تھا۔ اس طرح ان عہدوں اور اسامیوں کا تصور کرنا ممکن ہو گیا جن سے وہ امراء اپنی ترقی کے دوران گذرے تھے۔''

قاضی منہاج سراج کا انتقال تقریباً 664ھ/1265ء میں ہوا تھا مگر اس نے اپنی تاریخ میں 658ھ/1260ء تک کے واقعات

وحالات ہی تحریر کیے ہیں۔ اے۔ بی۔ ایم حبیب اللہ رقمطراز ہیں ''حالانکہ بلبن کی تخت نشینی کے وقت تک مصنف زندہ رہا۔ مگر یہ بد قسمتی ہے کہ اس نے اپنی تاریخ کو سلطان ناصر الدین محمود کی وفات تک نہیں پہنچایا، اس وجہ سے 658ھ/1260ء سے 664ھ/1265ء کے درمیانی عہد کی تاریخ میں ایک ایسا خلاء رہ گیا جسے بعد کے کسی بھی مورخ نے یا مصنف نے پر نہیں کیا ہے۔ محمد قاسم فرشتہ، عین الدین بیجاپوری کی ایک تصنیف کا حوالہ دیتا ہے جس کا نام ''ملحقات طبقات ناصری'' ہے اور جس سے وہ کچھ معلومات اخذ کرتا ہے جو کسی دوسری جانی پہچانی تواریخ میں نہیں ملتی ہیں۔ مگر آج نہ تو کوئی 'ملحقات' سے واقف ہے اور نہ ہی اس کے مصنف سے۔ فرشتہ ایک دوسرے مصنف صدر جہاں گجراتی کے حوالے بھی دیتا ہے مگر یہ مصنف بہر حال آخر پندرہویں صدی عیسوی کا ہے۔ اس وجہ سے بقیہ عہد کے لیے ہمارا سارا دار و مدار صرف 'تاریخ فیروز شاہی' کے مصنف ضیاء الدین برنی پر ہے۔'' ہندوستان میں ترکوں کی فتوحات سے لے کر سلطان ناصر الدین محمود کے پندرہویں سال جلوس تک کے سیاسی واقعات و حادثات کے لیے 'طبقات ناصری' ایک اہم تاریخ ہے جس میں سلطان ناصر الدین محمود کے واقعات کو سال بہ سال کی ترتیب زمانی کے لحاظ سے تحریر کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ قاضی منہاج نے اس عہد کے امراء و ملوک کے سوانحی خاکے بھی قلم بند کیے ہیں جس سے امراء و ملوک کی کارکردگی، کردار اور شخصیت پر روشنی پڑتی ہے اور اس عہد کی سیاست و درباری سازشوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

7.3 منہاج سراج کے حالات زندگی (Minhaj-Siraj's Biography)

قاضی ابو عمرو منہاج الدین عثمان بن سراج الدین جوزجانی 589ھ/1193ء میں فیروز کوہ میں ایک مذہبی و علمی خانوادے میں پیدا ہوا تھا جو قاضی منہاج سراج کے نام سے معروف ہے۔ فیروز کوہ اس زمانے میں خاندان غوری کا پایۂ تخت تھا۔ منہاج کے والد مولانا سراج الدین کو ان کی علمی لیاقت کی وجہ سے تذکرہ نگار ''ملک الکلام، فصیح العجم'' اور مصنف انھیں ''افصح العجم'' اور ''اعجوبۃ الزمان'' کے نام سے پکارتا ہے۔ قاضی منہاج سراج کے دادا کا نام بھی منہاج الدین عثمان بن ابراہیم بن امام عبدالخالق الجوزجانی تھا۔ فیروز کوہ افغانستان کے صوبہ غور میں واقع ہے۔ یہ شہر 1220ء کے دہے میں منگولوں کے ہاتھوں تباہ ہو گیا تھا۔ منہاج کے خاندان کا تعلق جوزجان سے تھا جو بلخ کے نواح میں واقع تھا۔ جوزجان اس زمانے میں عمدہ چمڑے کی دباغت کے لیے بھی مشہور تھا۔ اس کا شمار خراسان کے بڑے شہروں میں ہوتا تھا۔ جوزجان کے شمال میں دریائے جیحون، مغرب میں غور اور بُست، مشرق میں بامیان اور مغرب میں یہ علاقہ گرجستان (غرجستان) سے ملحق ہے۔

منہاج سراج کے جد امجد امام عبدالخالق (451ھ/1059ء-492ھ/1099ء) پہلے شخص تھے جو جوزجان سے غزنی ہجرت کر گئے تھے۔ یہ بڑے متقی و فقیہ نیز روحانی عالم کے طور پر مشہور تھے۔ ان کی شادی سلطان ابراہیم غزنوی کی بیٹی سے ہوئی تھی جن سے منہاج کے پردادا ابراہیم تولد ہوئے تھے۔ ابراہیم کے بیٹے اور قاضی منہاج سراج کے دادا منہاج الدین عثمان تھے اور ان کے بیٹے مولانا سراج الدین تھے جو منہاج کے والد بزرگوار تھے۔ اس خاندان کو دربار غزنی میں بڑا احترام اور عزت حاصل تھی۔ 582ھ/1186ء میں سلطان معزالدین محمد شہاب الدین غوری نے لاہور فتح کے بعد مولانا سراج الدین کو لشکر کا قاضی مقرر کیا تھا اور بارہ اونٹ ان کا ذاتی اور سرکاری سامان

اٹھانے کے لیے مقرر کیے گئے تھے۔ 588ھ /1192ء میں سلطان بہاء الدین سام غوری نے سلطنت کا عہدہ قضائ، خطابت ، شرعی احتساب اور اوقاف و مدارس کا انتظام مولانا سراج الدین کے سپرد کیا تھا۔ بعدازاں بحیثیت سفیر ان کو دربار سیستان بھی بھیجا تھا۔ ان کا انتقال کرمان میں 592ھ /1196ء میں ہوا تھا۔ مولانا سراج الدین عالم، شاعر اور صاحب سیاست داں تھے۔ غوری سلطنت میں یہ خاندان منصب قضاء پر فائز رہا تھا۔

منہاج سراج کی ابتدائی زندگی کے حالات کا تفصیلی تذکرہ تو ہمیں نہیں ملتا مگر 'طبقات ناصری' کے مطالعہ سے ان کی ذاتی، سفارتی اور سیاسی زندگی کے تعلق سے جابجا حوالے ملتے ہیں۔ قاضی منہاج کا خاندان شروع سے ہی سلاطین سے وابستہ رہا تھا لہٰذا اس کی تربیت بھی سیاسی و سفارتی انداز میں ہوئی تھی۔ قاضی منہاج کی والدہ سلطان غیاث الدین غوری کی بیٹی ماہ ملک کے محل میں رہتی تھیں۔ زمانہ بلوغت تک قاضی منہاج کی تعلیم و تربیت اسی کے محل میں ہوئی تھی کیونکہ اس کے والد مولانا سراج الدین کی شادی قلعہ تولک ہرات کے ایک مشہور علمی خاندان میں ہوئی تھی یہ خاتون سلطان غیاث الدین غوری کی شہزادی کی رضاعی بہن اور ہم مکتب تھی۔ ان کے ہی بطن سے 589ھ /1193ء میں منہاج سراج پیدا ہوا تھا۔ منہاج سراج لکھتا ہے کہ ''اس ملکہ جہاں (ماہ ملک) نے اس ضعیف (منہاج) کی پرورش اپنی آغوش شاہی میں مثل اپنے فرزندوں کے شاہانہ طریقے پر کی اور میں ان کی نگرانی میں تربیت پاتا تھا۔'' منہاج سراج کا ماموں قاضی جلال الدین مجد الملک احمد بن عثمان تھا جو تاتاریوں کے حملے میں مارا گیا تھا۔

منہاج سراج نے سات سال کی عمر میں قرآن شریف حفظ کرنے کے لیے مولانا امام علی غزنوی کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا۔ منہاج نے مولانا امام علی سے شنیدہ واقعات کو 'طبقات ناصری' میں ان کے الفاظ میں لکھا ہے، جس سے منہاج کی یادداشت اور قوت حافظہ کا پتہ چلتا ہے۔ بائیس سال (611ھ /1214ء) کی عمر تک منہاج سراج کا تحصیل علم کا سفر فیروز کوہ میں جاری رہا تھا۔ فراغت علم کے بعد مختلف شہروں کی سیاحت بھی کی۔ چوبیس سال کی عمر میں سلطان غور نے قاضی منہاج کو سیستان (مقام بُست) کے دربار میں اپنے سفیر کی حیثیت سے بھیجا تھا۔ اس واقعہ سے اس کی کم عمری میں ہی سفارتی و سیاسی بصیرت و صلاحیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ 617ھ /1220ء میں جب چنگیز خان نے ہرات پر حملہ کیا تو منہاج ہرات میں موجود تھا۔ اس زمانے میں اس کی طبیعت شاعری کی طرف مائل تھی اور نہایت عمدہ فارسی اشعار کہا کرتا تھا۔ نوجوانی میں ہی منہاج سراج کی شخصیت ایک پختہ کار و مدبر سیاست داں کی بن گئی تھی جس کا اعتراف سلاطین غور کو بھی تھا کیونکہ ان کی جانب سے 623ھ /1226ء تک منہاج نے ایک قاصد اور سفیر کی حیثیت سے کئی بار فراح، سیستان اور قہستان کی طرف سفر کیا۔

'طبقات ناصری' کے مطالعہ سے علم ہوتا ہے کہ 620ھ /1223ء تک منہاج سراج قلعہ تولک ہرات میں مقیم تھا۔ اس زمانے میں چنگیز خان اور منگولوں کی غارت گری اس علاقے میں جاری تھی۔ خراسان کے ان ابتر اور غیر یقینی سیاسی حالات میں منہاج نے 623ھ 1226ء میں ہندوستان جانے کا ارادہ کیا۔ 624ھ /1227ء کے اوائل میں سیستان و خراسان ہوتے ہوئے اوچھ سندھ پہنچا جو ناصر الدین

قباچہ کادارالحکومت تھا۔ جس نے منہاج کی مدبرانہ وعلمی شہرت سے متاثر ہو کر فقط 35 پینتس سال کی عمر میں اوچھ کے مدرسہ فیروزی کا صدر معلم اور اپنے بیٹے بہرام شاہ بن ناصر الدین قباچہ کے لشکر کا قاضی بنادیا۔ 625ھ/1228ء میں جب سلطان التتمش نے اوچھ کو فتح کیا تو قاضی منہاج نے سلطان التتمش سے وابستگی اختیار کرلی اور اس کے ساتھ دہلی آگیا۔ قاضی منہاج حکمرانوں وامراء کا زبردست مزاج شناس اور نبض شناس تھا۔ 629ھ/1232ء میں جب سلطان التتمش نے گوالیار فتح کیا تو قاضی منہاج بھی اس کے ہمراہ تھا جس نے قاضی منہاج کو 630ھ/1232ء میں کالپور، گوالیار کے قاضی وخطیب، محتسب وامام اور امور شرعیہ کے عہدہ سے سرفراز کیا۔ اس منصب پر وہ چھ سال تک فائز رہا۔ سلطان رکن الدین فیروز شاہ اور سلطان رضیہ نے بھی اس منصب پر برقرار رکھا۔ 635ھ/1238ء میں منہاج دہلی آگیا تو سلطان رضیہ نے گوالیار کے عہدہ قضاء کے ساتھ مدرسہ ناصریہ کا متہم اور شیخ الجامع کا منصب بھی تفویض کیا۔ 637ھ/1239ء میں سلطان معز الدین بہرام شاہ کی تخت نشینی کے وقت، قاضی منہاج دہلی میں موجود تھا۔ اس موقع پر اس نے ایک تہنیتی قطعہ بھی پیش کیا تھا۔ سلطان التتمش کی موت کے بعد دہلی سلطنت میں جو سیاسی خلفشار وبد نظمی پیدا ہوئی نیز امراء وملوک کی گروہ بندی اور سازشوں کا جو ماحول ابھر کر سامنے آیا تھا اس کو روکنے میں قاضی منہاج نے بڑی دیانتداری سے اپنا کردار نبھانے کی کوشش کی اور اپنی سیاسی ومدبرانہ صلاحیت کا ثبوت دیا، جس سے متاثر ہو کر سلطان بہرام شاہ نے 639ھ/1241ء کو اس کو سلطنت کا قاضی مقرر کر دیا۔ ان حالات میں منہاج کے مخالفین و حاسدین کی جانب سے 7 ذیقعدہ 639ھ/9 مئی 1242ء جمعہ کے دن جامع مسجد میں بعد نماز جمعہ اس پر قاتلانہ حملہ بھی ہوا جس میں وہ بچ گیا۔ لیکن 14 ذیقعدہ 639ھ/16 مئی 1242ء کو سلطان بہرام شاہ کے بعد جب سلطان علاءالدین مسعود شاہ بن فیروز شاہ کو دہلی سلطنت کے تخت پر بٹھایا گیا تو قاضی منہاج سراج کو مستعفی ہونا پڑا تھا۔ اس زمانے میں دہلی کے حالات قاضی منہاج کے لیے سازگار نہ تھے اس لیے اپنے اہل خانہ کے ساتھ لکھنوتی بنگال ہجرت کرنی پڑی۔ یہاں کے حاکم طغان خان عزالدین طغرل نے اس کو خوش آمدید کہا۔ دو سال بعد 643ھ/1245ء میں یہ طغان خان کے ساتھ دہلی واپس آیا اور الغ خان (سلطان بلبن) کے توسل سے سلطان علاءالدین مسعود شاہ نے قاضی منہاج کو مدرسہ ناصریہ کا نگراں، جامع مسجد دہلی کا خطیب اور اوقاف کے متولی کے ساتھ گوالیار کا قاضی مقرر ہوا۔ جب سلطان مسعود شاہ کے بعد ناصر الدین محمود سلطان بنا تو قاضی منہاج سراج کی توقیر وعزت میں اضافہ ہو گیا۔ کیونکہ سلطان ناصر الدین محمود اور اس کے وزیر ممالک الغ خان (بلبن)، دونوں ہی اس کے بڑے قدردان تھے۔ جنہوں نے اس پر بڑی نوازشات کی تھیں۔ قاضی منہاج سراج نے اپنی تاریخ ''طبقات ناصری'' اسی سلطان کے نام معنون کی ہے اور اپنی ایک نظم ''ناصری نامہ'' بھی سلطان کی مدح وتعریف میں لکھی تھی۔ جب 648ھ/1250ء میں قاضی القضاۃ مولانا جمال الدین کاشانی کا انتقال ہوا تو الغ خان (بلبن) کی سفارش پر سلطان ناصر الدین محمود نے قاضی منہاج سراج کو ہندوستان کا قاضی القضاۃ مقرر کیا لیکن 651ھ/1253ء میں الغ خان (بلبن) اور ناصر الدین محمود کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے تو بلبن کی جگہ نظام الملک جنیدی کو وزیر ممالک بنایا گیا لہٰذا قاضی منہاج کو بھی اپنے منصب سے معزول ہونا پڑا۔ 652ھ/1254ء میں بلبن دوبارہ وزیر ممالک کے عہدہ پر بحال ہوا تو قاضی منہاج کو بھی صدر جہاں کو عہدہ ملا، بعدہٗ 623ھ/1235ء میں قاضی منہاج سراج کو تیسری مرتبہ قاضی القضاۃ کے عہدہ پر فائز کیا گیا۔

غیاث الدین بلبن قاضی منہاج کا بڑا مربی تھا۔ قاضی منہاج کی دربار سلطانی میں قدر و منزلت کا اندازہ ایک واقعہ سے باآسانی لگایا جا سکتا ہے کہ جب 647ھ /1249ء میں قاضی منہاج کی بہن کا ایک خط خراسان سے آیا تھا جس میں انہوں نے اپنی معاشی پریشانیوں کا ذکر کیا تھا۔ اس خط کا علم جب غیاث الدین بلبن کو ہوا تو اس نے ایک خلعت شاہی، زربفت کا جامہ، ایک گھوڑا مع مرصع زین، ایک گاؤں اور ایک ہزار جیتل اور بارگاہ شاہی سے 40 چالیس غلام منہاج کی بہن کے لیے خراسان بھجوائے تھے، دیگر امراء نے بھی تحائف دئے تھے۔

قاضی منہاج سراج کی زندگی کے آخری دور کے واقعات کا ذکر نہ تو خود قاضی منہاج نے 'طبقات ناصری' میں کیا ہے نہ ہی کسی ہم عصر تذکرہ نگار نے کیا۔ 'طبقات ناصری' کے مطالعہ سے یہ تو واضح ہوتا ہے کہ وہ آخر زندگی تک قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز رہا تھا۔ 'طبقات ناصری' کی تکمیل ماہ شوال 658ھ /1260ء میں ہوئی۔ ایک اندازہ کے مطابق قاضی منہاج سراج کا انتقال 664ھ /1265ء کے قریب ہوا تھا۔

قاضی منہاج کی شخصیت گوناگوں صفات کی حامل تھی۔ وہ بیک وقت جید مذہبی عالم، فارسی و عربی کا شاعر، مورخ، ادیب، قاضی، بااثر خطیب و واعظ اور معلم و منتظم تھا۔ نہایت عمدہ فارسی زبان کا ادیب جو استادی کا درجہ رکھتا تھا۔ تیرہویں صدی عیسوی میں دہلی میں علماء و صوفیاء کے درمیان 'سماع' ایک بڑا اختلافی مسئلہ تھا۔ قاضی منہاج جس کا تعلق طبقہ علماء سے تھا لیکن صاحب ذوق شخص تھا، سماع کے شوقین تھا اور سماع کے دوران ان پر وجد طاری ہو جاتا تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاء کے مطابق دہلی میں قاضی حمید الدین ناگوری اور قاضی منہاج سراج سماع کے رواج کو فروغ دینے کے لیے ذمہ دار تھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے بھی منہاج سراج کو یگانہ روزگار فاضلوں میں اور اہل وجد و سماع میں شمار کیا ہے۔ قاضی منہاج سراج ایک زبردست اور بااثر خطیب بھی تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاء ہر پیر کے دن قاضی منہاج کا وعظ سننے کے لیے جاتے تھے۔

7.4 مورخ کے ذرائع معلومات (Historian's Sources of Information)

قاضی منہاج سراج کا تعلق ایک ممتاز مذہبی و علمی خانوادے سے تھا جو خود بھی اپنے وقت کا بہترین عالم، مبلغ، خطیب اور منتظم تھا جو اچھ کے مدرسہ فیروزی کا نگراں (1227ء)، افسر قانون اور مذہبی، اخلاقی و قانونی امور کی تبلیغ کا ناظم (1232ء)، دہلی کا قاضی (1241ء)، دہلی کے مدرسہ ناصریہ کا نگراں اور اس کی جائیداد و املاک کا منتظم، گوالیار کا قاضی، دہلی کی جامع مسجد میں مبلغ (1244-1245ء) صدر جہاں، قاضی القضاۃ اور حاکم فوجدار (1241-1243ء) جیسے اہم عہدوں پر فائز رہا تھا۔ اس الحاظ سے سلطنت کے مختلف اور دور دراز علاقوں سے متعلق صحیح اور درست معلومات حاصل کرنے کے عمدہ مواقع میسر تھے ان سب باتوں نے اس کی کتاب پر اثر ڈالا جو بڑی فاضلانہ اور مداحانہ تصنیف ہے۔ خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں ''اس وقت جب علماء سیاست کی گندی دلدل میں افراتفری کا شکار تھے تو منہاج نے اس سے کنارہ کش ہونے کی کوشش نہیں کی۔''

قاضی منہاج سراج نے ''طبقات ناصری'' کو اپنے ذاتی مشاہدہ، شنیدہ واقعات اور کتابوں کے حوالے سے تحریر کیا ہے اور اپنی کتاب میں جگہ جگہ بطور سند اپنے ماخذ و منابع کی وضاحت کی ہے۔ ساتھ ہی مندرجہ ذیل کتابوں کی مکمل تفصیل و فہرست پیش کی ہے جو ''طبقات ناصری'' لکھتے وقت اس کے سامنے تھیں: سلامی، تکملۃ الطائف، تاریخ بیہقی، احداث الزمان، سنن ابو داؤد، سجستانی، البدو والتاریخ، تالیف مقدسی، تاریخ یمینی، قانون المسعودی، تاریخ مجدول، عمادی، منتخب تاریخ ناصری، نسب نامہ غوریان، تاریخ ابن الہیثم نابی، کتاب اغانی، صابی۔ ساتھ ہی قاضی منہاج نے اپنے عہد کے ثقہ اور قابل یقین واعتماد افراد سے سنے واقعات اور خود کے مشاہدات پر مبنی واقعات کو شامل کتاب کیا۔ مثلاً وسط ایشیاء سے متعلق غوریوں کی سلطنت کے واقعات، منگولوں و چنگیز خاں کی یلغار، غور و تولک وغیرہ کے واقعات، وہاں کے امراء و ملوک کے حالات وغیرہ اس کے ذاتی مشاہدات پر مبنی تھے۔ ان میں سے بہت سے معاملات و واقعات جیسے صفاریوں، غوریوں، سیستان کے غزنوی سلاطین اور سلطان التتمش اور اس کے جانشینوں نیز ان کے امراء و ملوک کے حالات جن کے لکھنے میں اس کو اولیت حاصل ہے، میں قاضی منہاج خود مشاہد اور شریک کار تھا۔ وہ واقعات و حادثات جن کے متعلق اس نے لوگوں سے سنا تھا، ان کو نقل کرتے وقت راوی کا حوالہ ضرور دیا ہے۔ وہ خود لکھتا ہے کہ ''جس قدر کہ دائرہ سماع و نقل میں اس دعا گو کے لیے ممکن تھا وہ تحریر میں لایا۔''

قاضی منہاج سراج اپنی پوری عملی زندگی میں چاہے وہ وسط ایشیاء ہو یا دہلی سلطنت، حکومت کے اعلیٰ مناصب پر فائز رہا تھا اور دربار و سلاطین سے براہ راست تعلق کے ساتھ ان کے درباروں سے وابستہ امراء و ملوک سے اس کے ذاتی تعلقات نے اسے واقعات کو صحیح تناظر میں سمجھنے میں مدد کی ہوگی۔ دہلی سلطنت میں خراسان وماوراء النہر سے آنے والے افراد بھی قاضی منہاج کے منابع و راوی تھے، جن کی روایات کو اس نے ''طبقات ناصری'' میں ان ہی لوگوں کی سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔ جیسے طبقہ 12 کے ذکر سنجر میں بعض واقعات کے راوی امیر علی چاؤش جن سے فیروز کوہ میں سن 611ھ/1214ء میں منہاج کی ملاقات ہوئی تھی۔ طبقہ 12 میں ہی الپ ارسلان کے ذکر میں قاضی منہاج نے امام رشید الدین بن عبد المجید سے سیستان میں 613ھ/1216ء میں ہوئی ملاقات کے دوران روایت کیے گئے واقعات کو رقم کیا ہے۔ طبقہ 20 میں محمد بختیار کے ذکر میں بعض باتوں کے راوی صمصام الدین فرغانی اور معتمد الاولہ مقبل رکابی ہیں۔ طبقہ 23 میں ذکر اوکتائی میں قاضی منہاج کے استاد مولانا امام غزنوی ان کے راوی ہیں۔ طبقہ 22 کے ذکر یوزبک طغرل کے بیان میں قاضی منہاج نے اس کے قابل اعتماد غلاموں کے حوالے سے واقعات کو قلمبند کیا ہے۔ طبقہ 23 میں ذکر حکایت عجیب اور ذکر برکا میں قاضی منہاج نے خواجہ مقبول القول رشید الدین حکیم اور سید اشرف الدین بن سید جلال الدین صوفی سمرقندی جو سن 657ھ/1259ء میں تجارت کی غرض سے ہندوستان آئے تھے، ان کے حوالے سے تحریر کیا ہے۔ طبقہ 23 کے ذکر چنگیز خاں اور وقائع اسلام میں قلمبند واقعات کے راوی سید بزرگ بہاء الدین رازی اور خواجہ احمد وخشی ہیں جو نہایت صادق القول تھے۔ طبقہ 23 کے آخر ذکر چنگیز خاں میں ملک رکن الدین کے بیٹے خسیار غور اور طبقہ 23 ذکر شہر ہائے خراسان میں قاضی امام وحید الدین خوشنجی جن سے قاضی منہاج نے 622ھ/1225ء میں قہستان میں ملاقات کی تھی، کے حوالے سے تحریر کیا ہے۔ طبقہ 23 ذکر مراجعت چنگیز خاں میں قاضی منہاج کے راوی خسرو غور برادر ملک تاج الدین حبشی نے جس سے 618ھ/1221ء میں قلعہ سنگھ غور میں ہوئی ملاقات کے دوران واقعات کو روایت کیا تھا۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ قاضی منہاج کے لیے وقوع پذیر سیاسی واقعات وحالات کو بہتر انداز میں سمجھنا ممکن تھا۔اس کے وسط ایشیاء سے گہرے روابط اور ہندوستان میں اہم مناصب پر فائز رہنے کے سبب راست طور پر شنیدہ و چشم دید حالات و واقعات کی مکمل جانکاری حاصل تھی جس کو اس نے ''طبقات ناصری'' میں قلمبند کیا ہے۔ان ہی اسباب کی وجہ سے یہ ایک انتہائی اہم ماخذ و منابع نیز بڑی اہمیت کی حامل تاریخ ہے۔ حالانکہ بعض مواقع پر اس کے بیانات میں غلطیاں بھی ہوئیں ہیں، باوجود اس کے، قاضی منہاج نے ''طبقات ناصری'' میں واقعات کو ایک تسلسل کے ساتھ تحریر کیا۔ جس میں تاریخیں، مہینے اور دن تک صحیح لکھے ہیں۔ ساتھ ہی اس نے سلطانوں کے سال جلوس، سال وفات اور مدت حکمرانی کا صحیح تعین کرنے کا بھی اہتمام کیا ہے۔

7.5 منہاج سراج کا فلسفۂ تاریخ (Minhaj-Siraj's Philosophy of History)

قاضی منہاج سراج ایک مذہبی عالم، سفارت کار، مورخ اور اپنے عہد کی سیاست کا ایک سر گرم رکن تھا جو اپنے عہد کی سیاست سے کنارہ کش نہیں ہوا تھا بلکہ اس سیاست کا ہمیشہ ایک حصہ بنا رہا۔ خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں، ''منہاج کا خاندانی پس منظر اور اس کے حالات زندگی، ایک مورخ کی حیثیت سے اس کا تاریخ کے تئیں نظریہ طے کرتے ہیں۔اس کی شخصیت سازی میں بہت سے سیاسی، سماجی اور مذہبی عوامل کار فرما تھے نیز اس دور کی مذہبی اور سیاسی مشکلات کے تئیں اس کے رویہ کے لیے ذمہ دار تھے۔ منہاج وسط ایشیاء اور ہندوستان پر منگولوں کے پے در پے یلغار سے یہ محسوس کرتا ہے کہ شاید دنیا اب ختم ہو جائے گی، اسی لیے وہ آدمؑ سے اپنی تاریخ کی شروعات کرتا ہے اور اپنے دور تک کے حالات کو ضبط تحریر میں لاتا ہے۔''

تاریخ کے متعلق قاضی منہاج سراج لکھتا ہے ''ایک کتاب میری (قاضی منہاج) نظر سے گذری جس میں گزرے ہوے اہل علم نے بعد میں آنے والی نسلوں کے ''ذکر و عبرت'' کے لیے ''انبیاء کے حالات اور نسب نامے'' جمع کر دئے تھے۔ نیز زمانہ ماضی کے ''فرمانرواؤں'' کے واقعات (اللہ تعالیٰ ان کی قبروں کو روشن کرے) لکھ دئے تھے۔ لیکن یہ سب کچھ جدولوں کی شکل میں مدون کیا تھا اور کتاب خاندان ناصر الدین سبکتگین کی بادشاہی کے دوران اختصار سے مرتب ہوئی تھی۔اس میں ہر باغ سے ''پھول اور ہر سمندر سے قطرہ'' لے لیا گیا تھا۔''

منہاج کے نزدیک ''تاریخ واقعات و فتوحات کا رقم کرنا ہے، یعنی وہ واقعات جن کا مورخ بہ ذات خود مشاہدہ کرے یا جن کی معلومات معتبر و ثقہ راویوں سے حاصل ہو۔'' فی الحقیقت قاضی منہاج علم تاریخ کو ''ذکر و عبرت'' کا ایک ذریعہ سمجھتا ہے جس کے ذریعہ حال کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔اسی لیے وہ اپنی تاریخ کا تانا بانہ ''انبیاء، خلفاء اور فرمانرواؤں'' کے واقعات و حادثات کے ارد گرد تیار کرتا ہے۔ ساتھ ہی وہ تاریخ کو مسلم علاقوں و ممالک اور حکمرانوں کے پس منظر میں دیکھتا ہے اور اپنی تاریخ میں اقتدار کی ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں منتقلی کو بیان کرنا پسند کرتا ہے، کیونکہ اس کا ایک خاص مقصد فوجی مہمات اور اس دور کی حکمت عملی کو بیان کرنا تھا۔ دراصل اس دور میں بادشاہ، اس کا دربار، امراء و ملوک، فوجی مہمات، درباری سازشیں، وغیرہ ہی فارسی تاریخ نویسی کا محور و مرکز تھے۔ عوام الناس کے حالات، ثقافتی و سماجی و

مذہبی زندگی جیسے موضوع فارسی تاریخ نویسی کے باضابطہ موضوع نہیں تھے۔ لہٰذا تاریخ کا سارا تصور سیاسی و فوجی بن کر رہ جاتا تھا۔ اسی لیے عہد وسطیٰ کے بہت سے فارسی مورخین نے تاریخ انعام واکرام کے لالچ، نام ونمود اور شہرت کی خاطر، تاریخ کو عبرت آمیز، ناصحانہ، ستائشی و توصیفی اور مداحانہ انداز میں مبالغہ آرائی کے ساتھ تحریر کیا۔ ''طبقات ناصری'' لکھتے وقت قاضی منہاج کے پیش نظر بھی یہ عوامل کارفرما تھے۔ وہ لکھتا ہے ''خالق بزرگ و برتر کے فضل عام کی برکت سے پختہ امید ہے کہ جب یہ نسخہ (طبقات ناصری) اس بادشاہ جہاں (سلطان ناصر الدین محمود) کی نظر مبارک سے مشرف ہوگا، جو اہل ایمان کی پناہ ہے (اللہ تعالیٰ اس کے جلال کا پرچم بلند تر کرے) تو قبول کی سعادت پائے گا۔ آسمان انعام کی بلندی اور چرخ اکرام کی رفعت سے شاہانہ لطف و نوازش کی روشنی اس ضعیف پر چمکے گی۔ جب میں اس عارضی قیام گاہ (دنیا) سے رخصت ہو جاؤں گا تو یہ کتاب پڑھنے والے مجھے دعائے خیر میں یاد رکھیں گے۔ اگر کسی غلطی یا لغزش سے آگاہ ہوں گے تو اسے عفو کے دامن میں چھپالیں گے۔ بہر حال میں نے تاریخ کی معتبر کتابوں میں جو کچھ پایا۔ لکھ دیا۔''

فی الواقع قاضی منہاج تاریخ کی افادیت واہمیت سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ آنے والی نسلوں کے لیے تاریخ کو قلمبند کرنا بہت ضروری ہے تاکہ ماضی کے واقعات تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہو جائیں جس سے وہ مستقبل میں فائدہ اٹھا سکیں۔

7.6 حقائق کی تعبیر (Interpretation of Facts)

قاضی منہاج کی ''طبقات ناصری'' ایک عمومی تاریخ ہے جو حضرت آدمؑ سے لے کر سلطان ناصر الدین محمود کے پندرہویں سال جلوس تک کے واقعات کا احاطہ کرتی ہے۔ لیکن اس کی اصل قدر و قیمت ہندوستان میں ترکوں کی فتوحات اور اس کے نتیجے میں قائم سلطنت کے واقعات و حالات کے عینی تذکرے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی ذہن نشین رہنا ضروری ہے کہ سلطان ناصر الدین محمود اور الغ خان (بلبن) قاضی منہاج کے مربی و سرپرست تھے۔ قاضی منہاج دہلی سلطنت میں اعلیٰ مذہبی اور عدالتی عہدوں پر فائز رہا تھا اور بہت سے معاملات کا وہ چشم دید اور شریک کار بھی تھا۔ اس تعلق سے اے۔ بی۔ ایم۔ حبیب اللہ لکھتے ہیں، ''یہی وجہ ہے کہ تصنیف میں ذاتی تعصب اور جانب داری کی جھلک نظر آتی ہے، وہ غوریوں اور التتمش کے خاندان کا طرف دار تھا۔ منہاج بہت سے مقامات پر ان حقائق کو چھپا جاتا ہے جو اس کے مربی الغ خان (بلبن) اور سلطان ناصر الدین محمود کے حق میں نہیں ہوتے۔ جہاں تک حقائق کا تعلق ہے وہ عام طور پر صحیح ہیں مگر تفصیلات کے فراہم کرنے میں اس نے نہایت اختصار سے کام لیا ہے اور بعض مقامات پر تو اس نے متضاد بیانات بھی دئے ہیں۔ مگر اس کے باوجود اصل ماخذ کی حیثیت سے اس کی قدر و قیمت کو کم نہیں کیا جا سکتا۔''

منہاج سراج کی 'طبقات ناصری' دعا گوئی اور مداحی کا ایک نمونہ بھی ہے، جس میں اس نے اپنے مربیوں و ممدوحین سے انعام و نوازش اور ذاتی منافع کے لیے ستائش و توصیف کی انتہا کر دی۔ مثلاً الغ خاں (بلبن) کی تعریف میں رقمطراز ہے: ''اگر ہزار جزو کاغذ مقروض اس کے پسندیدہ اوصاف اور برگزیدہ اخلاق کے بیان کرنے میں تحریر میں لائے جائیں، تب بھی اس دریائے بیکراں کا ایک قطرہ اور اس کے گلستان فردوس کی خوشبو کی ہواؤں کا ایک شمہ، سننے اور پڑھنے والوں تک نہیں پہنچ سکتا۔ اگر سو ہزار میں سے اس کے ان حقوق تربیت میں چند کو

بیان کروں، جو اس دعا گو کے بارے میں بصورت مناصب واشغال وانعامات واکرام فرمائے گئے ہیں اور فرماتے رہتے ہیں، تب بھی ان نعمتوں کے حقوق اس ضعیف کے ذمے اور اس کی اولاد واحفاد کے ذمے باقی رہیں گے۔'' یا پھر ''اس کتاب (طبقات ناصری) کے پڑھنے والوں اور ناظرین سے دعا کی امید ہے اور ارباب دولت سے اعزاز وعطا کی امید۔''

قاضی منہاج کی اس انعام ونوازش کی طمع نے انھیں ایک فریق بننے، جانب داری اور طرف داری کرنے پر مجبور کیا اور اس وجہ سے تاریخی واقعات وحادثات کی تنقید وتحقیق کرنے سے انہوں نے گریز کیا۔ مثال کے طور پر طبقہ 21 میں سلطان التتمش کے ذکر میں قاضی منہاج نے لکھا ہے کہ جب تاج الدین یلدوز کا لشکر خوارزم شاہ سے شکست کھا کر لاہور واپس آیا تو اس کے بعد یلدوز اور سلطان التتمش کے درمیان سرحدوں کو لے کر ترائن کے میدان میں جنگ ہوئی جس میں ایک سخت لڑائی کے بعد سال 612ھ/1215ء میں تاج الدین یلدوز گرفتار ہوا تھا اور اس کو دہلی لا کر بدایوں بھیج دیا گیا تھا، جہاں پر تاج الدین یلدوز کو سلطان التتمش کے حکم سے قتل کر دیا گیا۔ اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے قاضی منہاج نے یلدوز کو بحکم سلطان التتمش قتل کیے جانے کا تذکرہ نہیں کیا بلکہ یلدوز کے قتل کے واقعہ سے چشم پوشی اختیار کرتے ہوئے صرف اتنا لکھا کہ وہ بدایوں میں مدفون ہے۔ ظاہر ہے مکمل واقعہ قلمبند کرنے پر اپنے ممدوح سلطان التتمش کے اس فعل کا ذکر کرنا پڑے گا جو قاضی منہاج جیسے مداح کے لیے ممکن نہ تھا۔

منہاج سراج نے ''طبقات ناصری'' میں ہندوستان کے تعلق سے تاریخ کا آغاز محمد غوری کے دور سے کیا ہے۔ لیکن اس میں کئی غلطیاں ہیں، جیسے اس کے مطابق اجمیر کے رائے کو شکست دے کر محمد غوری نے فوراً ہی اس کو قتل کر دیا۔ مگر یہ بیان حسن نظامی کے بیان سے میل نہیں کھاتا۔ قاضی منہاج سلطان رکن الدین کے انعام واکرام دینے کی تعریف وتوصیف کرتا ہے لیکن اسی کے ساتھ وہ سلطان کے عیش و عشرت میں ڈوبے رہنے کا ذکر بھی کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ سلطان رکن الدین ہاتھی پر بیٹھ کر دہلی کے بازاروں میں سونا لٹایا کرتا تھا۔ اسی طرح قطب الدین ایبک کی سخاوت وخونریزی کے تعلق سے لکھتا ہے کہ وہ انعام واکرام دینے میں دوسرا حاتم تھا۔ ان نوازشات کی وجہ سے اس نے ہندوستان میں اپنے دوست بنا لیے تھے۔ اسی کے ساتھ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ ''انعامات ونوازش بھی لاکھوں تک اور قتل وخون بھی لاکھوں کی تعداد میں پہنچ جاتا تھا۔''

قاضی منہاج نے سلطان رضیہ کے عہد میں سلطان اور امراء کے درمیان جو آویزش اور جدوجہد چلی اس کو تفصیل سے رقم کیا ہے، ساتھ ہی سازشی امراء کے نام بھی تحریر کیے ہیں۔ قاضی منہاج سلطان رضیہ کے رنتھمبور پر حملے کا ذکر کرتا ہے لیکن دیگر ہم عصر ماخذ اس حملے کے سلسلے میں خاموش ہیں۔ سلطان رضیہ کی تعریف میں لکھتا ہے کہ ''اس میں بادشاہت کے سبھی اوصاف تھے مگر قسمت نے اسے مرد نہیں بنایا تھا۔ اس لیے اس کے یہ سبھی اوصاف اس کے لیے فائدہ مند ثابت نہ ہو سکے۔'' طبقات ناصری میں سلطان ناصر الدین محمود کے چودہویں سال کے تذکرے کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ حکومت کے تمام عہدے موروثی ہو گئے تھے۔ مثلاً قاضی کبیر الدین کے انتقال کے بعد قاضی کا عہدہ اس کے بیٹے کو تفویض کیا گیا۔ اسی طرح ملک کشلو اور اعظم باربک ایبک کی موت کے بعد اس کے بیٹے کو حاجب کے عہدہ پر تقرر

ہوا تھا۔ قاضی منہاج کے بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ اصل حکمرانی الغ خاں (بلبن) کے ہاتھوں میں تھی اور سلطان ناصر الدین محمود برائے نام حکمراں تھا۔

''طبقات ناصری'' جو سلطان ناصر الدین محمود کے نام معنون ہے، اس کے عہد کے پندرہ سالوں کا تذکرہ قاضی منہاج نے سال بہ سال کے انداز میں کیا ہے، عام طور پر سلطانوں اور ان کے مخالفین کے درمیان جنگوں کو وہ مذہبی جنگ کے تناظر میں بیان کرتا ہے۔ ''طبقات ناصری'' کے بائیسویں طبقہ میں قاضی منہاج نے شمسی امراء و ملوک کا تذکرہ کیا ہے۔ اس نے سب سے پہلے تاج الدین سنجر کزلک خاں کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ''میں نے سب سے پہلے بارگاہ سلطان (سلطان التتمش) کے جس سردار سے ملاقات کی وہ ملک تاج الدین کزلک خاں تھا۔'' اس کی یہ ملاقات وسط ایشیاء سے اوچھ (ہندوستان) پہنچنے پر ہوئی تھی۔ قاضی منہاج نے ملک تاج الدین کزلک خاں کی سلطان التتمش کے بحیثیت ایک غلام سے چاشنی گیر (شاہی باورچی خانہ کی دیکھ بھال کرنے والا)، پھر اصطبل کا داروغہ، ملتان کا حاکم، کہرام کی جاگیر اور تبرہند کا ناظم مقرر ہونے تک اس کی ترقی کے منازل کا تذکرہ کیا ہے۔ ساتھ ہی اس کی نیکی، ایمان کی سلامتی، احسان و عدل، صدقات و خیرات اور احسان و بخشش جیسے اوصاف کا تذکرہ کیا ہے۔ اسی طرح قاضی منہاج ملک اختیار الدین التونیہ کے ذکر میں سلطان التتمش کے ذریعہ ایک غلام کی حیثیت سے خریدنے اور پھر اسے برن کی جاگیر دئے جانے، سلطان رضیہ کے عہد میں اس کی بغاوت اور پھر سلطان رضیہ سے اس کے نکاح کی مکمل جانکاری فراہم کراتا ہے۔ قاضی منہاج ملک اختیار الدین التونیہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''شجاعت، جنگ جوئی، مردانگی اور شیر دلی میں درجہ کمال پر پہنچا ہوا تھا۔ وقت کے تمام سردار اس کی دلیری اور بہادری کے بارے میں ہم زبان تھے۔''

منہاج سراج ترک حکمراں طبقے کا زبردست حمایتی ہے اور حکومت میں غیر ترک امراء و ملوک کی شمولیت کو اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ وہ عماد الدین ریحان اور نور ترک، دونوں کا مخالف ہے کیونکہ یہ دونوں حضرات مذہب اور سیاست کے میدان میں مصنف کے مخالف گروہ کی نمائندگی کرتے تھے۔ عماد الدین ریحان اقتدار میں ترک امراء کی اجارہ داری کو ختم کرنے کا خواہش مند تھا اور نور ترک طبقہ علماء کے ذریعہ مادی آسائشوں کا حصول اور دنیاوی حب جاہ کا سخت مخالف تھا، حالانکہ قاضی منہاج خود ان دونوں ہی باتوں میں ملوث تھا۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں ''یہ بات انصاف پر مبنی ہے کہ منہاج نے ترک حکمراں طبقے کے ہر عمل کو جائز ٹھہرانے کی کوشش کی ہے۔ ترک اور غیر ترک کی آویزش میں منہاج نے ہمیشہ ترک امراء کی طرف داری کی ہے۔ واقعات کے حقیقی بیان رقم کرنے میں وہ ایمان دار ہے لیکن حالات و اسباب کا تجزیہ کرنے میں وہ ترکوں کا جانب دار بن جاتا ہے۔ غیر ترک اور نو مسلموں کے معاملات میں اسے غیر جانب دار نہیں کہا جا سکتا۔'' منہاج سراج عموماً وقوع پذیر واقعات و حالات کے اسباب کا تجزیہ نہیں کرتا اور ان کو مرضی خدا پر محمول کرتا ہے۔

''طبقات ناصری'' میں کئی مواقع پر اس نے واقعات کو دوہرایا ہے، مثلاً ایک طرف وہ واقعات کو سلطانوں کے ضمن میں لکھتا ہے اور پھر جب شمسی ملوک و امراء کا تذکرہ کرتا ہے تو وہ ان ہی واقعات کو ان کے تناظر میں تحریر کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کے بیانات میں کئی مرتبہ تضاد اور الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ ''طبقات ناصری'' کی ایک اہم خصوصیت شمسی امراء و ملوک کے سوانحی خاکے اور ان کی سرگرمیوں کی

جانکاریاں ہیں۔ان بیانات سے امراء وملوک کی گروہ بندیاں ،امراء وسلاطین کے بیچ مفادات کے جھگڑے اور شازشیں، صوبائی گورنروں اور فوج کے افسران کی کارکردگی وغیرہ کی بھرپور تفصیل پڑھنے کو ملتی ہے۔ان تذکروں سے اس عہد کی سیاست کا رخ متعین کرنے میں جدید مورخین کو بڑی مدد ملتی ہے۔ قاضی منہاج نے ملوک وامراء کے سوانحی خاکے لکھ کر فارسی تاریخ نویسی میں ایک نئی روایت کی بنیاد ڈالی جس کو بعد کے مورخین نے بھی اپنایا۔

جگدیش نرائن سرکار، منہاج کی ''طبقات ناصری'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔''ان سب باتوں نے اس کی کتاب پر جو بڑی فاضلانہ اور مداحانہ تصنیف ہے،اثر ڈالا۔اس نے اپنے سرپرست سلطان ناصر الدین محمود کی تعظیم میں اپنی کتاب کا نام اس کے نام پر رکھا اور تحریر کرتے وقت بڑا مداحانہ انداز اختیار کیا۔اس میں سلطان ناصر الدین محمود کے دور کے جاری رہنے کے واسطے بعض بے ساختہ قسم کی دعائیں ہیں۔اس کے باوجود لائق نقادوں کا خیال ہے کہ وہ 'شاذ و نادر ہی مبالغہ آمیز تعریف و توصیف کرتا ہے۔اور سیدھے سچے انداز میں حقائق بیان کر دیتا ہے جس سے اس کے بیانات کی سچائی اور اس کے علم کی درستی پر اعتماد بڑھ جاتا ہے، لگتا ہے کہ اس کے قانونی پیشے اور علمی نقطۂ نظر نے اس کے طریق کار پر اثر ڈالا۔اس نے لائق اعتماد اشخاص سے معلومات فراہم کرنے کی بڑی کاوشیں کیں اور اکثر اپنے حقائق کی اسناد کا حوالہ دیا ہے۔'' قاضی منہاج سراج نے اپنی ''طبقات ناصری'' میں خراسان، غور اور ہندوستان کے تعلق سے بعض ایسی اہم اور بیش بہا معلومات فراہم کرائی ہیں جو ہم کو کسی دوسری کتاب میں پڑھنے کو نہیں ملتی ہیں اور انھیں پر طبقات ناصری کی اصل اہمیت پوشیدہ ہے۔

قاضی منہاج دہلی سلطنت میں ایک ہمہ جہت و جاذب نظر شخصیت، مذہبی عالم و فاضل، ایک ایسی فصیح و بلیغ خطیب جو سامعین کے خیالات تبدیل کر دے ساتھ ہی زبردست سیاسی شعور کا حامل تھا۔ یہی اوصاف اسے دہلی کے سیاسی و مذہبی طبقوں میں محترم و معتبر بناتے تھے۔اس وجہ سے منہاج کو سلاطین وامراء اور علماء وصوفیاء سے نزدیکی قرب حاصل تھا۔ سلطنت میں مختلف عہدوں پر فائز رہنے کے سبب راست طور پر درست معلومات حاصل کرنے کے عمدہ مواقع میسر تھے۔اس نے تاریخی طور پر تسلسل کے ساتھ واقعات کو قلمبند کیا ہے جو ''طبقات ناصری'' کی ایک اہم خصوصیت ہے۔

7.7 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

منہاج سراج ایک زبردست مذہبی عالم، مبلغ، خطیب، نثر نگار اور شاعر تھا۔ جس کو فارسی و عربی زبان پر عبور حاصل تھا۔ عربی و فارسی میں شعر کہتا تھا مگر بد قسمتی سے اس کا شعری کلام کم دستیاب ہے۔بس وہ قطعات و قصائد اور اشعار جو ''طبقات ناصری'' میں ملتے ہیں، اس سے اس کے شعری ذوق کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، جن میں روانی، بے ساختگی، متانت و سادگی پائی جاتی ہے۔ عبدالحئ حبیبی کہتے ہیں کہ ''منہاج کا پیشہ ہر گز شعر گوئی یا قصیدہ گوئی نہ تھا بلکہ ان کی شاعری حسب ضرورت اور وقتی ہوا کرتی تھی۔'' حالانکہ ان کی تاریخ نویسی میں قصیدہ گوئی کا رنگ دیکھنے کو ملتا ہے۔اس نے ''طبقات ناصری'' میں اپنے ممدوحین کی تعریف میں نثری قصیدہ گوئی کی ہے۔ قاضی منہاج سبک و سلیس انشاپرداز ہے۔اس کی نثر میں فصاحت، سلاست، شستگی اور تازگی پائی جاتی ہے لیکن مشکل پسندی اور ابہام نہیں ملتا، صراحت و وضاحت

کے ساتھ مختصر جملوں سے اپنا مافی الضمیر بیان کر دیتا ہے۔ جو سہل ممتنع کی عمدہ مثال ہے۔ اپنی تحریر کو جاذب نظر بنانے کے لیے جگہ جگہ موزوں اشعار و قطعات کی پیوند کاری ہمیں دیکھنے کو ملتی ہے جس سے تحریر میں ایک خاص قسم کا اثر پیدا ہو جاتا ہے، انھیں تمام خوبیوں کی وجہ سے ''طبقات ناصری'' فارسی نثر نگاری کا ایک عمدہ شاہکار بن جاتی ہے۔

7.8 کلیدی الفاظ (Keywords)

یمین	:	داہنی طرف، قوت، ایمان، مرتبہ
قیم	:	قائم رکھنے والا، سیکریٹری
دباغت	:	چمڑا کمانا/صاف کرنا
ملک الکلام	:	گفتگو یا سخن کا بادشاہ
اعجوبۃ الزمان	:	زمانے کا عجیب تر، انوکھا
رضاعی	:	دودھ شریک
قاضی القضاۃ	:	چیف جسٹس
صدر جہاں	:	مذہبی امور/عدلیہ کے شعبہ کا سربراہ
خلعت	:	سراپا لباس، پوشاک
زربفت	:	سنہری کپڑا

7.9 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

7.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. طبقات ناصری کس سن میں تالیف کی گئی؟
2. فیروز کوہ کہاں پر واقع ہے؟
3. 'افصح العجم' اور 'اعجوبۃ الزمان' کے نام سے کون معروف تھے؟
4. قاضی منہاج کی والدہ کس کے محل میں رہتی تھیں؟
5. منہاج نے کس کے سامنے سب سے پہلے زانوئے تلمذ طے کیا تھا؟
6. منہاج نے کس سن میں ہندوستان کی طرف ہجرت کی تھی؟
7. ہندوستان میں منہاج سب سے پہلے کس کے لشکر کا قاضی مقرر ہوا تھا؟
8. قاضی منہاج پر قاتلانہ حملہ کہاں ہوا تھا؟

9. 'طبقات ناصری' کتنے طبقات پر منقسم ہے؟
10. جوزجان کہاں پر واقع ہے؟

7.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. منہاج کے اجداد میں کس نے جوزجان سے غزنی ہجرت کی تھی؟
2. قاضی منہاج کی والدہ کس شہزادی کی رضاعی بہن تھیں؟
3. منہاج سلاطین دہلی کے کس سلطان کے دربار سے سب سے پہلے وابستہ ہوا تھا؟
4. منہاج کا انتقال کب اور کہاں ہوا تھا؟
5. 'طبقات ناصری' کے دائرہ تحریر کی وضاحت کیجیے۔

7.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. قاضی منہاج سراج کے نظریۂ تاریخ پر تفصیل سے بحث کیجیے۔
2. بحیثیت مورخ قاضی منہاج کا تعین و تشخیص کیجیے۔
3. طبقات ناصری کی افادیت پر ایک تفصیلی مضمون کیجیے۔

7.10 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. Minhaj-Siraj, *Tabaqat-i-Nasiri*. Eng. Tr. H.G. Raverty, Bengal Asiatic Society, Calcutta, 1873.
2. K.A. Nizami, *On History and Historians of Medieval India*, Delhi, 1983.
3. Jagadish Narayan Sarkar, *History of History Writing in Medieval India*, Calcutta, 1977.
4. Hardy, Peter, *Historians of Medieval India*, London, 1960.

5. قاضی منہاج سراج : طبقات ناصری، اردو ترجمہ: غلام رسول مہر، لاہور 1975ء۔
6. محب الحسن : ہندوستانی دور وسطی کے مورخین، اردو ترجمہ مسرور ہاشمی، دہلی، 1985ء۔
7. بنی احمد سندیلوی : تذکرۂ مورخین، کراچی، 1988ء۔

اکائی 8۔ حسن نظامی اور عصامی

(Hasan Nizami, and Isami)

اکائی کے اجزا

8.0		تمہید
8.1		مقاصد
8.2		پس منظر
8.3		حسن نظامی
	8.3.1	تاج المآثر
	8.3.2	تاج المآثر پر مورخین کے خیالات
	8.3.3	تاج المآثر کے اقتباس کے کچھ نمونے
8.4		عصامی
	8.4.1	فتوح السلاطین
8.5		اکتسابی نتائج
8.6		کلیدی الفاظ
8.7		نمونہ امتحانی سوالات
	8.7.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	8.7.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	8.7.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
8.8		مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

8.0 تمہید (Introduction)

قدیم ہندوستان میں تاریخ نویسی کی 'اتہاس-پران روایت' کا رواج تھا جس کو بعض تنگ نظر مورخین نے تاریخ ماننے سے ہی انکار کیا ہے۔ بہر حال اس قدیم ہندوستان کی تاریخی روایت میں کلہن کو ہی ایک باقاعدہ مورخ سمجھا جاتا ہے کیونکہ پرانوں میں درج تاریخی تذکروں اور حکمرانوں کے چرتوں سے صحیح تاریخ کو سمجھنا بے حد دشوار کن کام ہے۔ کلہن نے تاریخ نویسی کی بنیاد سنی ہوئی روایتوں کے بجائے دیکھنے اور پرکھنے اور مادی ماخذ کے استعمال پر رکھی، حالانکہ کلہن کے بعد اس کی روایت کو آگے نہیں بڑھایا جاسکا۔ عہد وسطیٰ کے ابتدائی اور وسطی دور میں ترکوں کی آمد اور ہندوستان میں ان کی حکومت کے قیام کے بعد باقاعدہ تاریخ نویسی کا رواج ہوا۔ ترک ایران کی عجمی ثقافت میں پلے بڑھے تھے تو انہوں اپنی تاریخ نویسی میں بھی اسی ایرانی روایت پر عمل کیا۔ انہوں نے تاریخ نویسی کی عربی روایت کو بہت کم اہمیت دی اور اس میں اسناد یا شواہد کی پرکھ پر زور دیا جاتا تھا، اس کے بجائے شاہی قصیدہ خوانی اور ذاتی تعلق کے ایرانی نظریے کو پیش پیش رکھا۔ چنانچہ حسن نظامی اور عصامی اسی فارسی تاریخ نویسی کی روایت کے علمبردار ہیں، جو شاہی سرپرستی میں پروان چڑھی۔

ہندوستان میں عہد وسطیٰ کی تاریخ نویسی، اس دور کے طرز حکمرانی کی وجہ سے ایک مخصوص دائرے میں رہی کیونکہ بادشاہی نظام حکومت میں تمام سیاسی قوت وطاقت بادشاہ کے ہاتھ میں رہتی ہے اس لیے اس عہد کی تاریخ نویسی بھی اس کی شخصیت کے گرد گھومتی ہے۔ ان تاریخوں کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ بادشاہ کی عظمت کو عوام کے ذہنوں میں اٹھایا جائے۔ اور اس کے کارناموں کو اجاگر کیا جائے تاکہ اس کا نام رہتی دنیا تک باقی رہے۔ چنانچہ یہ تمام تاریخیں بادشاہ کی شخصیت کو مرکز بنا کر اس کی بہادری، شجاعت، فیاضی اور سخاوت کی داستانیں بیان کرتی ہیں ۔ یہ تاریخیں ایک خاص مقررہ ڈھانچے میں تشکیل دی گئی ہیں اس کے اہم موجوعات بادشاہ، امراء اور علماء ہیں، عوام کو اس سے قطعی خارج کر دیا گیا ہے۔ اس وجہ سے ان تاریخوں میں صرف جاگیر دارانہ ثقافت کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ عوامی ثقافت کے بارے میں یہ خاموش ہیں۔

ان تاریخوں میں دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ دارالسلطنت یا دارالحکومت کی تاریخیں ہیں جہاں سلطان اور اس کا دربار ہوا کرتا تھا۔ چھوٹے شہروں اور قضیات کی سرگرمیوں سے یہ تاریخیں خالی ہیں۔ تاریخوں کی یہ اہمیت ضرور ہے کہ ان کے زریعے ہم سلاطین کی شخصیت، ان کے عہد میں ہونے والی جنگوں، انتظامی اصلاحات مذہبی تحریکوں، امراء کی سماجی و معاشی زندگی اور دربار میں تخلیق ہونے والے ادب، شاعری، مصوری، موسیقی اور تعمیرات سے واقف ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ تاریخیں معاشرے کی پوری تصویر پیش نہیں کرتیں۔ یہاں عوام کی زندگی، دیہاتوں کے رسوم ورواج، عوامی و موسیقی، میلے ٹھیلے۔ لوگ گیت ولوک کہانیاں موجود نہیں۔ یہ طبقہ خواص کی نمائندہ ہیں عوام کو ان کے صفحات پر بازیابی کی اجازت نہیں۔

اس اکائی میں ہم دہلی سلطنت کے ایک ابتدائی مؤرخ حسن نظامی کی تاریخ کا جائزہ لیں گے۔ اس دور میں تاریخ کس طرح لکھی جاتی تھی؟ ان کے لکھنے والے کون تھے؟ سماجی سرگرمیوں میں ان کا کیا کردار تھا؟ ان تمام باتوں کو ہم اس اکائی کے ذریعے جاننے کی کوشش کریں گے۔ اس کے ساتھ ہی اہم سماجی تبدیلیوں کی نشاندہی کر سکیں گے۔ ان تواریخ کے ظہور سے تاریخ نویسی کا عمل کس طرح متاثر ہوا؟ اور ملکی

وغیر ملکی تاریخ کے ہندوستان پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟اس کا اندازہ لگا سکیں گے۔

8.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- تاج المآثر کے مصنف حسن نظامی کے بارے میں جان سکیں گے۔
- تاج المآثر کا تفصیلی تجزیہ پیش کر سکیں گے۔
- عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ نویسی میں تاج المآثر کے کردار کا جائزہ لے سکیں گے۔
- فتوح السلاطین کے مصنف عصامی کے بارے میں جان سکیں گے۔
- فتوح السلاطین کی تاریخی اہمیت تفصیلی بیان کر سکیں گے۔
- عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ نویسی میں فتوح السلاطین کے کردار پر روشنی ڈال سکیں گے۔

8.2 پس منظر (Background)

12 ویں صدی کے اختتام پر شمالی ہند پر غوری کا حملہ ہندوستانی تاریخ میں ایک اہم واقعہ ہے۔ کیونکہ اس کے بعد ہندوستان میں ایک آزاد خود مختار سلطنت قائم ہوئی جس سے ایک جانب ہندوستان بیرونی اثرات سے متاثر ہونا شروع ہوا تو دوسری جانب ایک مضبوط مرکز کے زیر نگرانی ہندوستان متحد ہونا شروع ہو گیا۔ اس نے پڑوسی ممالک سے آنے والوں کو اپنی جانب مبذول کیا جو مختلف تہذیبی روایات کے علمبردار یا نمائندے تھے۔ ایک روایت جس کی ابتداء ان لوگوں کے ذریعے ہوئی وہ تاریخ نویسی کی روایت تھی۔ ان کی فارسی زبان میں تحریر کردہ تاریخ مواد کافی اہمیت کا حامل ہے۔ درحقیقت مسلم اشراف مذہبی کتابوں اور فقہ کے بعد تاریخی کتب کے مطالعے کو علم حاصل کرنے کا تیسرا اہم ذریعہ سمجھتے تھے۔ ہندوستان میں سلطنت عہد میں فارسی تاریخ نویسی کی اس روایت میں متعدد مورخین کے نام شامل ہیں، جن میں دو کا ذکر اس اکائی میں ہم کریں گے۔ پہلا تاج المآثر کا مصنف حسن نظامی ہے اور دوسرا فتوح السلاطین کا مصنف عصامی ہے۔ آئندہ صفحات میں ہم ان دونوں کے بارے میں جاننے کی کوشش کریں گے اور ان کے طرز تاریخ نویسی اور اس کی اہمیت تجزیہ پیش کریں گے۔

8.3 حسن نظامی (Hasan Nizami)

ہمیں تاج المآثر (کارناموں کا سرتاج) کے مصنف حسن نظامی کے بارے میں سوائے ان حوالوں کے کچھ نہیں معلوم جو اس نے خود اپنی کتاب میں دیے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو غلام ابن غلام حسن نظامی کہتا ہے اور اپنے سرپرستوں میں ابوالمظفر محمد بن سام بن حسین (یعنی محمد غوری) اور قطب الدنیا والدین ابوالحارث ایبک کے نام لیتا ہے۔ حسن نظامی نیشاپور میں پیدا ہوا تھا اور اسے صدرالدین محمد بن حسن نظامی بھی کہا جاتا ہے۔ پروفیسر عسکری کے مطابق اس کا باپ غالباً ابوالحسن نظامی عروضی تھا جو سمرقند کا رہنے والا تھا۔ حالانکہ لاہور نہ اس کی جائے

پیدایش تھی اور نہ مستقل مسکن پھر بھی ہمیر اس کا تعلق اسی شہر سے بتاتا ہے۔اسے خراسان کے سیاسی ہنگاموں کے باعث اپنا آبائی وطن چھوڑ کر غزنی کے راستے دہلی آنا پڑا۔اس زمانے کے خراسان میں نہ لیاقت کو سراہا جاتا تھا اور نہ اس کا اجر ملتا۔ تحریر کرتے وقت وہ گہرے احساس محرومی کا شکار تھا۔ حسن نظامی کے تعلقات اور واقفیت (صوفی محمد شیرازی اور غزنی کے قاضی القضاۃ مجد الملک، اور دلی کے قاضی القضاۃ شرف الملک) سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف اہل علم تھا اور دانشوروں میں شمار کیا جاتا تھا بلکہ سماجی نظام میں خاصی اونچی حیثیت کا مالک تھا۔اس نے اپنی اس فارسی کتاب کی ابتدا 1205ء میں صرف اپنے دہلی کے (جہاں عربی قلم کی بظاہر قدر نہ تھی) دوستوں کی درخواست پر کی تھی بلکہ اس شاہی حکم کو پروا کرنے کے لیے بھی کی تھی جس میں اس سے کہا گیا تھا کہ فاتح عالم (فرمانرواں کا نام نہیں دیا گیا ہے) کے واقعات کی تفصیلات قلم بند کرے۔اس میں ضروری طور سے محمد غوری سے کی اور خاص طور سے قطب الدین ایبک اور التمش کی تاریخ دی گئی ہے۔ مصنف نے ہر ہر قدم پر اپنے رنگین اور طولانی انداز میں تشبیہوں اور استعاروں وغیرہ کے ذریعے نثر و نظم میں اپنے علم کا مظاہرہ کیا ہے۔ لیکن وہ یہ ثبوت کہیں نہیں دیتا کہ فرمانرواؤں کے کارناموں میں خود شریک رہا تھا یا انھیں اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔ سوائے اس تعریف کے جو مصنف اپنے دیوتا صفت انسانوں پر نچھاور کرتا ہے کسی بات سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ ان واقعات کے زمانے میں خود موجود تھا جنھیں وہ بیان کرتا ہے اور چند تاریخوں کے بارے میں جو گنجلک اور بے ربطی ہے۔ نیز ان کی ساری تفصیلات غائب ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنے سرپرست کی مہموں میں وہ خود شریک نہ رہا تھا۔ یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ وہ قطب الدین کے اصل دور کے معاملات کے بارے میں کچھ نہیں کہتا، حالانکہ اسی چھوٹے سے باب میں اس کی تخت نشینی اور وفات کے بارے میں تحریر کیا گیا ہے۔ پروفیسر جگدیش نرائن سرکار کہتے ہیں کہ حسن نظامی ایک مداح خواں تھا، اور دوسرے بہت سے مورخوں کی طرح تعصبات کا شکار تھا، وہ تراین کی پہلی جنگ میں محمد غوری کی شکست کا ذکر نہیں کرتا لیکن دوسری جنگ میں اسی کھوئے ہوئے وقار کو دوبارہ حاصل کرنے کا ذکر کرتا ہے۔ وہ انہلواڑہ کے بھیم دیو دوئم کے ہاتھوں غوری فرمانروں کی اس سے پہلے کی ایک شکست فاش کی طرف اشارہ ضرور کرتا ہے۔ حسن نظامی ہمیں یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ ابتدائی مسلم فاتح اچھے مسلمان اور حامی مذہب تھے اور جنگ و فتح نیز حکومت و انتظام کی بابت ان کا مقصد اور نیت سیاسی یا معاشی نہیں بلکہ مذہبی تھی اور انہوں نے جو شہر اور مقامات فتح کیے ان میں مشکل ہی سے کوئی مورتی مندر یا مذہبی پناہ گاہ باقی بچی ہوگی جسے مسلم ادارے میں تبدیل نہ کر دیا گیا ہو۔

8.3.1 تاج المآثر (Taj-ul-Maasir)

غوری کی فتح اور دہلی سلطنت کے قیام پر ایک اہم تصنیف تاج المآثر ہے۔اس کے مصنف نے ایبک کی تخت نشینی سے کچھ قبل دلی میں رہائش اختیار کی اور وہاں 1206ء میں قطب الدین ایبک کی تخت نشینی کے بعد اس کے کارناموں کی تاریخ مرتب کرنی شروع کی۔اس کا مقصد شاہی سرپرستی حاصل کرنا تھا۔ادبی نابغہ روزگار ہونے اور فارسی۔ عربی شعری رجحانات پر مکمل دسترس ہونے کے باعث حسن نظامی نے لفظی آرائش کے لیے استعارات، تشبیہات اور مبالغے کا زیادہ استعمال کیا۔ یہ غیر ضروری لفاظی سے پر ہے۔ لفاظی اور غیر ضروری تفصیلات اگر نکال دی جائیں تو بغیر کسی تاریخی مواد کے زیاں کے اس کتاب کی آدھی ضخامت کی کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ جہاں تک اس کے طریقہ کار کا تعلق ہے وہ واقعات کا بیان اپنے آبائی وطن نیشاپور میں گردش یا نیرنگ زمانہ کے بیان سے شروع کرتا ہے یا پھر غزنی کا سفر جہاں وہ بیمار پڑا اور پھر ہندوستان

آمد کا ذکر کرتا ہے۔ مقدمہ کے بعد دوسری ترائن جنگ کا ذکر کرتا ہے۔ پہلی ترائن جنگ جس میں پرتھوی راج چوہان نے سلطان معزالدین محمد بن سام کو شکست دی تھی، کا ذکر نہیں ہے۔ لیکن 1192ء سے لیکر 1196ء تک رونما ہونے والے تمام تاریخی واقعات کا تفصیلی ذکر ہے۔ اس کے بعد حسن نظامی قطب الدین ایبک کے 1206ء تک کی تمام فتوحات و جنگ کے بیان کو یکسر چھوڑ دیتا ہے۔ غالبا 1210ء میں قطب الدین ایبک کی حادثاتی موت کے بعد رونما ہونے والی افراتفری سے بیزار ہو گیا تھا اور لکھنا معطل کر دیا تھا۔ بعد میں جب التتمش اپنی حکومت کو مضبوط بنانے میں کامیاب ہو گیا تو اس نے پھر کام شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس بار اس نے 1203ء سے اپنی کہانی شروع کی کیوں کہ اس وقت التتمش جس کو یہ کتاب پیش کرنی تھی ایک اہم جنرل ہو گیا تھا جو قطب الدین ایبک کی زیر نگرانی تمام مہموں میں حصہ لیتا تھا۔ مرتب نے قطب الدین ایبک کے 1197ء میں بدایوں فتح کا 1198ء میں قنوج اور چنداور کے قبضے کا ذکر نہیں کیا ہے۔ لیکن یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ التتمش کی تعریف میں مبالغے کے باوجود یہ مرتب کی کامیابی ہے کہ وہ اپنی کتاب میں مذکور تمام واقعات کے بارے میں صحیح معلومات جمع کر سکا اس خلا کے علاوہ حسن نظامی قطب الدین ایبک کے علاقائی سرداروں جنہوں نے اس کی اطاعت قبول کی۔ کے ساتھ دوستانہ برتاؤ کے ذکر میں ناکام ہو گیا۔ اکثر و بیشتر اس کا بیان کافی مختصر اور علامتی ہے جیسے جب وہ ہندو سرداروں کا سلطان کے دربار میں حاضری کا ذکر کرتا ہے تو صرف یہ کہتا ہے کہ عظیم دربار کے شایہ فرش ہندوستانی رؤساء کے لیے بوسۂ تبریک تھے۔ اس میں شرفاء کی سوانح کی تفصیل نہیں گرچہ اس میں بعض سلطنت کے معماروں میں سے تھے۔ تاج المعاصر کے ہندوستان اور بیرون ہندوستان میں موجود مسودوں کا اختتام التتمش کے 1217ء میں لاہور کے قبضے پر ختم ہوتا ہے۔

تاج المآثر فارسی میں لکھی گئی ہندوستان میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ اسے تاج الدین محمد حسن نظامی نیشاپوری نے ہندوستان میں مسلمانوں کے دور حکومت کے پہلے حکمراں قطب الدین ایبک کے حسب فرمائش رشتۂ تحریر میں لایا تھا۔ ہندوستان میں دور سلطنت کافی اہمیت کا حامل رہا۔ فارسی زبان وادب کا رواج اگرچہ غزنویوں کی ہندوستان میں آمد سے شروع ہوتا ہے اور فردوسی، فرخی، منوچہری، بو علی سینا، بیہقی، بیرونی اور خواجہ معین الدین چشتی جیسی عظیم ہستیوں کی کاوش سے اس کو کافی فروغ حاصل ہوا۔ لیکن سلطنت عہد میں جو ہندوستان کے مسلمانوں کی سرکاری حکومت کے دور کے عنوان سے مشہور ہے اس سرزمین کے مفکروں نے تین سو سال کی مدت میں غلام سلاطین، خلجیوں، تغلقوں، سیدوں اور لودھیوں کے باقی ماندہ میراث اور ذخیرے سے استفادہ کر کے فارسی زبان وادب کو مزید رونق بخشی۔

فارسی میں تاریخ نویسی کا سلسلہ ہندوستان میں سلاطین دہلی کی حکومت کے دور سے شروع ہوا۔ چنانچہ طبقات ناصری، تاج المآثر، خزاین الفتوح، تاریخ فیروز شاہی، فتوح السلاطین، تاریخ مبارک شاہی، فتوحات فیروز شاہی وغیرہ اہم تاریخی کتابیں اسی دور میں لکھی گئیں۔ ان میں خزائن الفتوح نہایت مقفع اور مسجع عبارت میں لکھی گئی ہے۔

تاج المآثر در حقیقت ہندوستان کے قرون وسطی کے ابتدائی دور کا ایک بہترین ماخذ ہے جس میں سلطان قطب الدین ایبک اور سلطان التتمش کے دور کے تاریخی واقعات درج ہیں ۔ حسن نظامی اپنے وطن کی داخلی جنگوں اور بدامنی کی وجہ سے وطن کو خیر باد کہہ کر غزنی (افغانستان آیا) وہاں سے دہلی آیا، جو اس دور میں قلمرو بذل و سخاوت و قبلہ رفاہ و ثروت تھی۔ اسی شہر میں اس نے اپنے مربی اور ولی نعمت

سلطان قطب الدین ایبک کے کارناموں کو بیان کرنے کی غرض سے 1205ء میں اسے لکھنا شروع کیا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ اس زمانے کے واقعات روداد اور حقائق کو بیان کرنے کے مروجہ اسلوب سے اس نے انحراف کیا اور تمام مضامین کو انتہائی منصفانہ انداز میں اس طرح بیان کیا کیا جس طرح وہ پیش آتے رہے ہیں۔ مصنف نے ان شکستوں کو بھی جو کبھی کبھی اسلامی لشکر کو نصیب ہوئی ہے نہیں چھپایا۔ اسی طرح بعض راجپوت راجاؤں کے بہادرانہ مقابلے کو قارئین کی نظر سے اوجھل نہیں کیا۔

اپنے ولی نعمت کے امتیازی صفات کے بارے میں حسن نظامی لکھتا ہے کہ سلطان کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ وہ سدا رعایا کی خوش حالی کی فکر میں غرق رہا کرتا تھا۔ ملک کے سماجی حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس زمانے میں فوجی قوت کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی جس سے غرض صرف کشور کشائی اور جہاں گیری نہ تھی بلکہ ملک میں امن وامان بحال کرنا اور نظم ونسق کی صورت حال کو بہتر بنانا بھی تھا۔ چنانچہ لکھتا ہے کہ سلطان موصوف نے پورے ملک میں امن وامان قائم کیا، شاہراہوں کو مسافروں کے لیے محفوظ ومامون بنایا۔ اسے یہ بھی احساس تھا کہ عوام کی حاجت برآری جہاں تک ہو سکے جلد کرنی چاہئی اور رعایا کے حقوق میں عدل وانصاف کے مسئلے کو تیزی سے حل کرنا چاہئے۔ سپاہیوں کے حق میں کشادہ دلی اور فراخ دستی بھی اس کی عظیم ترین قابل تعریف خصوصیت ہے۔

مؤلف تاریخ فرشتہ، تاج المآثر کو اس دور کے واقعات کی تحقیق کا ایک اہم ماخذ قرار دیتا ہے۔ اشتیاق قریشی لکھتے ہیں ''سلاطین دہلی کی اولین حکومت کے دور کے واقعات کے لیے تاج المآثر تالیف حسن نظامی اولین ماخذ ہے۔ مصنف کا اسلوب نہایت مشکل اور تکلف سے بھرا ہوا ہے لیکن صحیح واقعات بیان کیے ہیں اور کبھی کبھی انتظامی مسائل کو بھی قلم بند کیا ہے۔''

8.3.2 مورخین کے خیالات (Ideas of Historians)

پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں :تاریخ نویسی میں حسن نظامی کا اسلوب تاریخی سے زیادہ ادبی ہے۔ عبارت پردازی کے پردے میں کبھی کبھی تاریخی واقعات بھی نظر آتے ہیں۔

پروفیسر حسن عسکری لکھتے ہیں : حسن نظامی نے تاریخ نویسی میں تحریف سے کام نہیں لیا۔ اس نے واقعات کو اس طرح معکوس کر کے پیش کیا کہ ہار، جیت معلوم ہو۔ وہ ایسے مضامین لکھنے سے گریز کرتا ہے جو درد سر کا موجب ہو۔ جو کچھ کہتا ہے اگرچہ اس نے دراز گوئی اور لفاظی سے کام لیا ہے لیکن وہ درست اور مستبد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض ایسے حقائق سے اس نے پردہ اٹھایا ہے جسے منہاج سراج نے بیان نہیں کیا ہے۔ خصوصیت سے ادبی اور انتظامی امور کی طرف اس کا اشارہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ بعض واقعات کے بیان میں حسن نظامی کا بیان منہاج سراج کے بیان سے درست تر نظر آتا ہے۔

زمانی اہمیت کے پیش نظر جس کا اس کتاب میں ذکر ہے، اس کے مضامین ہندوستان میں ترکوں کی حکومت کی تاسیس کے سلسلے میں اولین ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں ، جن کو بہت قابل قدر اور اہم سمجھنا چاہئے۔ حسن نظامی نے بہت سے ایسے واقعات بیان کیے ہیں اور ایسی

معلومات فراہم کی ہیں جن کو منہاج نے نظرانداز یا سطحی طور پر بیان کیا ہے۔ تاج المآثر کے مضامین ہندوستان میں ترکوں کی حکومت کی تاسیس کے سلسلے میں اولین ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں، جن کو بہت قابل قدر اور اہم سمجھنا چاہئیے۔ حسن نظامی نے بہت سے ایسے واقعات بیان کیے ہیں اور ایسی معلومات فراہم کی ہیں جن کو منہاج نے نظرانداز کر دیا یا سطحی طور پر بیان کیا ہے۔

ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ سے واقف مورخین حضرات نے اس دور کے حالات بیان کرنے میں عموماً فارسی کے اصل ماخذ سے اجتناب کیا ہے۔ زیادہ تر انگریزی ترجموں اور تلخیص پر اعتماد کیا ہے۔ علاوہ ازیں وہ ان فارسی متون کی نسبت جن کا ابھی تک ترجمہ نہیں ہوا ہے، کچھ لاپرواہ رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ چند ہی مورخین اور محققین نے تاج المآثر کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ زیادہ تر مورخین اس سلسلے میں معاصر مورخین کے بیان پر تکیہ کیا ہے۔

پروفیسر عسکری نے تاج المآثر کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ انہوں نے ان تاریخی حقائق اور اسامی و قوانین اور قواعد کا پتہ لگایا جن کو منہاج سراج نے بیان نہیں کیا۔ مصنف تاج المآثر نے ہندوستان میں قرون وسطی کے اولین دور کی تمدنی، تہذیبی اور سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ جو قاعدے قانون اور اصول وضوابط قطب الدین ایبک اور التتمش نے وضع کیے تھے ایلیٹ اور ڈاوسن نے نظرانداز کیا تھا، پروفیسر حسن عسکری نے ان کو پوری تاکید کے ساتھ پیش کیا ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے موسیقی کی اصطلاحات اور حربی آلات کے نام، قیمتی پتھروں، لباسوں اور عطریات کو بھی بیان کیا ہے۔ مورخین تاج المآثر کو تاریخ کے مطالعہ کے لیے ایک اصلی متن کے طور پر ناکافی سمجھتے ہیں۔ دوسری طرف ادیب حضرات نثر فارسی کے نمونے کے طور پر اسے معمولی اور غیر اہم سمجھتے ہیں لیکن ملک الشعراء بہار نے جو ایک ممتاز شاعر اور ادیب ہیں مؤلف تاج الماثر کی فارسی اور عربی کے انتہائی عمدہ اشعار کے انتخاب کی وجہ سے تعریف کی ہے۔ بہار کے خیال میں تاریخ تاج المآثر بغیر کسی تبدیلی کے کلیلہ ودمنہ کے اسلوب میں لکھی گئی ہے۔ اسی وجہ سے اس کتاب میں نثر منظوم (مسجع) کثرت سے نظر آتی ہے۔ پوری کتاب متشابہ تعبیروں اور مترادف جملوں اور لمبی گفتگو سے پر ہے۔ ان کا خیال ہے کہ مؤلف نے ایسی عبارتیں لکھیں ہیں جو ان کے پیش نظر اشعار سے مناسبت رکھتی ہیں۔ لیکن یہ بات حلق سے نیچے نہیں اترتی۔ اسی طرح ان کا یہ دعوی بھی ہے کہ تاج المآثر میں فارسی کے فصیح لغات والفاظ کی کمی نہیں ہے۔ لیکن الفاظ کی ترکیب، جملوں کی بندش اور مضامین کے لحاظ سے قطعی طور پر ضعیف اور غیر اہم ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ اس کتاب سے تاریخی مضامین کا سراغ لگانا مشکل ہے۔ ان سب خامیوں کے باوجود، عربی فاسی کے عمدہ اور نفیس اشعار پر مشتمل ہونے کی وجہ سے وہ تاج المآثر کو ایک بے نظیر کتاب کہتے ہیں۔ ان کے خیال میں اس میں نقل کیے گئے فارسی و عربی کے زیادہ تر اشعار اعلی درجے کے شاعروں کے ہیں۔ خصوصیت سے چھٹی صدی ہجری سے پہلے کے شاعروں عبقری، مسعود سعد سلمان، عنصری، منوچہری، خاقانی، فخر گرگانی ہیں۔ لیکن انہوں نے ان اشعار کے خالق کے نام کی تصریح نہیں کی۔

ان تمام کمیوں کے باوجود جو تاج المآثر کے بارے میں ہے، یہ کتاب اس لائق ہے کہ اس کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا جائے کیونکہ مؤلف بانی حکومت سلاطین دہلی قطب الدین ایبک کا معاصر اور اس کے مقربین میں سے ہے۔ کوئی دوسرا ادیب یا مورخ سلطان سے اتنی قربت کا دعوی نہیں کر سکتا۔ علاوہ ازیں مؤلف کو اپنے عہد کے واقعات کا براہ راست علم تھا، اس وجہ سے وہ مزید اہمیت کا حامل ہے۔

مؤلف تاج المآثر کو علم نجوم میں کمال حاصل تھا۔انواع واقسام کے رنگوں ،زیورات اور آلات خصوصیت سے مختلف علاقوں ، وہاں کے لباس و پوشاک، پھلوں اور پھولوں، گھوڑوں، بیماریوں، دواؤں اور شطرنج وغیرہ سے بھی وہ پوری طرح واقف ہے۔علاوہ ازیں عربی فارسی شاعری سے بھی آشنا ہے اور تقریباً تمام قدیم ومعاصر شاعروں کے کلام کا مطالعہ کیا ہے۔خود بھی شعر کہتا تھا لیکن انہوں نے شعر گوئی کا دعوی نہیں کیا۔اس کتاب میں درج متعدد اشعار سے بظاہر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بعض اشعار اسی کے کہے ہوئے ہیں۔

مؤلف تاج المآثر کے مطالعہ سے قرون وسطی کی بہت سی ایسی تاریخی شخصیتوں کا پتہ بھی چلتا ہے جو فراموشی کی نذر ہو گئی ہیں۔ڈاکٹر ضیاءالدین دیسائی نے مملوک سلطان شمس الدین التتمش کے سپہ سالار عزالدین بختیار خلجی غوری کی قبر پر پائے گئے ایک قدیم ترین کتبہ کا پتہ چلایا ہے اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

طبقات ناصری نے اس آدمی کا صرف نام لکھا ہے جبکہ حسن نظامی نے دوسری تفصیلات بھی فراہم کی ہے۔موصوف نے اسے دوسرے حاکموں جیسے ناصرالدین، مردان شاہ، ہزبرالدین احمد، افتخار الدین محمد کے ساتھ ذکر کیا ہے جس نے اس سرجاندار تاتار کی سرکوبی کی، جس نے التتمش کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا۔اسی طرح حسن نظامی نے جنگ جالر (یاجالیور) میں ان کو رکن الدین حمزہ، نصیرالدین مردان شاہ، نصیرالدین علی اور بدرالدین سبکتگین کے ساتھ ذکر کیا ہے۔جو 1219ء سے پہلے التتمش کی تخت نشینی کے بعد واقع ہوئی تھی۔
مؤلف تاج المآثر نے اپنی کتاب میں اس معنی میں صنعت التزام کی رعایت رکھی ہے کہ جب میدان جنگ کی منظر کشی کرتے ہیں تو ان تمام جنگی ہتھیاروں اور اصطلاحوں کا ذکر بھی کرتے ہیں جو اس وقت جنگ میں استعمال ہوتی تھیں۔جیسے کوس، جلاجل، کرنا، گوپال، گرز، تیغ، شمشیر، خنجر، چرخ، ژوبین، ناوک، خدنگ، دابوس، تیر، خشک، سنان، نیزہ، کمان، کمند، سپر، پرتاب، تبرزن، سرب، قرورہ، علم، اختر، دیدر، سراپردہ، میمنہ، میسرہ، قلب، طلایہ، سرقہ، زرہ، جوشن، خود، مغفر، پیکان، خدنگ چہارپر، بیلک، شبی، ناخن شیر، دشنی، کٹارہندی، شل ہندی، منجنیق، نیزہ دیلمی، مغفر چین، جوشن ختائی، کمان کیانی۔

لباس و پوشاک کا ذکر کرتے وقت اپنے عہد کے تمام مروج وغیر مروج اقسام لباس کا ذکر کرتے ہیں۔جیسے دیبائے ہفت رنگ، بساط ابریشمی، بساط زبرجدی، جامہ عنابی، لباس پرنیاں، جامہ زربفت، جامہ سنجاب، لباس بہامان، نقاب و برقعہ، فعش قاقم، مسند، تکیہ، جامی نغدادی، زربفت رومی۔قیمتی پتھروں اور ہیرے جواہرات، برتنوں اور عطریات کا بھی ذکر کرتے ہیں ۔جیسے یاقوت رومانی، لعل بدخشانی، عقیق یمانی، اائینہ چینی، قلادہ، گوشوارہ، خلخال زریں ، سیور، کوزہ ولولہ دار، آبگینہ شای، جام بغدادی۔مختلف کھیلوں کا بھی تذکرہ کرتے ہیں جیسے چوگان، شطرنج، قمار بازی۔

تاج المآثر کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مؤلف کو موسیقی، جنگ، طب، شطرنج، علمنجوم، طالع شناسی، بازوشاہین داری، کھیتی وکسانی، خیاطی، ظروف، زیوروآلات اور انواع واقسام کے کھیل سے مکمل واقفیت تھی۔حسن نظامی نے 1205ء میں تاج المآثر کی تالیف

شروع کی اور 1191ء میں جن واقعات کا خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تھا لکھا۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ 1217ء کے آغاز میں فوت ہوا ہوگا۔ کیونکہ اس زمانے تک جو واقعات رونما ہوئے ان سب کا ذکر اس نے کیا ہے۔

تاج المآثر کے بغور مطالعہ سے کچھ نئے حقائق بھی سامنے آتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ قطب الدین ایبک کو تنگی نفس کا مرض لاحق تھا۔ تاج المآثر میں جو الفاظ و ترکیبیں کثرت سے استعمال ہوئی ہیں وہ فارسی ادب میں پہلی اور آخری دفعہ استعمال ہوئی ہیں۔ ان میں کچھ تو شاذ و نادر ہی دوسروں کی تصانیف میں استعمال ہوئی ہیں۔ جو بے شمار اضافات اس کتاب میں نظر آتے ہیں وہ بھی قابل توجہ ہے۔ اسی طرح مؤلف نے بعض الفاظ کو ایسے مفہوم میں استعمال کیا ہے جس کا مفہوم آج بالکل بدل چکا ہے۔ مثلاً لفظ مزار کو ملاقات کی جگہ کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ جبکہ آج یہ لفظ قبر، یا مقبرہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی تحریر میں مشکل اور نامانوس الفاظ بھی بہت نظر آتے ہیں۔ ایسے الفاظ کی تعداد بھی بہت ہے جو فارسی میں بالکل استعمال نہیں ہوتے ہیں اور لغت کی بڑی بڑی کتابوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔

8.4 عصامی (Isami)

اپنی طویل تاریخی رزمیہ نظم، فتوح السلاطین ایک ایسے شخص کی طرح لکھی جو سرپرست کی تلاش سے مایوس ہو چکا ہو۔ وہ محمد بن تغلق سے ناراض تھا کیونکہ اسے اپنے نوے سالہ بوڑھے دادا کے ساتھ دہلی سے دیوگیری (دولت آباد) جانے پر مجبور کیا گیا جو راستے میں دہلی کے قریب ہی تلپت کت مقام پر فوت ہو گیا۔ وہ ایک دوست یا سرپرست کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ اس نے ہندوستان میں ادب کے نیچے معیار اس غیر دوستانہ دنیا میں ان مصنفوں کی بری حالت کی شکایت بڑی تلخی سے کی ہے جو کینہ ور نقادوں کے رحم و کرم کے محتاج تھے۔ سخت تنفر کے باعث وہ ہندوستان چھوڑ کر مکہ چلا جانا چاہتا تھا۔ اس کے خوابوں کا سرپرست علاءالدین بہمن شاہ کی ذات میں ظاہر ہوا۔ اس نے دولت آباد میں قیام کر لیا اور اس کی سرپرستی میں اس طرح لکھنا شروع کیا کہ بہمنی سلطان کے واسطے وہ فردوسی بن گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی فتوح السلاطین شاہ نامہ ثابت ہو۔ اس نے دولت آباد میں قیام کر لیا اور اس کی سرپرستی میں اس طرح لکھنا شروع کیا کہ بہمنی سلطان کے واسطے وہ فردوسی بن گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی فتوح السلاطین شاہ نامہ ثابت ہو۔ اس نے فتوح السلاطین کو اسی کے نام معنون کیا تاکہ اس کی سرپرستی حاصل رہے اور ایک دائمی ادبی شہرت حاصل ہو۔ اس نے محمد تغلق کو جو سخت لعنت ملامت کی ہے اس کا جزوی سبب اس کے اپنے مصائب تھے۔ تغلق دور کے مؤرخ کی حیثیت سے عصامی ایک یکتا حیثیت کا حامل ہے، کیونکہ وہی ایک اکیلا مصنف ہے جو سلطان کے خوف یا عنایت سے بالاتر ہے۔

8.4.1 فتوح السلاطین (Futuh-al-Salatin)

عصامی کی فتوح السلاطین (50-1349ء میں تصنیف کی گئی) ہندوستان میں محمود غزنوی کے زمانے سے لے کر کتاب کی تصنیف کے زمانے تک، مسلمانوں کے کارناموں کا ایک سرسری جائزہ تھی جو طویل رزمیہ نظم کی صورت میں تھی۔ اسے گو پرانے مآخذوں پر تکیہ کرنا پڑا لیکن اس نے آنکھیں بند کر کے استاد کی تقلید نہ کی۔ اسے جو روادیں یا روایتیں ملیں ان کو اس نے محض نقل نہیں کیا۔ اس نے معلومات کو

اپنے خیالات کی روشنی میں بدلا اور اپنے انداز سے پیش کیا اور اس میں اپنے دوستوں اور رفیقوں سے جمع کی ہوئی عام قسم کی رودادیں ،واقعات، روایتیں اور کہانیاں (سنی سنائی باتیں) شامل کر دیں۔ وہ ان حقایق کا ماخذ نہیں بتاتا ہے اور محض یہ کہ دیتا ہے، میں نے سنا ہے،

مواد کا انتخاب جمالیاتی اسباب کی بناپر نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ تنقیدی تاریخ نہیں بلکہ محض تاریخی ثبوت پیش کرتا ہے۔ وہ عہد وسطیٰ کے مسلم مصنفین کے روایتی انداز کی تقلید کرتا ہے جس میں خدا کے حکم کے پراسرار نفاذ کا اور تقدیر کے ناقابل فہم ہونے کا زور دیا جاتا ہے۔ حالانکہ بعض اوقات وہ واقعات کو انسانی افعال سے منسوب کرتا ہے۔ کیخسرو کو کیقباد کے مقابلے میں اس لیے مسترد کر دیا گیا کہ امراء کا یہی فیصلہ تھا۔

عہد وسطیٰ کی تاریخ نویسی کے ضمن میں ہمیں کچھ باتیں یاد رکھنا چاہئے:

- پہلی یہ کہ دور وسطی کی زیادہ تر ہندوستانی تاریخی کتابوں پر تاریخ نویسی کی عربی روایت کی نہیں بلکہ فارسی روایت کی چھاپ پڑی ہوئی ہے۔ کیونکہ مصنفین یا تو شاہی دربار سے متعلق تھے یا شاہی سرپرستی کے خواستگار تھے۔ مسلم مورخین نے تاریخ کو اپنے عظیم اشخاص کے ارد گرد گھمانا شروع کر دیا۔ تاریخ کا جو تصور امیر خسرو، عصامی، ضیاء الدین برنی، شمس سراج عفیف اور یحیی احمد بن سرہندی نے دیا وہ بڑے آدمیوں، فرمانرواؤں، شہزادوں اور امیروں کی تاریخ تھی، نیچے اور کمتر اشخاص کی نہیں، اور نہ عوام کی تاریخ تھی۔ برنی کے نزدیک تاریخ، پیغمبروں، خلفاء، سلاطین اور حکومت اور مذہب کے دوسرے بڑے لوگوں کے واقعات اور روایات کا علم ہے۔ اگر وہ کمتر اور نااہل لوگوں کے کام بیان کرنے لگتی ہے تو اس کی افادیت ختم ہو جاتی ہے۔ حقیقتاً ایسے اشخاص کو عموماً اس علم کا ذوق نہیں ہوتا اور اس کے مطالعے سے انہیں کوئی فائدہ بھی نہیں ہوتا۔ لہذا کچھ مصنفین نے فرمانراؤں اور افراد کی شان میں قصیدے لکھے جیسے العتبی (تاریخ یمنی) عفیف (تاریخ فیروز شاہی)۔ یہ کتابیں فرمانراؤں یا افراد کے مناقب یا تاریخ فضائل یا نثریہ قصیدے کے درجے میں شمار کی جاتی ہیں۔
- دوسری یہ کہ ابتدائی دور وسطی کے ہندوستانی مورخین اپنے یوروپی ہمعصروں کی طرح یہ سمجھتے تھے کہ تاریخ خدا کے حکم سے ہونے والا ایک تماشہ ہے، انسانی افعال کی نہیں بلکہ فعل خدا کی ایک کہانی ہے جس میں انسان محض معمولی کارکنوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔
- تیسرے، انہوں نے کوشش کی کہ تاریخ کی ترجمانی روایتی قسم کے مذہبی واخلاقی پس منظر کے ساتھ کی جائے، جس میں اس ظالم دنیا کی بے حقیقت چیزوں سے گریز کیا جائے۔ (جیسے یحیی اور عصامی)
- چوتھے، انہوں نے تاریخ کو مذہب کا مقصد حاصل کرنے اور اسلام کی عظمت بڑھانے کے لیے استعمال کیا۔ اسلام کی عظمت بڑھانے کا رویہ ہندوستان کے تعلقات کے بارے میں اس دور کے بیانات کی تشریح کرنے میں مدد دیتا ہے۔ (جنگیں، لڑائیاں وغیرہ) اور ان بیانات میں جس مبالغے سے کام لیا گیا ہے اس کا سبب بہت کچھ سمجھ میں آجاتا ہے۔
- پانچویں یہ کہ ابتدائی ہندو مسلم مورخین (برنی، یحیی، امیر خسرو اور دوسرے مصنفین) نے تاریخ میں ناصحانہ عنصر پر زور دیا ہے۔ کیونکہ تاریخ اخلاقیات کی ایک شاخ اور اخلاقی اصولوں کا ذخیرہ سمجھی جاتی ہے۔

8.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ تاج الدین حسن نظامی مؤلف کتاب تاج المآثر نیشاپور میں پیدا ہوئے جب سن رشد کو پہنچے تو اپنے وطن کی داخلی جنگوں اور بدامنی کی وجہ سے وطن کو خیر آباد کہ کر غزنی (افغانستان) آیا، جو اس دور میں قلمرو بذل وسخاوت و قبلہ رفاہ وثروت تھی۔ ہندوستان میں فارسی میں تاریخ نویسی کا سلسلہ سلاطین دہلی کی حکومت کے دور سے شروع ہوا۔ چنانچہ طبقات ناصری، تاج المآثر، خزائن الفتوح، تاریخ فیروز شاہیہ، فتوح السلاطین، تاریخ مبارک شاہی، فتوحات فیروز شاہی وغیرہ اہم تاریخی کتابیں اسی دور میں لکھی گئیں۔ ان میں خزائن الفتوح نہایت مقفع اور مسجع عبارت میں لکھی گئی ہے۔

مصنف تاج المآثر نے ہندوستان میں قرون وسطی کے اولین دور کی تمدنی، تہذیبی اور سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ جو قاعدے قانون اور اصول و ضوابط قطب الدین ایبک اور التتمش نے وضع کیے تھے ایلیٹ اور ڈاؤسن نے انھیں نظر انداز کیا تھا۔ پروفیسر عسکری مرحوم نے ان کو پوری تاکید کے ساتھ پیش کیا ہے۔ تاج المآثر دہلی سلطنت کی پہلی سرکاری تاریخ ہے اور حسن نظامی کو پہلا مؤرخ مانا جاتا ہے۔ اس کتاب کو کبھی تاریخ اور کبھی ادب کا درجی دیا جاتا ہے۔ حسن نظامی نے 1191ء سے 1217ء تک کے کے واقعات کا ذکر کیا ہے۔ خصوصا قطب الدین ایبک کے دور کے واقعات کا تذکرہ کیا، ہیلیکن کچھ جانکاری محمد غوری اور التتمش کی بھی ملتی ہے۔ حسن نظامی کے مطابق درہم اور دینار نامی سکے قطب الدین ایبک نے چلائے تھے لیکن دیگر ذرایع سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی ہے۔

مسلم اشراف میں مذھبی کتب اور فقہ کے بعد تاریخ علم کا تیسرا اہم ذریعہ سمجھا جاتا تھا اس لیے 12 ویں صدی کے اختتام پر دلی سلطنت کے قیام کے بعد تاریخ نویسی اور اس کے مطالعے کو بڑی اہمیت دی گئی۔ ہند۔ ایرانی تاریخ نویسی کی روایت تاج الدین حسن نظامی سب سے اہم اور اساسی نام ہے۔ دہلی سلطنت میں تاریخ نویسی کی روایت جاری رہی اور نئی بلندیوں کو فخر مدبر، منہاج سراج اور ضیاءالدین برنی دہلی سلطنت کے کچھ اہم مورخین ہیں۔ جنوبی ہندوستان میں ایک دوسرا اہم مورخ عصامی ہے جس نے تاریخ نویسی کی فارسی روایت کو جنوبی ہند میں پہنچایا۔

8.6 کلیدی الفاظ (Keywords)

تاسیس	:	بنیاد
علم نجوم	:	ستاروں کا علم
خیاطی	:	درزی کا کام
دارالضرب	:	جہاں سرکاری سکہ ڈھالا جاتا ہے۔
ظروف	:	یہ ظرف کی جمع ہے جس کا معنی برتن آتا ہے۔
کاتب	:	لکھنے والا

تحریف : ردوبدل کرنا

فراخ دستی : مالداری

کشور : ملک

سن رشد : بالغ ہونے کا سال

8.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

8.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. تاج المآثر کے مصنف کون ہیں۔
2. تاج المااثر کا لفظی معنی کیا ہے۔
3. حسن نظامی کہاں پیدا ہوئے۔
4. نیشاپور کہاں واقع ہے۔
5. تاج المآثر کس سن میں لکھی گئی۔
6. تاج المآثر کس کی فرمائش پر لکھی گئی۔
7. تاج المآثر میں کس سن تک واقعات بیان ہوئے۔
8. تاج المآثر میں خاص طور سے کس سلطان کی تاریخ ہے۔
9. تاج المآثر کا انداز بیان کیا ہے۔
10. تاج المآثر کس زبان میں ہے۔

8.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. تاریخ نویسی کسے کہتے ہیں۔
2. دہلی سلطنت کے چند اہم مورخین بتائے۔
3. تاج المآثر کی اہمیت بیان کیجیے۔
4. حسن نظامی پر ایک مختصر مضمون لکھیے۔
5. تاج المااثر کی دو اہم خصوصیات کا ذکر کیجیے۔
6. حسن نظامی کو اہمیت کیوں دی جاتی ہے بیان کیجیے۔

8.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. حسن نظامی کی تاریخ نویسی کے انداز پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔
2. 13ویں صدی میں تحریر کردہ اہم تاریخی کتب پر بحث کیجیے۔
3. حسن نظامی عہد سلطنت کا سب سے اہم مؤرخ کیوں مانا جاتا ہے۔
4. حسن نظامی اور فخر مدبر کی لکھی ہوئی تحریروں کا موازنہ کیجیے۔
5. حسن نظامی کی کتاب تاج المآثر کی خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔

8.8 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. عہد وسطیٰ کے مورخین۔ پروفیسر محب الحسن
2. تاج المآثر، حسن نظامی
3. جدید تاریخ، مبارک علی
4. مسلم تاریخ نویسی کی تاریخ فرنزروز نتھل
5. ابتداء سے تاریخ گب ہملٹن

اکائی 9۔امیر خسرو

(Amir Khusrau)

اکائی کے اجزا

9.0		تمہید
9.1		مقاصد
9.2		مورخ کا دائرہ مطالعہ
9.3		امیر خسرو کے حالات زندگی
9.4		مورخ کے ذرائع معلومات
9.5		امیر خسرو کا فلسفۂ تاریخ
9.6		حقائق کی تعبیر
9.7		اکتسابی نتائج
9.8		کلیدی الفاظ
9.9		نمونہ امتحانی سوالات
	9.9.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	9.9.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	9.9.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
9.10		مزید مطالعہ کے لیے تجویز کردہ کتابیں

9.0 تمہید (Introduction)

ہندوستان کے قرون وسطی میں ترکوں کی سلطنت کے قیام کے ساتھ ہی فارسی تاریخ نویسی کو فروغ حاصل ہوااور ان ترک سلاطین کی سرپرستی میں علمائے علم وادب نے مختلف قسم کاتاریخی ادب تخلیق کیا۔ یہ تاریخی تحریریں اس عہد کے سیاسی عمل، رجحانات، نظام سلطنت، مروجہ اخلاق اور ہندوستان میں ابھرتے ہوئے مسلم سماج کے مزاج اور اس کے رخ کو سمجھنے میں ہمیں مدد کرتی ہیں کیونکہ ان مورخین نے وقوع پذیر سیاسی و ثقافتی اہمیت کے حامل واقعات اور پیدا شدہ تبدیلیوں کو تحریر کیا۔ منہاج السراج، حسن نظامی، فخر مدبر، ضیاءالدین برنی، شمس سراج عفیف وغیرہ پیشہ ور مورخ تھے اور ان کی تاریخی تحریریں اپنے اسلوب بیان، صنف ادب، نظریہ، طریقہ تحریر اور مضمون کے لحاظ سے مختلف نوعیت کی حامل ہیں۔

عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں امیر خسرو ایک ایسی ہمہ جہت اور نمایاں شخصیت ہیں جو ہندوستان اور ہندوستانی ماحول سے بھرپور اور بے پناہ محبت والفت رکھتے تھے اور علم وادب کے مختلف میدانوں کے ماہر شہوار تھے۔ امیر خسرو ہندوستان کے عظیم و ممتاز فارسی شاعر، مورخ ، فن درباری میں کامل، صوفی، موسیقی کے ماہر واختراع پسند اور دوزبانوں کے شائق تھے۔ امیر خسرو پانچ دیوانوں کے علاوہ چار مثنویوں اور دو ایسی نثروں کے خالق تھے جن کا مواد تاریخی ہے۔ یہ مواد سلطان بلبن کے عہد سے لے کر سلطان غیاث الدین تغلق کے دور تک کے چیدہ چیدہ منتخب حالات وواقعات پر مبنی ہے اور نظم ونثر میں تحریر کیا گیا ہے۔

9.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- امیر خسرو کے حالات زندگی سے واقفیت حاصل کر سکیں گے۔
- ان کے ذرائع معلومات (ماخذ) کا جائزہ لے سکیں گے۔
- امیر خسرو کے فلسفۂ تاریخ کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- امیر خسرو کی تاریخ تصنیفات سے واقف ہو سکیں گے۔
- ایک مورخ کے طور پر ان کی اہمیت کا اندازہ لگا سکیں گے۔

9.2 مورخ کا دائرہ مطالعہ (Historian's Area of Study)

امیر خسرو ایک عظیم شاعر وادیب مورخ، موسیقار، فلسفی اور ایک صوفی بزرگ کی حیثیت سے ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ بحیثیت شاعر ان کو اپنے معاصرین پر فوقیت حاصل ہے اور اس فوقیت کے درجہ پر آج تک امیر خسرو فائز ہیں۔ ان کی شعری تصنیفات غزلوں، مثنویوں اور قصائد پر مشتمل ہیں۔ ''تحفۃ الصغر (1272ء)، وسط الحیاۃ (1285ء)، غرۃ الکمال (1296ء)، بقیہ نقیہ (1316ء) اور نہایۃ الکمال (1325ء)''، ان کے اہم شعری دیوان ہیں۔ ان کے علاوہ انہوں نے خمس (خمسہ) یعنی پانچ مصرعوں پر مشتمل نظمیں ''مطلع الانوار

(1298ء) شیریں و خسرو (1298ء)، مجنوں و لیلیٰ (1299ء)، آئینہ سکندری (1299ء)، ہشت بہشت (1301ء) بھی لکھی ہیں۔ پروفیسر محمد حبیب لکھتے ہیں کہ ''امیر خسرو کی تمام تخلیقات کی خوبیوں کا جائزہ لینے کے لیے ایک دفتر درکار ہوگا۔'' ایک ہم عصر (تیرہویں اور چودھویں صدی عیسوی) کی حیثیت سے ان کی منظوم تصنیفات، اس عہد کے واقعات وافراد پر بڑی دلچسپ واہم روشنی ڈالتی ہیں۔ امیر خسرو کی زیادہ تر تخلیقات سلطان علاءالدین خلجی اور اس کے بیٹے سلطان مبارک خلجی کے دور میں رقم ہوئی ہیں۔ ''قران السعدین (1289ء)، مفتاح الفتوح (1291ء)، عاشقہ (دیول رانی خضر خان) (1315ء)، نہ سپہر (1318ء) اور تغلق نامہ (1320ء)'' ان کی تاریخی مثنویاں ہیں۔ ''قران السعدین'' میں امیر خسرو نے سلطان بلبن کے پوتے سلطان کیقباد کی اپنے باپ بغرا خاں سے ملاقات کا تذکرہ بڑے دلچسپ پیرایہ میں کیا ہے۔ 'قران السعدین کئی بیانیہ نظموں پر مشتمل ہے۔ اس میں وہ سوال وجواب اور گفتگو نظم کی گئی ہے جو باپ بغرا خاں حاکم لکھنوتی اور بیٹے دہلی کے سلطان معزالدین کیقباد کے درمیان ملاقات کے دوران ہوئی تھی۔ بقول کے۔ ایس۔ لال ''اس مثنوی میں خسرو کینہ توزی سے منگولوں کے خدوخال کی تصویر کشی کرتے ہیں جن کی سخت ناگوار قید میں ایک بار وہ پھنس گئے تھے۔'' امیر خسرو نے سلطان جلال الدین خلجی کی فتوحات کو ''مفتاح الفتوح'' میں نظم کیا ہے۔ مثنوی ''عاشقہ''، 'دیول رانی اور خضر خاں' پر سلطان علاءالدین کے عشق کے قصوں اور اس کی شادی سے متعلق واقعات پر مشتمل ہے۔ اس مثنوی کی ابتداء میں خسرو سلطان علاءالدین خلجی اور اس کے پیشروؤں کے فوجی کارناموں کا ایک تاریخی خاکہ پیش کرتے ہیں ساتھ ہی ان غیر یقینی حالات وواقعات کی جھلک بھی اس میں دیکھنے کو ملتی ہے جو سلطان علاءالدین خلجی کی موت سے قبل اور بعد میں پیش آئے تھے۔ یہ مثنوی خضر خاں کو پیش آئی مصیبتوں اور اس کی دردناک موت کے بیان پر ختم ہوتی ہے۔

''نہ سپہر'' ان کی پختہ عمر کی تخلیق ہے۔ اس مثنوی میں امیر خسرو نے سلطان مبارک خلجی کی فتوحات کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے تیسرے سپہر میں ہندوستان کی آب وہوا، پھلوں، زبانوں، فلسفہ، جادو وغیرہ کا بڑا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ ساتھ ہی اس عہد کے سماجی حالات کا ایک مستند، دلچسپ اور مفصل خاکہ پیش کرتے ہیں۔ امیر خسرو کی آخر عمر کی آخری مثنوی ''تغلق نامہ'' ہے۔ جس میں سلطان غیاث الدین تغلق کی خسرو خاں پر فتح اور تغلق دور حکومت کے چند ابتدائی واقعات اور سلطان علاءالدین خلجی کے بیٹوں و جانشینوں کی درماندگی کے واقعات کو تفصیل سے قلمبند کیا گیا ہے۔ امیر خسرو کی تصنیف ''اعجاز خسروی'' میں اس عہد کے نظام حکومت اور بعض اہم مہموں سے متعلق بڑی مفید معلومات ہمیں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ حالانکہ یہ انشاءپردازی پر ایک ضخیم تصنیف ہے جس میں عام دلچسپی کے مختلف مضامین پر بھی بحث کی گئی ہے۔ اے۔ بی۔ ایم۔ حبیب اللہ لکھتے ہیں ''یہ کتاب دراصل اپنی ادبی فنکاری اور تخلیقی صلاحیت کے اظہار کے طور پر لکھی گئی تھی مگر اس کے باوجود اس میں بعض اصل خطوط اور فرامین کا مواد موجود ہے جو امراء اور سلاطین کے ذریعہ تحریر کیے گئے تھے۔ ''مطلع الانوار'' بھی ان کی ایک دیگر کتاب اتنی ہی دلچسپ ہے جو اس عہد کے آداب ورسوم اور سماج پر روشنی ڈالتی ہے۔''

امیر خسرو کی ''خزائن الفتوح'' ایک نثری تصنیف ہے۔ اس کو حکمراں سلطان کے لیے لکھا گیا تھا جس کو انہوں نے مرصع ومشکل طویل طرز پر لکھا ہے۔ ''خزائن الفتوح'' میں سلطان علاءالدین خلجی کی دکن میں فتوحات کا مفصل تذکرہ ہے۔ یہ سلطان علاءالدین خلجی کے کمانڈر ملک کافور کے دکن میں انجام دئے گئے کارناموں کی ایک طرح سے سرکاری دستاویز ہے۔ سلطان علاءالدین خلجی کی تخت نشینی

1296ء کے واقعات سے لے کر 1311ء تک کے واقعات و حالات کا مرقع ہے۔ تکنیکی اعتبار سے یہی سلطان علاءالدین خلجی کے ابتدائی پندرہ سالہ دور حکومت کے سلسلہ وار واقعات و حالات کی ایک ہم عصر تاریخ ہے۔اس لیے اس کی تاریخی اہمیت کے تعلق سے کوئی مبالغہ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ضیاءالدین برنی نے بھی سلطان علاءالدین خلجی کی موت کے کافی بعد ''تاریخ فیروز شاہی'' کو لکھا تھا۔ یہ ایک بہت دلچسپ اور بڑی اہمیت کی حامل تاریخ ہے۔ کنور محمد اشرف لکھتے ہیں کہ ''امیر خسرو نے کچھ واقعات کا عینی مشاہدہ کیا تھا حتیٰ کہ جنوبی ہند کے واقعات و حالات کے بھی عینی شاہد تھے۔ یہ صرف ہم عصر تاریخی واقعات اور حقائق ہیں جو قابل تعریف صحت اور وسیع تر تفصیلات کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔'' ''خزائن الفتوح'' میں امیر خسرو نے سلطان علاءالدین خلجی کے ذریعہ تعمیر کردہ عمارات، گجرات، چتوڑ، مالوہ، سواناوغیرہ میں اس کی فتوحات، جغرافیائی تفصیلات اور اس کے انتظامی اقدامات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

''افضل الفوائد'' اور ''راحۃ المحبین'' جو ان کی آخری عمر کی نثری تصنیفات ہیں بالترتیب 1313ء تا 1315ء اور 1319ء اور اس کے بعد کے برسوں پر ان کے پیر و مرشد حضرت نظام الدین اولیاء کی ان مجالس کی گفتگوؤں (ملفوظات) پر مشتمل ہیں جن میں امیر خسرو بھی شریک تھے۔ یہ ملفوظات اس عہد کی معاشرتی و مذہبی زندگی کے بڑے اہم گوشے اجاگر ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی حضرت نظام الدین اولیاء کے صوفیانہ کاموں اور امیر خسرو سے ان کی نزدیکی قربت و تعلق پر بڑی اہم روشنی پڑتی ہے۔

امیر خسرو کے یہ سب تاریخی کام ان کے عہد کی تسلسل کے ساتھ لکھی تاریخ نہیں ہیں بلکہ انہوں نے اپنے دور کے سلاطین کے چیدہ چیدہ اہم کاموں کو نظم و نثر میں قلمبند کیا ہے جو سلطان بلبن کے عہد سے لے کر سلطان محمد بن تغلق کے دور کا احاطہ کرتے ہیں۔ امیر خسرو کی تاریخی کتب کم و بیش چالیس سال (1285ء تا 1325ء) کے اس دلچسپ دور کے منتخب شدہ واقعات و حادثات پر مشتمل ہیں۔ جس عہد میں مصنف نے زندگی گزاری تھی اور اکثر بیان کردہ واقعات کا انہوں نے بذات خود مشاہدہ بھی کیا تھا۔

9.3 امیر خسرو کے حالات زندگی (Amir Khusrau's Biography)

امیر خسرو 1253ء میں یوپی کے ضلع ایٹہ کے شہر پٹیالی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا پورا نام ابوالحسن عین الدین تھا، امیر خطاب اور خسرو تخلص سے شہرت حاصل کی۔ آپ کے والد امیر سیف الدین محمود ترکستان کے ایک شہر کش سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے، وہ ترکوں کے قبیلے لاچین کے سردار تھے۔ وسط ایشیاء پر چنگیز خاں کے حملوں نے امیر خسرو کے والد امیر سیف الدین محمود کو ہندوستان کی جانب ہجرت کرنے پر مجبور کیا تھا۔ یہ تو علم نہیں کہ یہ کب وارد ہندوستان ہوئے لیکن تاریخ سے اتنا علم ہوتا ہے کہ وہ سلطان التتمش کی فوج میں ایک اہم عہدہ پر فائز تھے۔ التتمش نے انھیں پٹیالی میں جاگیر عطا کی تھی۔ ان کی والدہ ہندو تھیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک اعلیٰ افسر رہے ہونگے۔ آٹھ سال کی عمر میں امیر خسرو والد کے سائے سے محروم ہوگئے۔ اب پرورش و تعلیم کی ذمہ داری نانا عماد الملک نے سنبھالی۔ بیس سال کی عمر کو پہنچے تھے کہ نانا بھی داغ مفارقت دے گئے۔ امیر خسرو بچپن سے ہی بڑے ذہین تھے، جلد ہی ابتدائی علوم حاصل کر لیے اور پندرہ برس کی عمر میں مروجہ درسی علوم و فنون میں فراغت حاصل کرلی۔ خطاطی اور خوش نویسی بھی سیکھی اور آواز بھی عمدہ تھی۔ کم عمر میں ہی شعر کہنے لگے

تھے۔ کئی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ شعرائے گذشتہ کا کلام بھی نظر سے گذر چکا تھا جس سے فکر و نظر میں پختگی پیدا ہوئی۔

خسرو کی دربار سے وابستگی کا سلسلہ سلطان غیاث الدین بلبن کے ایک امیر کتلو خان یا کشلو خان المعروف بہ ملک چھجو کے یہاں ملازمت سے ہوا۔ اس کی تعریف میں آپ نے کئی قصیدے لکھے ہیں۔ کسی سبب ملک چھجو سے دلبرداشتہ ہو کر بلبن کے بیٹے بغرا خاں کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ یہاں پر آپ کی بڑی قدر و منزلت ہوئی۔ 1280ء میں لکھنوتی (بنگال) کے حاکم طغرل کی بغاوت کو فرو کرنے کی بلبن کی مہم میں بغرا خاں کے ساتھ امیر خسرو بھی شریک مہم تھے۔ بغاوت کو ختم کرنے کے بعد بغرا خاں کو لکھنوتی بنگال کا حاکم مقرر کیا گیا لیکن امیر خسرو کا دل بنگال میں نہ لگا۔ حالانکہ بغرا خاں اور اس کے میر منشی شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر نے جو امیر خسرو سے بڑی محبت کرتے تھے، آپ کو بنگال میں روکنا چاہا مگر آپ دہلی واپس آ گئے۔ لکھنوتی سے واپسی کے بعد سلطان بلبن کا بڑا بیٹا سلطان محمد جو اس وقت ملتان کا حاکم تھا اور ملتان اس زمانے میں دہلی کے بعد علم و ادب کا سب سے بڑا مرکز تھا، وہ خسرو اور ان کے جگری دوست حسن علاء سجزی کو اپنے ساتھ ملتان لے گیا۔ خسرو کا پانچ سال تک ملتان میں قیام رہا۔

1285ء میں شہزادہ اور ولی عہد سلطنت سلطان محمد، منگولوں سے جنگ کرتے ہوئے شہید ہوا اور ایک تاتاری نے خسرو کو بھی گرفتار کر لیا۔ پتا نہیں اس قید سے کس طرح رہائی نصیب ہوئی۔ رہائی سے آزادی ملی تو پٹیالی آ کر اپنی والدہ کا دیدار کیا۔ اس کے بعد دہلی واپس آئے اور بلبن کے دربار میں پہنچ کر خان شہید سلطان محمد کا جو پر درد مرثیہ لکھا تھا وہ پڑھا۔ شعر العجم میں علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ دربار میں کہرام مچ گیا سلطان بلبن اتنا رویا کے بخار آ گیا اور بالآخر اسی صدمے اور بخار سے تیسرے دن اس کا انتقال ہو گیا۔ سلطان بلبن کے بعد اس کا پوتا کیقباد، دہلی کا سلطان بنا جو امیر خسرو کا بڑا مداح تھا۔ امیر خسرو نے کیقباد کی استدعا پر اس کی اور اس کے والد بغرا خاں کی ملاقات کا حال 1289ء میں ''قران السعدین'' میں نظم کیا ہے۔

سلطان کیقباد کی وفات کے بعد جلال الدین فیروز خلجی تخت نشین ہوا۔ سلطان جلال الدین خلجی خود شاعر اور شعر فہم تھا۔ اس نے معقول مشاہرہ دے کر امیر خسرو کو اپنا ندیم خاص مقرر کیا اور مصحف برداری اور امارت کا عہدہ دے کر خلعت سے بھی نوازا اور 'امیر' کا خطاب بھی عطا کیا۔ ''مفتاح الفتوح'' میں خسرو نے سلطان جلال الدین خلجی کی تاج پوشی اور اس کے دیگر حالات کو نظم کیا ہے۔ 1295ء میں سلطان جلال الدین خلجی کو اس کے بھتیجے اور داماد علاء الدین خلجی نے قتل کر دیا اور خود تخت نشین ہوا۔ خسرو اکیس سال تک سلطان علاء الدین خلجی کے دربار سے منسلک رہے جو بحیثیت شاعر ان کے عروج کا دور تھا۔ امیر خسرو نے سلطان علاء الدین خلجی کی فتوحات کو نثر میں ''خزائن الفتوح'' کے نام سے رقم کیا ہے۔ نیز اپنی پانچ تاریخی مثنویاں (خمس/خمسہ) بھی سلطان علاء الدین خلجی کے نام معنون کی ہیں۔ اس سلطان کے ولی عہد خضر خاں اور دیول رانی کے عشق کی کہانی بھی ایک مثنوی بنام ''عاشقہ'' میں بیان کی ہے۔

سلطان علاء الدین خلجی کے بعد اس کا جانشین قطب الدین مبارک خلجی (1316ء) بھی جو ایک عیاش اور سبک سر سلطان تھا، امیر خسرو پر بہت مہربان رہا اور قدر دانی میں وہ سب سے بڑھ گیا۔ جب امیر خسرو نے مثنوی ''نہ سپہر'' لکھی تو ان کو ہاتھی کے وزن کے برابر تول کر

روپئے انعام میں دیا تھا۔ لیکن یہ سلطان جلد ہی اپنے نو مسلم غلام خسرو خاں کے ہاتھوں قتل ہوا۔ مگر خسرو خاں کو چار ماہ سے زیادہ حکومت کرنا نصیب نہ ہوا۔ اس کے بعد سلطان غیاث الدین تغلق تخت نشین ہوا۔ یہ سلطان بھی امیر خسرو کا بڑا قدردان اور مربی تھا۔ امیر خسرو نے ''تغلق نامہ'' میں سلطان غیاث الدین تغلق اور خسرو خاں کی کشمکش کا بڑی تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔ سلطان غیاث الدین تغلق اخیر عمر میں جب لکھنوتی کی مہم پر گیا تھا تو امیر خسرو بھی اس کے ہمراہ تھے۔ اسی اثناء میں ان کے پیر و مرشد حضرت نظام الدین اولیاء کا انتقال ہو گیا۔ انتقال کی خبر سن کر امیر خسرو نے اپنے کپڑے چاک کیے، خاک پر لوٹے اور یہ شعر پڑھا۔

گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈارے کیس

چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چہوں دیس

پیر و مرشد حضرت نظام الدین اولیاء کی جدائی میں امیر خسرو کا دل نہ صرف شاعری سے بلکہ زندگی سے بھی بیزار ہو گیا تھا۔ آخر کار چھ ماہ بعد 28 ستمبر 1325ء کو اس دار فانی سے کوچ کیا اور اپنے پیر و مرشد کے قرب میں دفن ہوئے۔ امیر خسرو آٹھ سال کی عمر سے ہی شیخ نظام الدین اولیاء کی خدمت میں آتے جاتے تھے اور بیس سال کی عمر میں (1272ء) آپ سے بیعت کی تھی۔ امیر خسرو کو اپنے مرشد سے اور سلطان المشائخ کو اپنے مرید سے بے پناہ محبت تھی۔ حضرت نظام الدین اولیاء امیر خسرو کو ''ترک'' یا ''ترک اللہ'' کہہ کر مخاطب کرتے تھے، صرف امیر خسرو ہی اپنے مرشد کی خلوت میں جانے کے مجاز تھے۔ دوسرے مرید مرشد کی توجہ حاصل کرنے کے لیے اکثر امیر خسرو کو ہی اپنا وسیلہ بناتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاء شیخ برہان الدین غریب سے کسی سبب ناراض تھے تو انہوں نے امیر خسرو کی معرفت ہی عرض معروض کر کے اپنی خطا بخشوائی تھی۔

امیر خسرو ایک طرف جہاں دربار سلاطین سے وابستہ رہے وہیں دوسری جانب حضرت نظام الدین اولیاء کی بارگاہ سے کسب فیض بھی جاری رکھا۔ امیر خسرو کے بیشتر اشعار میں ان کا تخاطب ان کے پیر و مرشد کی جانب ہی ہے، جو خود اپنے چہیتے مرید کی عاشقی اور سوز دل کے قائل تھے اور امیر خسرو نے بھی اپنی شاعری کو درجہ کمال تک پہنچا دیا۔ امیر خسرو کو اپنے اہل خاندان سے بہت محبت تھی۔ اپنی والد کی محبت میں وہ ملازمت چھوڑ کر دہلی آ گئے تھے۔ ان کی والدہ ہندی الاصل تھیں۔ اپنے نانا عماد الملک عارض ممالک، جن پر امیر خسرو کو بڑا ناز تھا، کے متعلق لکھا ہے کہ وہ سیاہ رنگت کے تھے عماد الملک پان کھانے کے بہت شوقین تھے۔ چالیس پچاس نوکر پان بنانے اور کھلانے پر ان کے یہاں مامور تھے۔ ملکی معاملات میں صلح پسند تھے اور ایک کامیاب سیاست داں جو ہر ہندو راجہ (رائے) کو حکومت کا وفادار بنانے میں ماہر تھے۔ ان کے پاس دو سو ترک اور دو ہزار ہندوستانی غلام تھے۔ امیر خسرو نے 1298ء میں اپنی والدہ اور بھائی حسام الدین کی وفات پر بڑے پر درد مرثیے لکھے۔ امیر خسرو کے زندگی کے آخری چھ ماہ اپنے مرشد کے غم وصال میں گذرے اور اسی غم فراق کے عالم میں اپنے مرشد سے جا ملے۔

امیر خسرو ان خوش نصیب شعراء میں سے ایک ہیں جن کو اپنی زندگی میں ہی بے مثال شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔

9.4 مورخ کے ذرائع معلومات (Historian's Sources of Information)

طوطئ ہند امیر خسرو کا پیدائشی تعلق اس خانوادے سے تھا جس کا شمار طبقہ امراء میں ہوتا تھا۔ ان کے والد عہد التتمش کے ایک امیر اور والدہ سلطان بلبن کے عارض ممالک عماد الملک کی بیٹی تھیں۔ اس پس منظر میں خسرو کے شروع سے ہی دربار سے وابستہ افراد سے مراسم تھے۔ امیر خسرو نے سلطان بلبن، کیقباد، جلال الدین خلجی، علاء الدین خلجی، مبارک شاہ خلجی، غیاث الدین تغلق اور محمد بن تغلق جیسے سلاطین کا زمانہ حکومت پایا تھا نیز ان کے درباری ملازم تھے۔ ایک سرکاری عہدہ دار اور درباری کی حیثیت سے جہاں امیر خسرو کے سلاطین دہلی کے ساتھ تعلقات تھے وہیں دربار کے امراء، فوجی سپہ سالاروں، صاحبان علم وادب، قابل ذکر افراد اور کارکنان حکومت سے بھی نجی تعلقات تھے۔ جس کے باعث انھیں سرکاری دستاویزات و فرامین شاہی تک رسائی اور سیاسی معاملات کا صحیح علم حاصل کرنے کے بہترین مواقع میسر تھے بلکہ بہت سے واقعات و حالات کے وہ خود چشم دید بھی تھے۔ ''خزائن الفتوح'' کی متعدد جغرافیائی تفصیلات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان علاء الدین خلجی کی دکن کی مہموں کے سلسلے میں بیان کردہ مناظر سے مصنف کم از کم چند واقعات کے چشم دید گواہ تھے۔ اسی کے ساتھ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء کے مرید خاص اور ان کی خانقاہ سے وابستہ افراد کے ساتھ نزدیکی تعلق ہونے کے باعث امیر خسرو کو صحیح سماجی حالات کا علم حاصل کرنے کے نادر مواقع میسر تھے۔ ساتھ ہی حضرت نظام الدین اولیاء کے مرید امیر حسن علاء سجزی اور ضیاء الدین برنی جیسے لوگ جو دربار سے بھی وابستہ تھے امیر خسرو کے جگری دوست تھے، جو ان کے زمانے کے حقائق کے تعین کا ایک اور مستند ذریعہ بھی تھے۔ امیر خسرو کی تاریخی و شعری تخلیقات 35 برسوں (1289ء تا 1325ء) کے دوران قلمبند ہوئیں جو مختلف موضوعات پر موقع موقع پر لکھی گئیں۔ امیر خسرو نے اپنی تاریخی کتب و مثنویوں کو زمانی ترتیب کے لحاظ سے تحریر نہیں کیا ہے اور کہیں بھی اپنے آپ کو بحیثیت ایک مورخ ہونے کا دعویٰ پیش نہیں کیا۔ کیونکہ وہ ایک پیشہ ور مورخ نہیں تھے بلکہ ایک شاعر تھے۔

پروفیسر سید حسن عسکری لکھتے ہیں کہ ''امیر خسرو کا انتخاب بڑا من مانا ہے اور جن واقعات اور موضوعات پر انہوں نے بحث کی ہے۔ ان میں پوشیدہ بنیاد ان کے انتخاب سے میل نہیں کھاتی۔ لیکن بیشتر معاملات میں اصول انتخاب انہوں نے اپنی مرضی سے نہیں بلکہ دوسروں کے کہنے سے بنایا ہے۔'' واقعتا امیر خسرو کا تعلق تصوف و سلوک سے ہونے کے سبب ان کو صرف خوبیوں سے سروکار تھا اسی لیے برائیوں کو نظر انداز کرتے تھے۔

پروفیسر جگدیش نرائن سرکار کہتے ہیں ''ان تصانیف میں سے کچھ تو انعام و اکرام کی توقع پر یا اظہار تشکر کے واسطے یا پھر ادبی شہرت حاصل کرنے کے لیے لکھی گئی تھیں۔ امیر خسرو مورخ سے زیادہ شاعر اور جانبدار مصنف سے زیادہ مداح خواں تھے۔ ان سب باتوں نے ان کی ادبی اور تاریخی تصانیف پر اثر ڈالا۔'' حالانکہ ''مفتاح الفتوح'' میں امیر خسرو واضح طور پر لکھتے ہیں کہ بعض مرتبہ ان کو ترغیب ہوتی تھی کہ وہ غلط باتیں بھی شامل تحریر کر دیں لیکن وہ ہمیشہ حق پر جمے رہے کیونکہ ''صداقت ایک قابل تعریف چیز ہے۔''

فی الحقیقت امیر خسرو کی تصانیف اہم و معتبر تاریخی اسناد کا درجہ رکھتی ہیں۔ کے۔ ایس، لال لکھتے ہیں ''خسرو کی تصانیف کی ایک بڑی

خصوصیت تاریخوں کی کثرت ہے جو مجموعی طور پر قابل اعتماد ہیں اور تاریخی ترتیب کے سلسلے میں ان پر برنی سے زیادہ بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن خسرو کا ذوق نیز ان کی سرگرمیاں مختلف شعبوں پر حاوی تھیں لہٰذا وہ برنی کی طرح اچھے مورخ نہیں تھے۔'' یہاں جگدیش نرائن سرکار کی اچھے مورخ سے مراد اس پیشہ ورانہ مہارت اور منہاجیات سے ہے جو برنی نے ''تاریخ فیروز شاہی'' لکھتے وقت برتی تھی۔

امیر خسرو اپنی تصانیف میں متعدد جگہ اپنے ماخذ کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں جیسے ''وہ نصیباں اور آفات سماوی جن کے متعلق پہلے کبھی سنا کرتا تھا اب خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لی ہیں۔'' یا ''یہ باتیں اس شخص کے دکھی دل سے نکلی ہیں جو اس حادثے کا چشم دید گواہ تھا۔'' نیز ''ایک شخص نے جو معاملات سے بہت اچھی طرح واقف تھا یہ بتایا کہ جب غازی ملک (غیاث الدین تغلق) کو یہ معلوم ہوا کہ خسرو خاں سرسوتی تک پہنچ چکا ہے تو غنیم کی کثیر تعداد فوج سے خوف زدہ ہونے کے بجائے خوش ہوا۔ اپنی توقعات کی بنا پر اس نے اس طرح کی خوشی اور دل لگی اور اظہار کیا جیسے ایک خونخوار بھیڑیا بھیڑوں اور مینڈھوں کی کثیر تعداد دیکھ کر کرتا ہے۔''

امیر خسرو عام طور پر اپنے اطلاع دینے والے کا نام نہیں لکھتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے تحریر کردہ واقعات کے ثبوتوں کا باقاعدہ نقادانہ انداز میں استعمال نہیں کیا اور اپنے ذرائع معلومات کو اس طرح ظاہر نہیں کیا جس طرح ضیاء الدین برنی یا عفیفؔ نے کسی حد تک کیا ہے۔ امیر خسرو نے مذہبی و اخلاقی اصطلاحات کی زبان میں لکھا لیکن سچ لکھا۔

9.5 امیر خسرو کا فلسفۂ تاریخ (Amir Khusrau's Philosophy of History)

موجودہ دور میں اک مورخ کا کام واقعات و حادثات کے اسباب و علل اور ان قوتوں کو تلاش کرنا ہوتا ہے جو واقعات کو ایک مخصوص شکل دیتے ہیں۔ وہ ماضی کے واقعات و حادثات کی تحقیقی اور ان کے تنقیدی تحلیل معروضی انداز میں کرتا ہے تاکہ تاریخ کی معروضی ترجمانی کر سکے۔ اسی لیے وہ مختلف نوعیت کی دستیاب ماخذی اشیاء کی جانچ پڑتال کرتا ہے تاکہ سچائی تک رسائی ممکن ہو سکے۔ لیکن عہد وسطیٰ میں نظریۂ تاریخ آج کے دور سے بہت مختلف تھا۔ اس عہد میں تاریخ کی کتابیں خطیبانہ اور شاعرانہ انداز میں لکھی جاتی تھیں جن میں ضرورت سے زیادہ مبالغہ آرائی کا امکان ہوتا ہے جو اس زمانے کا ایک خاص طرز تھا۔ امیر خسرو اسی دور سے تعلق رکھتے تھے اور بنیادی طور پر ایک درباری شاعر اور انشاء پرداز تھے۔ اس سبب، ان کی اپنی محدودات بھی تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ ان کا تعلق مذہبی اور صوفیانہ پس منظر سے بھی تھا۔ اس لیے علمی راست بازی ان کے کردار و عمل کا حصہ تھی۔ لیکن اس زمانے کا درباری ماحول، بے جا دخل اندازی اور مطلق العنانیت سے بھرا ہوتا تھا۔ سید حسن عسکری کے مطابق ''مورخ و شاعر کے لیے قابل گرفت باتوں کو راز رکھنا ضروری تھا۔ وقت کے مضحکہ خیز رواجوں کے مطابق اس بات کی اجازت تو تھی کہ استعمال انگیز تفصیلات کے بعض حصوں کو چھوڑ دیا جائے۔ بڑے رنگین انداز میں طویل نویسی کی جائے، حقائق کو ادب کی چاشنی کے ساتھ پیش کیا جائے اور اعلیٰ عہدہ داروں کے کردار اور سیرت کے بارے میں لکھا جائے۔''

امیر خسرو ایک صاحب طرز انشاء پرداز اور بے مثال شاعر ہونے کی وجہ سے بڑی مرصع و مزین عبارت لکھنے میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ حالانکہ انہوں نے درست تاریخی حالات رقم کیے ہیں اور بعض ایسے حقائق لکھے ہیں جن پر دوسروں کی نظریں نہ پڑ سکیں۔ لیکن اس کے

باوجود انہوں نے سارے معلوم حقائق قلمبند نہیں کیے اور یہ ان کے درباری شاعر ہونے کی مشکلات و محدودات کی وجہ سے تھا۔ بنیادی طور پر امیر خسرو شاعر و انشاء پرداز تھے تاریخ سے انھیں وہ لگاؤ اور دلچسپی نہ تھی جو ان کے دوست ضیاءالدین برنی کو تھی۔ وہ ایک کشادہ و روادارانہ ذہن کے مالک، غیر جانبدار اور عالی ظرف شخص تھے۔ ان میں احساس وقار کے ساتھ منصبی احساس ذمہ داری بھی خوب تھا۔ امیر خسرو میں مورخانہ دیانت داری تو تھی مگر تاریخ نویسی ان کے لیے حکمراں سلاطین کے حکم کی بجاآوری تو تھی لیکن دلی خواہش نہ تھی۔ تاریخ ان کے لیے صرف عصری تاریخ تھی جو انعام و اکرام کی امید یا غیر فانی شہرت کی خواہش کی بنیاد پر ہو سکتی تھی۔ سید حسن عسکری لکھتے ہیں ''ان کی ساری تاریخی کتابیں بے ربط موضوعات سے بھری ہوئی ہیں جن میں رنگین خیالی اور طوالت آمیز انداز بیان، مبالغہ آمیز لہجے، فنی و ادبی ترکیبوں، شاعرانہ تشبیہوں، استعاروں اور مختلف اصناف سخن کے استعمال کی وجہ سے تاریخوں کا تسلسل کم ہے اور ان ہی چیزوں پر تاریخی اور جغرافیائی باریک بینی، درستی اور تسلسل قربان کر دئے گئے۔''

ان تمام باتوں کے باوجود اگر امیر خسرو کی تحریروں سے طرز بیان کے پر شکوہ الفاظ کی بازی گری اور شاعرانہ مبالغہ آرائی کو صاف یا نظر انداز کیا جائے تو وہ اپنے عہد کی سیاسی اور سماجی تاریخ کی ایک عمدہ اور صحیح تصویر پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ اگر جانبدارانہ انداز میں دیکھیں تو امیر خسرو ایک مورخ تھے جن کے کاموں کی بڑی تاریخی اہمیت ہے اور جو کچھ انہوں نے لکھا وہ ان کے دور کی از سر نو تعبیر پیش کرنے کے لیے انتہائی اہم مواد ہے جس کو کسی بھی صورت میں کم نہیں چانچا جا سکتا۔ حالانکہ مورخانہ بصیرت اور مروجہ تاریخ نویسی کے اصولوں کو بنیاد بنا کر تاریخ لکھنے کی صلاحیت ان میں بدرجہ اتم موجود تھی، لیکن ان پر حاوی شاعر نے انھیں ایسا نہ کرنے دیا اور تاریخ ان کے لیے صرف عصری روداد بن گئی جس کو ادبی مہارت اور چابک دستی کے ساتھ پیش کیا جائے۔

9.6 حقائق کی تعبیر (Interpretation of Facts)

خسرو بڑی ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ انہوں نے شاعر، ادیب، صوفی، ماہر موسیقی، شاہی ندیم، سپاہی وغیرہ کی حیثیت سے زندگی کے مختلف تقاضوں و ذمہ داریوں کو بڑی خوبی و خوش اسلوبی کے ساتھ نبھایا تھا۔ ساتھ ہی امیر خسرو اپنے عہد کے ذہین ترین شخص اور اختراعی ذہن کے مالک تھے جن کی عمر کا طویل عرصہ دربار، امراء اور سلاطین کی ہم نشینی میں گذرا تھا۔ اپنے عہد کی سیاست کو قریب سے دیکھنے اور اس کا حصہ رہنے کی وجہ سے واقعات و حقائق کے تعلق سے جو ہم عصر و حقیقی معلومات امیر خسرو کو راست طور پر حاصل تھیں وہ یقینا دوسروں کو آسانی سے میسر نہیں تھیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ہی ایک درباری ہونے کی وجہ سے ان کی اپنی محدودات بھی ہمیں اپنے ذہن میں رکھنی ہوں گی۔ امیر خسرو اپنی تحریروں میں واقعات سے اجتناب یا صرف نظر تو کرتے نظر آتے ہیں لیکن حقائق بڑی ایمانداری کے ساتھ اپنے قارئین کو پیش کرتے ہیں۔

مورخ کی حیثیت سے ''مفتاح الفتوح، خزائن الفتوح، تغلق نامہ'' وغیرہ میں جو معلومات و حقائق تحریر کیے ہیں وہ کسی اور کتاب میں ہمیں پڑھنے کو نہیں ملتے۔ ساتھ ہی ان کتابوں میں ایسی معلومات کی کمی نہیں ہے جن سے تہذیبی و سماجی معنی اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ امیر خسرو کی

عاشقہ (دیول رانی خضر خاں)، نہ سپہر، قران السعدین اور رسائل خسروی میں بھی ہمیں سیاسی اہمیت کے واقعات پڑھنے کو ملتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ہم عصر تہذیبی و سماجی زندگی کے تعلق سے قابل قدر معلومات فراہم کراتے ہیں۔ ''اعجاز خسروی (رسائل)'' کی چاروں جلدوں میں خطوط کے نمونے، فرامین و دستاویزات کا مواد بکھرا پڑا ہے۔ بنیادی طور پر امیر خسرو شاعر و ادیب تھے لہٰذا ان کا انداز تحریر اور طوالت بیان محققین کو خوف زدہ کرتا ہے کیونکہ ادبی رنگ ان پر ہمیشہ حاوی رہا۔ لیکن یہ سیاسی، سماجی، عقلی اور تہذیبی زندگی کے تعلق سے اہم اور مفید معلومات کا خزانہ ہیں۔ پروفیسر حسن عسکری کہتے ہیں کہ ''مورخ ضیاءالدین برنی اپنے نظریات کے ثبوت میں بعض مرتبہ ان ہی کا حوالہ دیتا ہے۔''

سلطان علاءالدین خلجی کے دور کے پہلے پندرہ سالوں (دیوگیر کی فتح سے لے کر وارانگل کی فتح تک) کی نہایت اور درست تاریخ ہمیں 'خزائن الفتوح' یا 'تاریخ علائی' میں پڑھنے کو ملتی ہے۔ جگدیش نرائن سرکار لکھتے ہیں، ''اس پر مصنف کے شاعرانہ مزاج، ادبی مہارت، سیاسی موقع پرستی اور ہندوستان نیز ہندوستانی چیزوں سے ان کے لگاؤ کی چھاپ پڑی ہوئی ہے۔ اس میں پیراگراف کے پیراگراف 'نسبت' (وہ استعارے، تشبیہات یا تلمیحات جو کسی شے سے اخذ کی گئی ہوں) پر مبنی ہیں۔ تحریر میں قوت بیان اور وقار پیدا کرنے کے لیے کثرت سے قرآن کی آیات کا استعمال کیا ہے۔'' خزائن الفتوح، میں امیر خسرو نے مادہ تاریخ اور ہندی الفاظ کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ وحید مرزا لکھتے ہیں ''خسرو کو اپنے شاہی سرپرست کے دور کے محض سال وار واقعات لکھنے کی ہی فکر نہ تھی بلکہ وہ اسے ادبی شہ پارہ بھی بنانا چاہتے تھے۔'' امیر خسرو شاعر ہونے کے سبب واقعات کو جمالیاتی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ 'خزائن الفتوح' میں وہ صرف سلطان علاءالدین کی فوجی مہمات و فتوحات کو ہی قلمبند نہیں کرتے بلکہ اس کے وہ کارنامے جن کا تعلق قیام سلطنت، استحکام سلطنت، نظم و ضبط اور وہ بندوبست و اقدامات جو عوام کی فلاح و بہبود کے لیے اٹھائے گئے تھے، ان کو بھی رقم کرتے ہیں۔ جگدیش نرائن سرکار آگے لکھتے ہیں ''امیر خسرو کی موقع پرستی نے انھیں مجبور کر دیا کہ وہ علاءالدین خلجی کی اس دغابازی کو نظرانداز کریں جو اس نے تخت حاصل کرنے کے لیے اپنے چچا (جلال الدین خلجی) سے کی تھی۔ امیر خسرو علاءالدین خلجی کے ذریعہ اپنے چچا اور خسر سلطان جلال الدین خلجی کے قتل کا حوالہ دئے بغیر سلطان علاءالدین خلجی کی تخت نشینی کو خدا کی مرضی سے تعبیر کرتے ہیں۔''

ایک درباری اور ندیم کی حیثیت سے بہت سے حقائق انھیں معلوم تھے لیکن اپنی درباری حیثیت اور اس کی محدودات انھیں ایسے بہت سے حقائق و واقعات کو نظرانداز کرنے پر مجبور کرتی ہے جو ان کے لیے کسی بھی طرح کی پریشانی کا موجب ہو سکتے تھے۔ اسی لیے سلطان جلال الدین خلجی کا علاءالدین خلجی کے ذریعہ ظالمانہ قتل کا ذکر کرنے سے گریز کرتے ہوئے وہ سلطان علاءالدین خلجی کی تاریخ کا بیان اس کی تخت نشینی سے کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اپنی غیر سرکاری تصنیف ''اعجاز خسروی'' میں بھی اپنے سرپرست سلطان کے ایسے کاموں کو نظرانداز کرتے ہیں۔ حضرت نظام الدین اولیاء جو امیر خسرو کے مرشد تھے کے، سلطان کیقباد، مبارک خلجی، غیاث الدین تغلق کے مابین کشیدہ و پریشان کن تعلقات کا ذکر بھی اپنی کسی تصنیف میں نہیں کرتے اور اس طرح کے واقعات سے صرف نظر کرتے ہیں۔ ہمیں اس طرح کے واقعات کا تفصیلی علم ضیاءالدین برنی کی ''تاریخ فیروز شاہی'' میں پڑھنے کو ملتا ہے۔

امیر خسرو مورخ، انشاءپرداز و شاعر کے ساتھ ساتھ صوفی بھی تھے اسی لیے انہوں نے بہت سے حقائق کو خطیبانہ انداز میں رقم کیا ہے۔ سلطان قطب الدین مبارک خلجی کے خسرو خاں کے ساتھ رشتے اور اس کی بغاوت کے ضمن میں ''تغلق نامہ'' میں لکھتے ہیں ''اس داستان کا بیان اتنا حکمی اور قطعی ہے کہ جو کچھ قطب الدین مبارک خلجی پر گذری وہ حق تعالیٰ کی طرف سے پہلے ہی مقدر میں لکھا جا چکا تھا۔''ان کی صرف ایک ہی قابل ذکر سطر خسرو خاں کے واقعہ کے پورے پس منظر کے بارے میں ہمیں بہت کچھ بتا دیتی ہے کہ ''اگر میرے (خسرو خاں) پاس ناموزوں حرکتیں نہ کی گئی ہوتیں تو ایسی باتیں مجھ میں پیدا نہ ہوئی ہوتیں، مجھ سے یہ غداری سرزد نہ ہوتی۔''سید حسن عسکری اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''یہ مختصر لیکن پر معنی جواب جو اس نے اپنے جرائم کی وضاحت کے لیے دیا، اصل سبب اور شاید ایک جائز شکایت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ برنی اس بات کو بالکل عریاں کر کے دکھاتا ہے۔''

غیاث الدین تغلق کے ہاتھوں خسرو خاں کی شکست، قطب الدین مبارک خلجی کے قتل کے ساتھ اس کے پانچ شہزادوں، وزیر خاں (پندرہ سال)، ابو بکر خاں (چودہ سال)، علی خاں اور بہادر خاں (دونوں آٹھ سال) اور عثمان خاں (پانچ سال) کا خسرو خاں کے ہاتھوں قتل، اس کا دہلی کے تخت پر غاصبانہ قبضہ وغیرہ، جیسے بدلتے ہوئے حالات کے امیر خسرو عینی شاہد تھے۔ امیر خسرو نے غیاث الدین تغلق کے ذریعہ خسرو خاں کی شکست سے لے کر اس کے تخت نشین ہونے تک کے تمام واقعات کو تفصیل کے ساتھ معہ دن و تاریخ کے قلمبند کیا ہے۔ امیر خسرو ایسے مواقع پر خطیب و ناصح کی طرح حکایتیں بھی بیان کرتے ہیں۔ جن کا مقصد ایسے حالات و واقعات سے اخلاقی سبق حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے۔ ساتھ ہی حکمرانوں اور صاحب اقتدار حضرات کو خبردار و آگاہ بھی کرتے کہ وہ اصول حکمرانی میں عادل، رحم دل اور منصف رہیں کیونکہ زیادہ تر چیزیں چند روزہ رہتی ہیں۔ امیر خسروؔ نے حکمرانوں کی بد چلنی اور لاپرواہی سے پیدا نتائج پر اپنی فصاحت خوب صرف کی ہے۔ سلطان قطب الدین مبارک خلجی کے بیان میں وہ لکھتے ہیں ''شراب اور عشق، شباب اور ہوس، لطف و انبساط، حکومت اور کامیابی، جس کا سر ان ہواؤں سے بھرا ہو، وہ مستقبل کا خیال اور فکر کیسے کر سکتا ہے؟ ایک حکمراں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ عشق اور ہوس میں غرق ہو جائے۔ ایک بادشاہ خدا کی مخلوق کا مستقل محافظ ہوتا ہے۔ لہٰذا ایسے سرپرست کے لیے شراب میں دھت رہنا غلط ہوگا۔ اگر گڈر یا خالص شراب کے استعمال سے اپنے آپ کو تباہ کرتا ہے تو اس کا ریوڑ بھیڑیئے کے پیٹ میں ابدی نیند سو جاتا ہے۔ قانون کے ذریعہ، جس کے معنی حکومت کے بنائے قانون اور قواعد ہیں، سیاسی معاملات میں استحکام چوکس اور خبردار رہنے سے رہتا ہے۔ جو شخص علاقوں کی ساری دولت اپنی مٹھیوں میں دبائے بیٹھا ہو، اس کے لیے یہ کہاں تک موزوں ہوگا کہ لاپرواہی سے پلنگ پر پیٹھ لگا کر سو جائے کیونکہ بالآخر وہ ندامت کے بوجھ سے دب جائے گا۔ یہ بات بادشاہ پر خاص طور پر صادق آتی ہے کیونکہ اس کھال کے نزدیک دوستوں سے زیادہ دشمن ہوتے ہیں۔''

بحیثیت مجموعی یہاں امیر خسرو حکمرانوں کو یاد دلا رہے ہیں کہ ان کا کام سلطنت کا استحکام، امن و آشتی کا قیام، عوام کی خوشحالی و ترقی ہوتا ہے۔ ذاتی عیش و طرب میں پڑ کر سلطنت تباہی کے غار میں گر جاتی ہے، بغاوتیں ہوتی ہیں اور حکومت کو زوال آجاتا ہے۔ امیر خسرو کیونکہ ایک شاعر و انشاءپرداز کے ساتھ صوفی بھی تھے لہٰذا روایتی تاریخ نویسی سے قطع نظر اس طرح کے سیاسی منظر نامے کے تعلق سے ایسے مشاہدات اور نظریات اور واقعات میں پوشیدہ اخلاقی پہلوؤں پر ان کی نظر پڑنا ضروری تھا۔

امیر خسرو نے جن حادثات و واقعات کو تحریر کیا ہے وہ تاریخ وار ترتیب اور باقاعدہ خیالات پر مبنی نہیں ہیں بلکہ اشخاص اور ان کی پسند کے پر کشش عنوانات کے تحت تحریر کیے ہیں۔ کیونکہ تاریخ کا ان کا ادراک تاریخی دستاویزات پر مبنی نہیں تھا بلکہ اب کے اپنے مشاہدات اور تجربات پر مبنی تھا۔ امیر خسرو نے جو لکھا وہ بڑے پر تصنع انداز میں لکھا کیونکہ وہ پیشہ ور مورخ کم اور شاعر و انشاء پرداز زیادہ تھے۔ اسی لیے وہ اپنے تاثرات و جذبات کا اظہار گاہے بگاہے کرتے نظر آتے ہیں۔ امیر خسرو صاحب اقتدار ہی نہیں بلکہ ایسے لوگوں کے متعلق بھی جنھیں وہ پسند نہیں کرتے بڑے ضبط و تحمل کے ساتھ لکھتے ہیں۔ لیکن ملک کافور اور مبارک خلجی کے مظالم کو نظر انداز نہ کر سکے اور وضاحت کے ساتھ حقائق لکھنے پر مجبور ہو گئے۔ سلطان مبارک خلجی کے متعلق ''عاشقہ'' (دیول رانی خضر خاں) میں لکھتے ہیں ''جب وہ بے رحم اور سنگ دل (بے مہر) سلطان بدخو و بدمزاج (ترش چہرہ) ہو گیا اور اپنے اعزاء و اقارب کی طرف سے دل میں کینہ رکھنے لگا تو اس نے اپنی سلطنت کے لیے ان کا خون بہانا مناسب سمجھا اور انھیں شمشیر آبدار کے لیے موزوں جانا۔ اس نے انتقام جو کینہ پرور بننے کا فیصلہ کیا تاکہ ملک میں کوئی اور حصہ دار نہ رہے۔''

امیر خسرو دہلی، یہاں کی مساجد، بلند و بالا میناروں، حوض شمسی، دار الخلافہ کے اندرونی و بیرونی حصار جو پہاڑوں پر بنے تھے، شہر نو، جمناندی کے قریب روضہ باغ وغیرہ کا تذکرہ بڑی مرصع و مسجع زبان میں کرتے ہیں۔ ''قران السعدین'' میں دہلی سے اودھ، ''تغلق نامہ'' میں دیپالپور سے دہلی، ''خزائن الفتوح'' میں دہلی سے دریائے نربدا اور کوہ وندھیاچل کے پار کے دور افتادہ علاقوں کے لیے جو راستہ اختیار کیے تھے ان سب کی جغرافیائی تفصیلات کا ذکر بڑے دلچسپ پیرائے میں کرتے ہیں۔ ''خزائن الفتوح'' تاریخ ہند میں ایک خاص افادیت و اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں سلطان علاء الدین خلجی کے ابتدائی پندرہ سالہ دور حکومت کے واقعات سلسلہ وار قلمبند لیے گئے ہیں۔ اس میں تحریر کردہ جغرافیائی اور دیگر تفصیلات سے یہ علم ہوتا ہے کہ ان میں سے کچھ واقعات کے امیر خسرو عینی شاہد تھے۔ اس میں امیر خسرو نے حقائق قابل تعریف صحت اور بھرپور تفصیلات کے ساتھ رقم کیے ہیں۔ پروفیسر کو ویل لکھتے ہیں کہ ''حالانکہ اس کا اکتسابی نتائج مبالغہ آمیزی اور استعاری تفصیلات سے پر ہے لیکن تاریخی حقائق خاص صحت کے ساتھ دئے گئے ہیں۔'' 'مطلع الانوار' میں امیر خسرو نے اپنے زمانے کے رسم و رواج اور اخلاقی حالت کی بھرپور نشاندہی کی ہے۔

''تغلق نامہ'' میں غیاث الدین تغلق کی فوج کا خسرو خاں کے خلاف کوچ کا مفصل حال، منزل بہ منزل جیسے عالم پور، ہانسی، روہتک، منڈولی، پالم، کشن پور وغیرہ میں قیام کے تفصیلات بیان کی ہیں۔ اس عہد کے تیز رفتار ڈاک کا نظام، ذرائع آمد و رفت اور رسل و رسائل پر بھرپور انداز میں روشنی ڈالتے ہیں۔ سلطان علاء الدین خلجی کی شمالی و جنوبی ہند کی فوجی مہمات کے تذکرے میں تاریخوں اور مہینوں کا ذکر کیا ہے۔ راستے میں آنے والے اہم مقامات، دریاؤں، پہاڑی درّوں اور ہیرے جواہرات کی فراوانی کا تذکرہ ہمیں امیر خسرو کے یہاں پڑھنے کو مل جاتا ہے اور اسی کے ساتھ ہندوستان سے ان کی بے پناہ محبت و شیفتگی کا بھرپور احساس قاری کو ہونے لگتا ہے۔ امیر خسرو کو اپنے ہندوستانی ہونے پر زبردست فخر ہے جس کا بار بار اظہار وہ اپنی تخلیقات میں کرتے ہیں۔ خسرو کے ذہن و فکر میں ہندوستانیت کا گہرا عنصر اور ہندوستان سے شدید محبت کا جذبہ ان کی ماں کی تربیت کا اثر تھا۔ امیر خسرو کو ہندو مذہب سے خاص واقفیت تھی۔ اپنی مثنویوں میں امیر خسرو نے جگہ جگہ تفصیل سے

ہندوستانی چیزوں کا دوسرے ملکوں کی چیزوں سے موازنہ کرتے ہوئے اپنے مادر وطن ہندوستان کی فوقیت وافضیلت ثابت کی ہے۔ ہندوستان اور اس کی ہر شے سے محبت ان کا جزو ایمان تھی۔

امیر خسرو اپنی مثنوی ''نہ سپہر'' میں ہندوستان کے جنت ارضی ہونے کے سات دلائل پیش کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔ (1) ہندوستان ہی وہ سرزمین ہے جہاں حضرت آدم جنت سے اخراج کے بعد جلاوطن کیے گئے، (2) طاؤس (مور) جو جنت کا پرندہ ہے ہندوستان میں پایا جاتا ہے۔ (3) سانپ بھی جنت سے نکالے جانے کے بعد ہندوستان میں ہی آیا اور اسی کو اپنا وطن بنالیا۔ (4) آدم سوائے ہندوستان کے ہر جگہ پریشان اور غمگیں رہے۔ (5) ہندوستان کے پھول خوشبودار ہوتے ہیں جبکہ فارس اور دیگر علاقوں کے پھولوں میں خوشبو اور بدبو نہیں ہوتی ہے۔ (6) پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا اس دنیا کی مسرتیں مومنوں کے لیے نہیں کافروں کے لیے ہیں اس لیے ہندوستان کی جنت ہندوؤں کو عطا کی گئی۔ اور (7) ہندوستان جنت نشان اس سبب سے ہے کہ اس کا سلطان قطب الدین مبارک خلجی ہے۔'' اس کے بعد وہ ہندوستان کی خراسان (ہندوستان کے باہر مسلمانوں کا وطن خراسان سمجھا جاتا تھا) پر فوقیت کے طور پر دس ثبوت پیش کرتے ہیں، ''ہندوستان کی آب وہوا خراسان کی طرح سرد نہیں ہے۔ لوگ گرمی کی بجائے سردی سے مرتے ہیں۔ گرم آب وہوا میں چند ہی کپڑوں کی ضرورت ہوتی ہے اور روزمرہ کی زندگی ارزاں ہوتی ہے۔ ہندوستان سدا بہار ملک ہے جب کہ خراسان میں چند ہفتوں کے لیے بہار آتی ہے۔ ہندوستانی پھولوں میں خوشبو بھی ہوتی ہے اور رنگ بھی، خراسانی پھولوں میں محض رنگ ہوتا ہے۔ ہندوستانی پھول مرجھانے کے بعد بھی خوشبودار رہتے ہیں۔ خراسان میں کیلے کی کاشت نہیں کر سکتے اس کے برعکس خراسان کے تمام پھل ہندوستان میں اگائے جاسکتے ہیں۔ ہندوستان میں کیلے کا نایاب پھل ہوتا ہے اور نایاب برگ پان ہوتا ہے۔'' ان دلائل کو پڑھ کر ہندوستان سے امیر خسرو کی سنجیدہ محبت کا علم ہوتا ہے۔ پروفیسر عزیز احمد لکھتے ہیں ''امیر خسرو نے ہندو قوم کی، غیر ملکیوں کے مذاق اور استہزاء کے خلاف جو طرف داری اور حمایت کی ہے وہ خراسانیوں اور مقامی گروہوں کی باہمی کشمکش کا مظہر ہے جو سلطنت دہلی کے عہد میں موجود تھی اور جو بعد میں محمد بن تغلق اور دکن کے بہمنیوں کے دور میں عروج کو پہنچ گئی تھی۔ خراسانی جو ہر ہندی کو احمق سمجھتے تھے، پان کے پتے کو بھی محض گھاس خیال کرتے تھے۔''

امیر خسرو نے بہت زور دے کر لکھا ہے کہ ''عقلی علوم، طبیعات، منطق، ریاضیات اور نجوم میں ہر ہمن کسی طرح بھی یونانیوں سے کمتر نہیں ہیں۔ ان کا نقص بس اتنا ہے کہ وہ مسلم شریعت سے ناواقف ہیں۔ ان کا علم وفضل اس لیے مخفی ہے کیونکہ مسلمان اس کو اپنے کام میں نہیں لائے۔ لیکن میں (خسرو) نے ان کے علوم کی تحصیل کی قدرے کوشش کی۔ ان (برہمنوں) کے رموز واسرار سے ایک حد تک باخبر ہو گیا۔'' یہاں وہ مسلمانوں کی ہندوستانی علوم وفنون سے عدم دلچسپی پر افسوس ظاہر کرتے ہیں۔

امیر خسرو نے مذہب اسلام کے بعد ہندومت کو مشرکین، زندیقوں، لاادریوں، پارسیوں حتیٰ کہ عیسائیوں کے مذاہب سے ارفع اور بہتر مانا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''ہندو پتھر، جانور، آفتاب، درخت اور پتوں کو پوجتے ضرور ہیں لیکن ان کی پرستش میں ایک اخلاص پایا جاتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب ایک ہی خالق کے مخلوق ہیں بذات خود خدا نہیں۔ وہ اس کی (خدا) اطاعت کے منکر نہیں ہیں، وہ ان چیزوں کی پوجا اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے آباء واجداد ان کی پوجا کرتے آئے ہیں، یہ اختراع وبدعت نہیں ہے۔ امیر خسرو البیرونی کی طرح ہندوؤں کے تصور و

حدانیت کے بھی معترف ہیں۔ ''ہندوؤں کی بت پرستی پر طنز کیا جاسکتا ہے لیکن ان کے عقیدے میں جو اخلاص ہے اس سے سبق لیا جاسکتا ہے۔'' امیر خسرو کا ماننا تھا کہ اکثر اعتبار سے ہندو مذہب کی روح اسلام سے مشابہت رکھتی ہے۔ مثلاً، توحید میں فناء بقا کے نظریات، اللہ تعالیٰ کی قوت تخلیق، مختار اور عالم جزو کل کے قائل ہیں۔ خلیق احمد نظامی کے مطابق ''اس حب الوطنی کا تقاضہ تھا کہ وہ (امیر خسرو) ہندوستان کی تہذیبی روح کو سمجھیں اور اس کے مخصوص سماجی تقاضوں کو پورا کیجیے۔ چنانچہ ان کی تصنیفات میں ایک ایسی فکر کارفرما نظر آتی ہے جس نے نہ صرف ہندوستانی تہذیب کے جلوۂ صد رنگ کو اچھی طرح سمجھا اور پہچانا بلکہ اس کے تہذیبی نقشے میں ہر ''دین'' اور ''ہر قبلہ گاہ'' کی جگہ اور اہمیت کو تسلیم کیا۔ مذہبی معاملات میں امیر خسرو بڑا وسیع مشرب رکھتے تھے۔ انہوں نے نہ صرف ہندو مذہب کو ہمدردانہ سمجھنے کی کوشش کی ہے بلکہ تمام مذہبی تعصبات اور تنگ نظری سے بالاتر ہو کر اسلام اور ہندو مذہب میں مشترکہ عناصر کی تلاش پر بھی زور دیا ہے۔''

امیر خسرو ہندوستانیوں کے دوسرے ممالک کے لوگوں پر فوقیت کے اسباب اس طرح تحریر کرتے ہیں: ''ہندوستانی دوسرے ممالک کے سائنسی علوم کا اکتساب کرتے ہیں جب کہ دوسرے ممالک کے لوگ ہندوستانی علوم سے ناواقف و نابلد ہیں۔ ہندوستانی غیر ملکی زبانیں بول سکتے ہیں لیکن غیر ملکی ہندوستانی زبانیں نہیں بول سکتے۔ پوری دنیا سے لوگ حصول علم کے لیے ہندوستان آتے ہیں جب کہ کسی بھی برہمن کو تحصیل علم کے لیے باہر جانا نہیں پڑتا۔ عربی عددی نظام، خاص طور پر صفر کا ہندسہ بھی ہندی الاصل ہے۔ کلیلہ ودمنہ دراصل ہندوستان میں تحریر ہوئی۔ شطرنج ہندوستان میں ایجاد ہوئی۔ یہ تین فن، اخلاقی کہانیاں، شطرنج اور ریاضیات آفاقی تہذیب کے لیے ہندوستان کا عطیہ ہیں۔'' دراصل امیر خسرو ایک ایسی روش پر گامزن تھے جو ہندوستان میں مذہبی رواداری اور اتحاد باہمی کی فضا پیدا کرتی ہے۔ سنسکرت زبان وادب کی تعریف تو امیر خسرو نے بار بار کی ہے۔ ان کے نزدیک عربی زبان کے علاوہ سنسکرت کو تمام زبانوں پر فوقیت حاصل ہے۔ امیر خسرو عربی، فارسی، ہندی، سنسکرت، ترکی زبانیں اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کی آبائی زبان ترکی، علمی زبان فارسی اور مادری زبان ہندوی تھی۔ امیر خسرو نے عوامی بولیوں مثلاً سندھی، لاہوری، کشمیری، بنگالی، تلنگی وغیرہ سے بھی اپنی واقفیت ظاہر کی ہے۔ خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں ''ہندوستان کی ان بولیوں سے امیر خسرو کی واقفیت حیرت انگیز ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں۔ جو شخص مدتوں فوجوں کو ساتھ ان علاقوں میں گھومتا پھرتا رہا ہو اور زبانوں کو حاصل کرنے کا ایسا ملکہ رکھتا ہو اس کے لیے ان زبانوں سے واقف ہو جانا ناممکن نہیں تھا۔''

امیر خسرو بہت سے ہندوستانی رسوم ورواج کو بہ تحسین نظر دیکھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں '' 'ستی' کی رسم جس میں ہندو عورت اپنے شوہر کی چتا کے ساتھ جل کر راکھ ہو جاتی ہے اور 'جوہر' کی رسم جس میں ایک شخص اپنے آقا یابت کے لیے اپنی جان نثار کرتا ہے، یہ افعال اسلام میں روا نہیں ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ افعال بڑے جرأت مندانہ ہیں۔ اگر ہماری شریعت میں اس کی اجازت ہوتی تو بہت سے لوگ اس سعادت کو حاصل کرنے میں اپنی جانیں قربان کر دیتے۔''

'قران السعدین' میں ہندوستان کی آب وہوا، پھولوں، میووں، کپڑوں، جانوروں، پان، یہاں کی عورتوں کے حسن کی تعریف میں ان کا قلم بڑا رواں دواں ہے۔ اور یہاں تک تحریر کر دیا ہے کہ شوخ اور سادہ حسین ہندو محبوبوں کی وجہ سے مسلمان بھی سورج کے پجاری ہو سکتے ہیں۔ مثنوی ''نہ سپہر'' میں امیر خسرو ہندوستانی موسیقی کو دیگر ممالک کی موسیقی سے افضل ثابت کرتے ہیں۔ ان کے مطابق ایک غیر ملکی

ہندوستان میں طویل قیام کے باوجود بھی ایک ہندوستانی دھن کامیابی کے ساتھ نہیں بجاسکتا۔ان کے بقول ہندوستانی موسیقی نہ صرف انسانوں کے لیے پرکشش ہے بلکہ چرند وپرند کے لیے کشش رکھتی ہے۔امیر خسرو اپنے وقت کے ایک عظیم موسیقار، گلوکار و شاعر تھے اور بہت سے راگوں و موسیقی کے آلات کے موجد بھی تھے۔

ڈاکٹر کنور محمد اشرف، امیر خسرو کی تاریخ نویسی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''جہاں تک مواد کو پیش کرنے کا تعلق ہے امیر خسرو نے اپنے قارئین سے کوئی بات پوشیدہ رکھنا نہیں چاہتے۔ مثال کے طور پر وہ یہ بات صفائی سے تسلیم کرتے ہیں کہ انہوں نے ''قران السعدین'' شاہی حکم کی تعمیل میں لکھی ہے۔ سلطان کیقباد نے ''خاتم المصنفین'' کہہ کر ان کا حوصلہ بڑھایا اور انھیں ایک ایسا بڑا انعام دینے کا وعدہ کیا جو انھیں ہمیشہ کے لیے تمام دنیاوی تردد ات سے آزاد کردے گا۔ کتاب کا خاکہ اور اس کی وسعت شاہی سرپرستی میں متعین کی گئی ہے۔'' حالانکہ امیر خسرو ''قران السعدین'' میں واضح طور پر لکھتے ہیں کہ ''میں نے اس کی (انعام واکرام) طمع میں یہ مثنوی نہیں لکھی ہے۔ میرا سخن بجائے خود ایک خزانہ ہے اس کے سامنے مادی مال و دولت کی کیا حقیقت اگر بادشاہ کچھ عطا کرے گا تو میں لے لوں گا، نہ دے گا تو مجھ کو اس کی پرواہ نہیں۔'' کنور محمد اشرف آگے لکھتے ہیں ''دوسرے سرپرست سلطان جلال الدین خلجی تھے۔ جب سلطان نے مصنف سے کتاب لکھنے کو کہا تو انہوں نے اخلاقی طور پر زیادہ مضبوطی محسوس کی۔ انہوں نے بڑی صفائی سے سلطان کو بتایا کہ شعری روایات اور مدح کے متفقہ معیار کے تحت جب بھی وہ تاریخی حقیقتوں سے ہٹنے پر مائل ہوئے تو ان کے ضمیر نے انھیں ملامت کی ہے۔'' اس لیے امیر خسرو نے سلطان سے کہا کہ ''وہ حسب موقع حقیقت سے منہ نہ موڑے گے۔''

پروفیسر پیٹر ہارڈی کے مطابق امیر خسرو نے شعری ادب کی تخلیق ضرور کی ہے تاریخ کی نہیں۔اس کے مطابق ''مورخ کا کام ماضی کی از سر نو تعمیر و تعبیر ہے۔ جس سے حال اور مستقبل کو سمجھنا آسان ہو۔ لیکن امیر خسرو کے لیے ماضی کی اہمیت بے معنی تھی۔اور اگر انہوں نے ماضی کی منظر کشی کی بھی تو صرف انعام واکرام حاصل کرنے اور سلاطین کو خوش کرنے کے لیے ہی کی۔ان کی ساری تخلیقات میں کوئی تسلسل نہیں ملتا ہے، ان میں خود آرائی، خود نمائی، مبالغہ آرائی، شعری تخیل پردازی اور تصنع ہی زیادہ ہے۔ مورخ، افراد کے مقابلے گروہوں سے زیادہ متعلق ہے اور اس کے لیے قدرتی اسباب کوئی اہمیت نہیں رکھتے ہیں۔'' پروفیسر ہارڈی کے ان خیالات کی سید حسن عسکری نے نفی کی ہے اور انہوں نے امیر خسرو کو ایک مورخ کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

امیر خسرو کے ادبی و تاریخی کاموں پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر اشتیاق حسین قریشی لکھتے ہیں کہ ''ہم عصر ادب میں معلومات کا خزانہ موجود ہے۔ امیر خسرو کی تصنیفات میں اہم تاریخی مواد ملتا ہے۔ ان میں سے 'قران السعدین' میں کیقباد اور اس کے باپ کی ملاقات کی داستان ہے۔ 'مفتاح الفتوح' میں جلال الدین فیروز خلجی کی چار فتوحات کا حال بیان کیا گیا ہے۔ 'خزائن الفتوح' میں صنائع بدائع کی کثرت ہے مگر وہ علاءالدین خلجی کے عہد حکومت کے ایک حصے کی صحیح تاریخ ہے اور 'تغلق نامہ' میں غیاث الدین تغلق کے عروج کی کیفیت بیان کی گئی ہے ان کے علاوہ 'عشقیہ' میں بھی، جو علاء الدین کے بیٹے خضر خاں اور دیول رانی کے رومان کی داستان ہے، کچھ تاریخی مواد موجود ہے مگر 'نہ سپہر' کو پڑھنے سے قطب الدین مبارک شاہ کے زیر حکومت سیاسی اور معاشرتی حالات کا اچھا ادراک حاصل ہوتا ہے۔ 'اعجاز خسروی' سے جس

میں امیر خسرو نے صنائع بدائع کا انتہائی مغلق استعمال کیا ہے نظم حکومت پر ضمناً اہم روشنی پڑتی ہے۔ کیونکہ نمونے کے ان مکتوبات میں جو حکام کے نام لکھے گئے ہیں، ان حکام کے فرائض منصبی کا ذکر ہے۔ 'مطلع الانوار' اور 'افضل الفوائد' سماجی تاریخ کے طلبہ کے لیے مفید ہیں کیونکہ ان میں اس زمانے کے اخلاقی آداب اور رسوم ورواجات بیان کیے گئے ہیں۔ ان کے غزلی مجموعوں کے دیباچے بھی اسی اعتبار سے مفید ہیں۔''

امیر خسرو جب عوام الناس کے درمیان ہوتے ہیں تو اپنے درباری ماحول اور متصوفانہ زندگی کو ایک غیر جانبدار نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں اور پھر وہ صرف افراد ہی نہیں بلکہ خود اپنے متعلق بھی ایماندار اور بے لاگ رائے ظاہر کرتے ہیں۔ جب ہم امیر خسرو کی ''اعجاز خسروی'' کا مطالعہ کرتے ہیں جو دستاویزات کا ایک متنوع، دلچسپ اور معلومات کا ایک انتہائی اہم ماخذ ہے تو ہمیں ان کے عہد کے سماجی واقعات کے واضع بیان، اخلاقی اصولوں اور سماجی طور طریقوں کی تفصیلات پڑھنے کو ملتی ہیں۔ امیر خسرو نے ''اعجاز خسروی'' کو کسی سلطان، امیر یا کسی صاحب اقتدار کی خواہش و حکم یا خوشنودی کی خاطر تحریر نہیں کیا تھا، یہ ان کی نجی دستاویز تھی، جس میں انہوں نے کھل کر اپنے جذبات و خیالات کا اظہار کیا ہے۔ امیر خسرو کی تحریریں نیک نفسی، فراخ دلی، وسیع المشربی اور کشادگئ ذہن کا درس دیتی ہیں۔ حالانکہ وہ ایک ذہین ترین اور صاحب علم شخص ہونے کی وجہ سے ایسی صلاحیت کے مالک تھے کہ تاریخی واقعات پر تاریخ وار اور تنقیدی بحث کر سکیں اور ماضی کی ایک معتبر و مربوط اور جامع تاریخ رقم کر سکیں لیکن انہوں نے اپنے آپ کو مذہبی اختلافات اور سیاست کے نزاعی معاملات سے علیحدہ رکھا، اسی لیے انہوں نے مسلسل تاریخ نہ لکھ کر چیدہ چیدہ اور اہم واقعات کو ہی ایمانداری، سچائی اور ادبی مہارت کے ساتھ قلمبند کیا۔

9.7 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

ضیاءالدین برنی نے بجا طور پر سچ لکھا ہے کہ امیر خسرو نے فارسی نظم و نثر میں پورا ایک کتاب خانہ چھوڑا ہے۔ خسرو پیدائشی شاعر تھے اور شاعری و زبان کی مہارت نے انھیں طوطئ ہند کے لقب سے سرفراز کیا۔ امیر خسرو نے تاریخ کو عصری تاریخ کی نظر سے دیکھا۔ فی الحقیقت ادبی کارنامے انجام دینے کا جذبہ و شوق ان پر ہمیشہ غالب رہا۔ ان کی تحریروں میں استعارات، تشبیہات، تلمیحات، قرآن کی آیات کا استعمال کثرت سے دیکھنے کو ملتا ہے جس کے ذریعہ ان کی تحریروں میں قوت بیان اور وقار پیدا ہو گیا۔ امیر خسرو گاہے گاہے ہندی الفاظ کو، مترنم اور ہم آہنگ انداز میں استعمال کرتے ہیں۔ انہوں نے فارسی اور ہندی میں مخلوط شاعری بھی کی اور شعری پیرائے میں تاریخ کو قلمبند بھی کیا۔ ان کی خواہش تھی کہ قبر میں منکر نکیر ان سے ہندی میں سوال کریں تاکہ وہ آسانی سے انھیں جواب دے سکیں۔ امیر خسرو نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے مرصع، مسجع اور مقفیٰ زبان، عبارت آرائی اور ذو معنی الفاظ کا استعمال کیا ہے اور تمام اصناف سخن غزل، مثنوی، قصیدہ، مرثیہ وغیرہ کے ساتھ نثر میں بھی کمال مہارت کے ساتھ طبع آزمائی کی۔ کے۔ ایس لال لکھتے ہیں کہ ''انہوں نے حرفی صنعت، ایہام اور بندش کی لامحدود صنعتوں سے روشناس کرایا۔ بعض مقامات پر وہ قواعد کے خوبصورت جملے تخلیق کرتے ہیں حتیٰ کہ روزمرہ کے الفاظ میں بھی، ان کے ہاتھوں میں پہنچ کر ایک عجیب سا حسن پیدا ہوتا ہے۔'' امیر خسرو چونکہ بنیادی طور پر شاعر ہیں اس لیے فنی و ادبی تراکیب، رنگین خیالی، طوالت بیان اور مبالغہ آمیز انداز، تشبیہات و استعارات وغیرہ کا ہونا ان کی تحریروں کا فطری اور اٹوٹ حصہ ہیں۔

امیر خسرو نے جو چھوٹے بڑے اور اہم واقعات رقم کیے ہیں ان کو بیان کرتے وقت جو منظر کشی اور پس منظر کا تانا بانا بنتے ہیں تو اس میں ہندوستان کی سماجی زندگی، ماحول، موسم، رسم و رواج کا تذکرہ زندگی کی بھرپور توانائی کے ساتھ ان کی تحریروں میں جلوہ گرہ نظر آتا ہے۔ اس طرح سماجی، تہذیبی اور سیاسی زندگی کا بیان بے انتہا دلچسپ ہو جاتا ہے اور پڑھنے والے کو مسحور کر دیتا ہے۔

امیر خسرو حضرت نظام الدین اولیاء کے چہیتے اور منظور نظر مرید تھے لیکن خرقہ پوش صوفی نہیں تھے۔ دربار سے وابستہ ایک امیر بھی تھے لہٰذا ان سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ طبقہ امراء کے کردار اور حکومت کے تمام راز عیاں کر دیں گے یا واقعات کے اسباب و علل اور نتائج کا تجزیہ کریں گے۔ ان کی ساری لیاقت و صلاحیت ادبی کارنامے انجام دینے کے لیے تھی۔ بہر حال بقول سید حسن عسکری ''جانبداری کی نظر سے دیکھا جائے تو وہ (امیر خسرو) مورخ تھے۔ یہ بہر حال ماننا پڑے گا کہ ان کے کاموں کی بڑی تاریخی اہمیت ہے اور انہوں نے تاریخی ادب کو جو کچھ دیا ہے وہ کسی صورت سے کم نہیں ہے۔''

9.8 کلیدی الفاظ (Keywords)

تحفۃ الصغر	:	کم سنی کا تحفہ
غرۃ الکمال	:	اعلیٰ ترین کمال
بقیہ نقیہ	:	خالص بچا ہوا
نہایۃ الکمال	:	بلند درجہ کمال، اوج کمال
قران السعدین	:	دو ستاروں کا ملن
مفتاح الفتوح	:	فتوحات کی چابی
عاشقہ	:	چاہت، محبت والا
نہ سپہر	:	نو آسمان
افضل الفوائد	:	عظیم نفع و بخشش
راحۃ المحبین	:	محبت کرنے والوں کو راحت و سکون پہنچانا
غنیم	:	دشمن
مہارت تامہ	:	کامل مہارت
ندیم	:	مصاحب، ہم نشین
زندیق	:	بظاہر مسلمان مگر دل میں کافر
لاادری	:	جس کا اعتقاد یہ ہو کہ اللہ یا دوسری غیر مادی اشیاء کی ہستی کے متعلق ہمیں کچھ علم نہ تو ہے اور نہ غالباً کبھی ہو گا۔

9.9 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

9.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. امیر خسرو کے والد کا نام کیا تھا؟
2. امیر خسرو کے نانا کس سلطان کے منصب دار تھے؟
3. امیر خسرو نے کس شہزادہ کی موت پر بڑا پر درد مرثیہ لکھا تھا؟
4. امیر خسرو نے 'قران السعدین' میں کن کی ملاقات کا تذکرہ کیا ہے؟
5. امیر خسرو کو ''امیر'' کا خطاب کس سلطان نے دیا تھا؟
6. کس سلطان کی فتوحات کو امیر خسرو نے ''خزائن الفتوح'' میں رقم کیا ہے؟
7. امیر خسرو کی مثنوی پر کس سلطان نے ہاتھی کے وزن کے برابر روپیہ انعام میں دیا تھا؟
8. امیر خسرو کی ''تاریخ علائی'' کس دوسرے نام سے معروف ہے؟
9. خسرو خاں کی بغاوت کا تذکرہ امیر خسرو نے اپنی کس کتاب میں کیا ہے؟
10. امیر خسرو کے والد ترکستان کے کس شہر سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے؟

9.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. امیر خسرو نے ''عاشقہ'' میں کس شہزادہ کے عشق کی داستاب قلمبند کی ہے؟
2. امیر خسرو نے حضرت نظام الدین اولیاء کے ملفوظات کو کن کتابوں میں رقم کیا ہے؟
3. عارض ممالک عماد الملک سے امیر خسرو کا کیا رشتہ تھا؟
4. امیر خسرو نے ''مفتاح الفتوح'-' میں کس سلطان کی فتوحات کا ذکر کیا ہے؟
5. ''اعجاز خسروی'' کا متن کس طرح کے مضامین پر مشتمل ہے؟

9.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. ہندوؤں اور ہندو مذہب کے بارے میں امیر خسرو کے خیالات پر تفصیل سے روشنی ڈالیے۔
2. بحیثیت مورخ امیر خسرو کا تعین و تشخیص کیجیے۔
3. 'خزائن الفتوح' پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔

9.10 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. Habib, Mohammad., *Hazrat Amir Khusrau of Delhi*, Delhi,1927.
2. Hardy, P., *Historians of Medieval India*, London, 1960.
3. Mirza Wahid., *Life and Works of Amir Khusrau*, Delhi, 1974.
4. Nizami, K. A., *On History and Historians of Medieval India*, Delhi, 1983.
5. Sarkar, Jagadish Narayan, *History of History Writing in Medieval India*, Calcutta, 1977.

6. خلیق احمد نظامی: تاریخی مقالات، دہلی 1966ء
7. شیخ محمد اکرام: آب کوثر، دہلی 1991ء
8. سید صباح الدین عبدالرحمن: ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں، اعظم گڑھ 1987ء
9. محب الحسن: ہندوستانی دور وسطی کے مورخین، مترجم مسرور ہاشمی، دہلی 1985ء

اکائی 10۔ضیاءالدین برنی

(Ziauddin Barani)

اکائی کے اجزا

10.0	تمہید
10.1	مقاصد
10.2	مورخ کا دائرہ مطالعہ
10.3	ضیاءالدین برنی کے حالات زندگی
10.4	مورخ کے ذرائع معلومات
10.5	ضیاءالدین برنی کا فلسفۂ تاریخ
10.6	حقائق کی تعبیر
10.7	طرز تحریر
10.8	کلیدی الفاظ
10.9	نمونہ امتحانی سوالات
10.9.1	معروضی سوالات
10.9.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
10.9.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
10.10	مزید مطالعہ کے لیے تجویز کردہ کتابیں

10.0 تمہید (Introduction)

عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں مسلم حکومتوں کی اساس کے ساتھ ہی فارسی زبان میں تاریخ نویسی کی عظیم روایات کا آغاز ہوا۔ مسلم حکمرانوں نے اپنی علم دوستی اور علم تاریخ کی اہمیت کے احساس سے سرشار ہو کر اس کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ نتیجتاً تیرہویں صدی سے اٹھارہویں صدی تک مسلم حکمرانوں اور امراء کی سرپرستی میں مورخین نے ان تمام وقوع پذیر سیاسی و ثقافتی اہمیت کے حامل واقعات اور تبدیلیوں کو قلمبند کیا۔ کچھ نے ان کے عوامل واسباب پر بھی بحث کی۔ حالانکہ عہد وسطیٰ کی تاریخ نویسی کا محور و مرکز، بادشاہ، شاہی دربار، جنگی مہمات، فتوحات، انتظامی اور ثقافتی کارناموں کا تذکرہ تھا۔ مورخین عموماً سلطنت میں وقوع پذیر واقعات و تبدیلیوں کو شاہی دربار اور سیاسی مرکز سے جوڑ کر دیکھتے تھے کیونکہ ان واقعات و حادثات سے مرکز بہر طور پر کسی نہ کسی طرح متاثر ہوتا تھا۔ اس لیے ان واقعات کا تذکرہ ان کے لیے ناگزیر تھا۔

ہندوستان میں ابتدائی فارسی مورخین کا رشتہ عام طور پر شاہی دربار سے تھا جو عموماً شاہی عہدیدار، امراء یا طبقہ علماء سے تعلق رکھتے تھے۔ اور یہی ایک طرح سے درباری مورخ بھی تھے۔ جن کے تاریخ لکھنے کا مقصد عموماً حکمراں کی خوشنودی اور انعام واکرام حاصل کرنا ہوتا تھا۔ دہلی سلطنت کی تاریخ جاننے کا ایک اہم ذریعہ ضیاءالدین برنی ہے جس نے اپنی زندگی میں متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ لیکن اس نے اپنی دو کتابوں ''تاریخ فیروز شاہی'' اور ''فتاوائے جہانداری'' کے سبب لازوال شہرت حاصل کی۔ تاریخ فیروز شاہی دہلی سلطنت کی پچانوے سالہ تاریخ ہے جو بلبن کی تخت نشینی سے لے کر فیروز شاہ تغلق کے ابتدائی چھ سالوں تک وقوع پذیر واقعات و حالات کے مفصل تذکرے پر محیط ہے اور فتاوائے جہانداری میں اس نے حکومت کے نظم ونسق کے تعلق سے ضوابط واصول بیان کیے ہیں۔

10.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- ضیاءالدین برنی کے حالات زندگی سے واقفیت حاصل کر سکیں گے۔
- ضیاءالدین برنی کے ذرائع معلومات کا جائزہ لے سکیں گے۔
- ضیاءالدین برنی کے فلسفۂ تاریخ کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- ضیاءالدین برنی کی تاریخی تصنیفات سے واقف ہو سکیں گے۔
- ایک مورخ کے طور پر ان کی اہمیت کا اندازہ لگا سکیں گے۔

10.2 مورخ کا دائرہ مطالعہ (Historian's Area of Study)

دہلی سلطنت کی پچانوے سالہ تاریخ جاننے کا سب سے اہم اور معتبر ذریعہ وماخذ ضیاءالدین برنی کی 'تاریخ فیروز شاہی' اور 'فتاوائے

جہانداری' ہیں۔ جن میں اس نے اس دور کی سیاست و سماج کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ برنی نے تاریخ لکھنے کے ساتھ ساتھ اس عہد کے تمام اداروں کا جائزہ بھی پیش کیا ہے اور جہانداری و جہانبانی کے اصول وضوابط بھی تحریر کیے ہیں۔

برنی تاریخ فیروز شاہی میں لکھتا ہے ''میں نے دیکھا ہے کہ ان لوگوں کے بعد سے جن کی حکمرانی کا ذکر 'طبقات ناصری' میں موجود ہے، اب تک پچانوے سال گزرے ہیں اس مدت میں آٹھ بادشاہ تخت دہلی پر بیٹھے ہیں۔ ان کے علاوہ تین اور شخص ہیں جو تین تین، چار چار مہینے تک جائز یا ناجائز طریقے سے تخت پر قابض رہے۔ میں نے اس مختصر تاریخ میں ان ہی آٹھ بادشاہوں کے حالات لکھے ہیں۔ اور غیاث الدین بلبن سے یہ سلسلہ شروع کیا ہے۔ 'طبقات ناصری' میں اس کے عہد وزارت (خانی) کے حالات موجود ہیں لیکن اس کے دور حکومت (بادشاہی) کا بیان نہیں ہے۔ جن آٹھ بادشاہوں کے حالات ووقعات 'تاریخ فیروز شاہی' میں لکھے گئے ہیں وہ یہ ہیں:

1. سلطان غیاث الدین بلبن، جس نے بیس سال تخت دہلی پر بیٹھ کر حکومت کی۔
2. سلطان معزالدین کیقباد، وہ سلطان غیاث الدین بلبن کا پوتا تھا۔ اس نے تین سال دہلی میں حکومت کی۔
3. سلطان جلال الدین فیروز خلجی جس نے سات سال حکومت کی۔
4. سلطان علاءالدین خلجی جس نے بیس سال تک تخت شاہی کو زینت بخشی۔
5. سلطان قطب الدین پسر سلطان علاءالدین خلجی جو چار سال اور چار ماہ تک صاحب تخت وتاج رہا۔
6. سلطان غیاث الدین تغلق شاہ جو چار سال اور چند ماہ تخت دہلی پر متمکن رہا۔
7. سلطان محمد ابن تغلق شاہ جس نے ستائیس سال دہلی میں حکومت کی۔
8. سلطان العصر والزمان، سلطان فیروز شاہ جو اس وقت دہلی میں حکمراں ہیں۔ خداوند تعالیٰ بہت سالوں تک ان کی حکومت کو قائم رکھے۔

اس دعا گوئے حکومت سلطانی یعنی ضیاء برنی نے ان ہی آٹھ بادشاہوں کے حالات وواقعات اس تاریخ میں لکھے ہیں اور ان کے ذکر کے ساتھ ان تین بادشاہوں کے نام بھی لکھے ہیں (سلطان رکن الدین پسر جلال الدین خلجی، شہاب الدین عمر پسر علاءالدین خلجی اور خسرو خان) جنہوں نے صرف تین یا چار ماہ تک حکومت کی۔ اور اس کا نام 'تاریخ فیروز شاہی' رکھا۔'' برنی ہر سلطان کا تذکرہ شروع کرنے سے قبل اس سلطان کے امراء وملوک کے ناموں کی فہرست ضرور تحریر کرتا ہے۔ ضیاءالدین برنی آگے لکھتا ہے ''اس جامع کتاب کی تالیف میں جو بہت سے مضامین کا مجموعہ ہے، میں نے بہت زحمت اٹھائی ہے اور منصف مزاج لوگوں کی انصاف پسندی سے مجھ کو امید ہے کہ اگر وہ اس کو بحیثیت تاریخ کے مطالعہ کریں گے تو ان کو اس میں سلاطین وملوک کے تاریخی حالات ملیں گے اور اگر وہ اس میں نظم حکمرانی سے متعلق احکامات اور میل جول کے طریقے تلاش کریں تو ان سے بھی اس کو خالی نہ پائیں گے اور اگر فاتحین اور حکمرانوں کے پند ونصائح دیکھنا چاہیں گے تو اس میں دوسری تالیف کے مقابلے میں ان کو یہ کہیں زیادہ ملیں گے۔ چونکہ اس میں جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ بالکل سچ ہے، اس لیے یہ ایک قابل اعتبار تاریخ ہے۔ اس میں مختصر الفاظ کے ذریعہ وسیع مطالب ادا کیے گئے ہیں۔ اس لیے یہ اس قابل ہے کہ اس کو نمونہ بنایا جائے۔''

برنی کی 'تاریخ فیروز شاہی' 758ھ/1357ء کو مکمل ہوئی تھی، اس وقت اس کی عمر 74 سال تھی۔ تالیف کا کام اس نے محمد بن تغلق کی موت 752ھ/1351ھ کے بعد شروع کیا تھا۔ اس وقت اس کی عمر 68 سال کے قریب تھی۔ ضیاء برنی نے بلبن کے بائیس سالہ حالات کے لیے اپنی کتاب میں جس قدر صفحات وقف کیے ہیں اتنے صفحات محمد بن تغلق کی ستائیس سالہ عہد حکومت کو نہیں دے سکا اور علاء الدین خلجی کی بیس سالہ حکومت کے حالات کو اس نے محمد بن تغلق کے مقابلے دوگنے صفحات میں رقم کیا ہے۔ محمد بن تغلق کی نسبت یہ اختصار معنی خیز اور قابل توجہ ہے۔ نبی احمد سندیلوی کہتے ہیں کہ ''محمد بن تغلق والے صفحات میں تاریخی شان مفقود ہے اور معاندانہ اسلوب بیان ہر جگہ موجود ہے۔''

10.3 ضیاءالدین برنی کے حالات زندگی (Ziauddin Barani's Biography)

برنی کا اصل نام ضیاءالدین تھا۔ برنی کی تاریخ پیدائش کسی بھی ہم عصر مصنف نے نہیں لکھی ہے، لیکن ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ وہ 684ھ/1285ء میں پیدا ہوا ہوگا۔ اس لیے کہ تاریخ فیروز شاہی کی تالیف کے وقت یعنی 758ھ/1357ء میں اس نے اپنی عمر 74 سال بتائی ہے۔ اپنے آپ کو برنی کہتا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ بلند شہر جسے اس زمانے میں برن کہتے تھے، کا رہنے والا تھا۔ برنی کا تعلق شریف و اعلیٰ خاندان سے تھا۔ اس کے اجداد نے دور سلطنت میں بلند عہدوں پر رہتے ہوئے البار ی، خلجی اور تغلق شاہی خاندانوں کی خدمات انجام دی تھیں۔ برنی اور اس کے والد جن کا موئدالملک خطاب تھا، حضرت نظام الدین اولیاء کے مرید تھے۔ موئدالملک سلطان جلال الدین خلجی کے دوسرے بیٹے ارکلی خان کا نائب رہا تھا۔ جب جلال الدین خلجی نے اپنے افسران کو کیلو گڑھی میں اپنے مکانات تعمیر کرنے کی دعوت دی تو موئدالملک نے بھی اپنے لیے ایک عظیم الشان مکان تعمیر کیا تھا۔ ضیاءالدین برنی کے نانا حسام الملک بلبن کے اہم امراء میں شامل تھے۔ بلبن نے انھیں لکھنوتی کی شحنگی (کوتوالی) پر بھی مقرر کیا تھا۔ برنی کے چچا علاءالملک نے علاءالدین خلجی کے عہد میں کافی ترقی کی اور وہ علاءالدین خلجی کا اعتبار و اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ علاءالدین خلجی نے سلطان بننے کے بعد علاءالملک کو دہلی کا کوتوال مقرر کیا تھا۔ سلطان اس کے مشوروں کو نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ علاءالدین خلجی نے برنی کے باپ موئدالملک کو برن میں نائب صوبہ دار مقرر کیا تھا۔ برنی کی دادی سید جلال الدین کی بیٹی تھیں جو کیتھل کے ذی حیثیت اور نمایاں لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ ضیاءالدین نے برنی نام برن (بلند شہر) کی نسبت سے لیا ہے لیکن وہ اس جگہ سے اپنے تعلق یا کسی واقفیت کا اظہار نہیں کرتا۔ لگتا ہے برنی بچپن میں ہی دہلی آگیا تھا اور اس کی تعلیم و تربیت دہلی میں ہی ہوئی تھی۔ پروفیسر محمد حبیب کے بقول ہم یہ فرض کرنے کے لیے مجبور رہیں کہ وہ تمام عمر دہلی میں رہا اور اس کے باپ نے اپنے نمائندوں کے ذریعہ اپنے فرائض انجام دئے۔ برنی لکھتا ہے کہ ''اس کمزور شخص کا باپ ایک بارتبہ شخص تھا۔ میں ایک سخی انسان کا بیٹا اور سخی بزرگوں کا جانشین ہوں۔'' تاریخ فیروز شاہی میں اس نے اپنی تعلیم کے حصول کے متعلق تفصیلات کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ جلال الدین خلجی کے عہد میں اس نے قرآن مکمل کر لیا تھا اور لکھنا سیکھ لیا تھا۔ اعلیٰ تعلیم کہاں اور کن سے کس طرح حاصل کی اس کا ذکر نہیں کرتا ہے۔

برنی وثوق سے کہتا ہے کہ اس کو بہترین و ممتاز اساتذہ سے علم حاصل کرنے کا شرف ملا تھا۔ امیر خورد صاحب 'سیر الاولیاء' برنی کو 'عالم دل پذیر مجمع الطائف و جوامع الحکایات' کہتا ہے۔ ظاہر ہے برنی نے اپنے وقت کے بہترین اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا ہوگا۔ کیونکہ اسی مصنف کے الفاظ میں اس کو صحبت علماء و مشائخ و شعراء سے ''کامل حصہ'' ملا تھا۔ برنی کے بیان کے مطابق علاءالدین خلجی کے عہد میں ایسے چھیالیس اساتذہ، علماء و فضلاء موجود تھے جن کی مثال بخارا، سمرقند، بغداد، مصر، خوارزم، دمشق، تبریز، اصفہان، روم اور رے بلکہ دنیا کے کسی بھی حصے میں نہیں مل سکتی تھی۔ اور ان میں بعض اپنے علم و کمالات کی وجہ سے غزالی اور رازی کے ہمسر کہے جا سکتے تھے۔ ان ہی میں سے بعض برنی کے استاد بھی رہے ہونگے اور بعض کی صحبت کا شرف بھی اس کو حاصل ہوا ہوگا، کیونکہ اس کے خاندان کے افراد کو اعلیٰ تعلیمی حلقوں اور دانشوروں سے ملنے کے مواقع میسر تھے۔ امیر حسن سجزی اور امیر خسرو سے اس کی گہری دوستی تھی۔ وہ لکھتا ہے کہ ''وہ میری اور میں ان کی صحبت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔'' برنی تاریخ فیروز شاہی میں لکھتا ہے کہ ''میری زندگی کتابوں کے مطالعہ میں گزری ہے۔ میں نے علم کی ہر شاخ کے بارے میں قدماء اور متاخرین کی بہت سی کتابیں پڑھی ہیں اور علوم تفسیر، حدیث، فقہ اور طریقت مشائخ یعنی تصوف کے بعد میں نے علم تاریخ سے زیادہ مفید کوئی دوسرا علم نہیں پایا۔'' لیکن برنی کو پچاس سال کی عمر تک کوئی عہدہ نہیں ملا تھا۔ 1334ء میں سلطان محمد بن تغلق نے برنی کو اپنا ندیم مقرر کیا تھا۔ امیر خورد لکھتا ہے کہ ''اپنی لطافت طبع کی وجہ سے وہ اس مقام پر فائز ہوئے کہ اپنے زمانے میں فن مصاحبت میں اس نیلے آسمان کے نیچے اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔'' بقول پروفیسر محمد حبیب ''اس عہدہ میں بڑا فائدہ تھا لیکن ذمہ داری کوئی نہ تھی۔'' برنی اپنے شائستہ آداب، بذلہ سنجی اور ظرافت کے لیے مشہور تھا۔

امیر خورد نے برنی کے مندرجہ بالا اوصاف اور خصوصیات کا مختصر الفاظ میں ذکر تو کیا مگر اس کے حالات زندگی کے متعلق نہیں لکھا۔ محمد بن تغلق کی موت 1351ء تک وہ اس کا ندیم رہا۔ یہ اس کی زندگی کا بہترین دور تھا جب اس نے ''اس بے وفا دنیا سے کامل حصہ حاصل'' کیا تھا۔ یہ اس کے لیے دنیاوی عیش و عشرت اور ہر طرح کی فارغ البالی کا دور تھا جو زندگی میں پھر کبھی اس کو دوبارہ نصیب نہ ہوا۔ جب محمد بن تغلق کا دہلی سے دور ٹھٹھہ کے قریب انتقال ہوا تو فیروز شاہ تغلق کو سلطان منتخب کر لیا گیا۔ اس موقع پر سلطان محمد تغلق کے وزیر خواجہ جہاں احمد ایاز نے دہلی میں ایک لڑکے کو تخت نشین کرا کے یہ اعلان کر دیا کہ وہ مرحوم سلطان محمد تغلق کا بیٹا ہے۔ لیکن فیروز شاہ نے دہلی پہنچ کر اس بغاوت کو آسانی سے فرو کر دیا، خواجہ جہاں نے خودکشی کر لی لیکن برنی گرفت میں آگیا۔ بس یہیں سے برنی کی زندگی کا تباہ کن دور شروع ہوا۔ برنی کے مخالفین نے سلطان فیروز شاہ تغلق کو خواجہ جہاں کی بغاوت میں برنی کے شریک ہونے کا یقین دلا دیا تھا۔ جس کے نتیجے میں برنی کو بھٹنیر کے قلعہ میں پانچ ماہ کے لیے قید کر دیا گیا۔ وہ نہایت رنج و غم کی حالت میں لکھتا ہے کہ ''خدا نے مجھے زندگی کی ابتداء میں عزت بخشی اور آخر میں ذلیل و خوار کیا۔'' رہائی کے بعد اس نے سلطان تک پہنچنے کی بہت کوشش کی مگر دشمنوں کی وجہ سے اسے موقع نصیب نہ ہو سکا اور سلطان کا عتاب قائم رہا۔ حکومت نے اس کی جان تو بخش دی تھی مگر اس کا مال و اسباب ضبط کر لیا گیا۔ غیاث پور میں اس نے خود اپنا مکان تعمیر کیا تھا اور سلطان محمد بن تغلق نے اسے تحائف و انعامات سے بھی خوب نوازا تھا۔ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی یہ سب دولت و جائیداد کو حکومت نے اس کے جرم کے سلسلے میں ضبط کر لیا تھا۔ چنانچہ دہلی میں اسے ندامتوں کے سوا کچھ نہ ملا۔ خاص طور پر اگر ہم اس کو اس معیار زندگی کے تناظر

میں دیکھیں جس کا وہ عادی تھا۔ یہ یقینی طور پر تنگ دست ہو گیا تھا لیکن ایسی غربت بھی نہیں ہو گی کہ اسے موت کا سامنا کرنا پڑے۔

تاریخ فیروز شاہی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بعض امراء نے سلطان سے برنی کی سفارش بھی کی تھی مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا سوائے اس کے کہ آخر وقت میں اس کا دربار سے کچھ وظیفہ مقرر ہو گیا تھا جس پر وہ مفلسانہ زندگی بسر کر سکے۔ مرتے وقت اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ امیر خورد لکھتا ہے ''جب ان (برنی) کی عمر کے ستر سال گزر گئے تو سلطان فیروز شاہ کے عہد حکومت میں وہ ملازمت ترک کر کے گوشہ نشین ہو گئے اور کتابوں کی تصنیف میں مشغول ہو گئے...آخر چند روز بیمار رہ کر وفات پائی۔ وفات کے وقت ان کے پاس روپیہ پیسہ نہ تھا بلکہ اپنے پہننے کے کپڑے بھی انہوں نے راہ خدا میں خیرات کر دئے تھے۔ ان کے جنازے پر ایک چادر اور ایک بوریا تھا۔ یہ اثر سلطان المشائخ کی صحبت کا تھا جو بادشاہوں کی صحبت پر غالب تھی کہ ان کا انجام بخیر ہوا اور سلطان المشائخ کے قبرستان میں اپنے والد بزرگوار کی پائینتی مدفون ہوئے۔''

ضیاءالدین برنی شاید نہ لکھتا اگر دوستوں کی محفلیں اور علماء و فضلاء کی مجلسیں اسی طرح منعقد ہوتی رہتی جیسے سلطان محمد بن تغلق کے دور میں جمتی تھیں۔ پر جب یہ سلطان کے خلاف سازش میں گرفتار ورہا ہوا تو لوگ اس سے کترانے لگے نفرت کرنے لگے۔ برنی نے ایک طویل عرصہ دربار اور دنیا کے عیش و طرب میں گزارا تھا جس کو وہ تمام عمر بھلا نہ سکا اور اب جس کے راستے اس کے لیے بند ہو گئے تھے۔ اس صورت حال نے اسے لکھنے پر مجبور کیا تا کہ سلطان فیروز شاہ اور دنیا کے سامنے اپنی حقیقت بیان کر سکے۔

برنی ایک نہایت ذہین اور قابل ترین شخص تھا جو زمانے کے رواج کے بموجب دینی و دنیوی علوم حاصل کر کے اپنے دور کا ایک فاضل شخص بن گیا تھا۔ سیر الاولیاء میں اس کی جن تصانیف کا ذکر ہے ان کے نام ''ثنائے محمدی (نعت)، صلوۃ کبیر، عنایت نامہ، مآثر سادات، حسرت نامہ، تاریخ آل برمک، تاریخ فیروز شاہی اور فتاوائے جہانداری'' درج ہیں۔ مورخ کی حیثیت سے اس کا شاہکار تاریخ فیروز شاہی ہے اس کی بنیاد پر وہ تاریخ ہند میں ایک ممتاز مورخ کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے۔

10.4 مورخ کے ذرائع معلومات (Historian's Sources of Information)

ضیاءالدین برنی نے 'تاریخ فیروز شاہی' میں بلبن کی تخت نشینی سے لے کر فیروز شاہ تغلق کے عہد حکمرانی کے ابتدائی چھ سالوں تک یعنی دہلی سلطنت کی پچانوے سال کی تاریخ کو قلمبند کیا ہے۔ جو گذشتہ صدیوں سے بحیثیت مورخ اس کی شہرت کا سبب ہے۔ تاریخ فیروز شاہی کو انسانی یادداشت کا ایک غیر معمولی کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ ضیاء برنی نے ہر اس واقعہ کا جس کا اس نے بذات خود مشاہدہ کیا تھا اور ہر وہ بات جو اس نے پچھلی نسل سے سنی تھی، کو قلمبند کیا ہے۔ ساتھ ہی اس نے ان تمام راویوں کی نشاندہی کی ہے جن کے توسل سے اس نے اپنی تاریخ کو مرتب کیا تھا۔ برنی نے اپنے ماخذوں کا اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ بلبن کے عہد حکومت کی تاریخ جاننے کے لیے اس نے اپنے نانا حسام الملک کو ذریعہ بنایا ہے۔ ساتھ ہی اپنے باپ دادا اور ان لوگوں سے جو اس عہد میں اہم عہدوں پر فائز تھے، اس کی معلومات کا ذریعہ تھے۔ کیقباد کے دور کے لیے اس کے والد اور اساتذہ اس کے راویوں میں شامل ہیں۔ جلال الدین خلجی سے فیروز شاہ تغلق کے عہد تک کے لیے اس کے اپنے ذاتی مشاہدات اور معائنہ، معلومات، منابع کی بنیاد تھے۔ اس نے جو تفصیلات و معلومات اپنے بزرگوں، اساتذہ اور دیگر افراد سے حاصل کی تھیں ان

کی مزید تفصیلات یا تفتیش کے لیے یقیناً دیگر ذرائع بھی تلاش کیے ہوں گے۔ وہ خود لکھتا ہے کہ ''اس عہد کے دوسرے اہم عہدہ داروں سے بھی میں نے معلومات حاصل کی ہیں۔'' کہیں کہیں اس نے ان عہدیداروں کے نام بھی تحریر کیے ہیں جن سے اس نے براہ راست معلومات حاصل کی تھیں اور جو واقعات کے عینی شاہد تھے۔ بعض مواقع پر برنی نے دستاویزات کا حوالہ بھی دیا، ہم جانتے ہیں کہ روایات و بیانات کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھنے اور راویوں کے کردار وغیرہ کی اہمیت سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ کیونکہ اس طریق عمل کا اطلاق مسلم علماء نے علم حدیث میں کیا ہے، جس سے برنی بخوبی واقف تھا۔ اس لیے ہم اس کے بیانات کو مستند تسلیم کر سکتے ہیں۔

ضیاء الدین برنی خواجہ صدر نظامی مصنف 'تاج المآثر'، مولانا صدر الدین عوفی مولف 'جامع الحکایات'، قاضی منہاج السراج جو زجانی مصنف 'طبقات ناصری'، کبیر الدین پسر تاج الدین عراقی کے لکھے فتح ناموں سے اچھی طرح واقف تھا جو اس کی نظر میں معزز، معتبر اور مشہور حضرات تھے۔ امیر حسن سجزی اور امیر خسرو سے اس کے قریبی تعلقات تھے جن کا راست طور پر دربار سلطانی سے تعلق رہا ہے۔

برنی نے اپنی تاریخ فیروز شاہی کے لیے مواد، زیادہ تر اپنے بزرگوں، دوستوں اور دیگر عہدیداروں کی روایات و بیانات سے حاصل کیا تھا۔ چونکہ وہ روایات کو پرکھنے کے فن سے واقف تھا اس لیے اس کے بیانات کو معتبر و مستند تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر سید معین الحق لکھتے ہیں کہ اسباب و علل پر بحث کرنے اور نتائج اخذ کرنے کے تعلق سے ہم برنی سے اختلاف کر سکتے ہیں مگر واقعات کو قلمبند کرنے کی حد تک اس کے بیانات پر شک کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ جزئیات میں غلطی کا امکان ہو سکتا ہے کیونکہ معمولی غلطیاں، روایات بیان کرنے والے بھی کر سکتے ہیں۔ مجموعی طور پر برنی کی 'تاریخ فیروز شاہی' کو بعد کے دور کے مورخین نے مستند و قابل اعتبار سمجھا ہے۔ فی الواقع بلبن سے لے کر فیروز شاہ کے ابتدائی چھ سالوں کی تاریخ جاننے کے لیے یہ سب سے اہم اور معتبر ماخذ کا درجہ رکھتی ہے۔

10.5 ضیاء الدین برنی کا فلسفۂ تاریخ (Ziauddin Barani's Philosophy of History)

ضیاء الدین برنی اپنے عہد کا ایک نہایت ذہین مورخ، مفکر، قابل قدر اور منفرد شخص تھا۔ علمی و ادبی تاریخ میں اس کی حیثیت ممتاز اور نمایاں ہے۔ جہاں تک فن تاریخ کا تعلق ہے برنی کو اس علم سے از حد لگاؤ تھا۔ اس کی نظر میں دینی علوم، حدیث، تفسیر، فقہ اور طریقت کے بعد علم تاریخ سے زیادہ نفع بخش کوئی دوسرا علم نہیں ہے۔ برنی کے مطابق ''انبیاء، خلفائ، سلاطین اور بزرگان دین و دولت کے حالات و واقعات سے واقف ہونے کا نام تاریخ ہے۔ فن تاریخ کا مقصد خاص طور پر ان بزرگان دین و دولت کے حالات معلوم کرنا ہے جو ذاتی کمالات رکھتے تھے اور اپنی بزرگی کے باعث دنیا میں ناموری اور شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ اس کے بر خلاف ادنی اور کم ظرف، نااہل، پست ہمت، گمنام، بخیل، بے سروپا، کاہل، کم اصل اور بازاری لوگوں کو نہ تاریخ سے کوئی نسبت ہے اور نہ اس کا مطالعہ ان کا شغل ہو سکتا ہے۔ تاریخ جاننے سے ان لوگوں کو کوئی فائدہ نہ ہوگا اور یہ علم کسی وقت بھی ان کے کام نہ آئے گا۔ اس لیے کہ تاریخ میں بزرگان دین و دولت کے اوصاف اور ان کی بزرگی و کمالات سے متعلق واقعات بیان کیے جاتے ہیں اور ادنی، کم ظرف، کم اصل اور بازاری لوگوں کا ذکر نہیں کیا جاتا۔'' اس طرح برنی کا تاریخ کا تصور شاہی خاندان، اعلیٰ طبقہ اور اشراف کی زندگی سے ہم آہنگ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور وہ تاریخ میں ارذال، بد اخلاق سفلوں اور بازاری لوگوں کو

جگہ دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ارذال کے لیے اس کا یہ تلخ رویہ مذہبی یا سماجی بنیاد پر نہیں بلکہ سیاسی بنیاد پر تھا۔ کیونکہ محمد بن تغلق کے دور میں ترکوں کی جگہ غیر ترک بڑے عہدوں پر فائز ہو رہے تھے۔اس ماحول میں برنی اپنے کو اجنبی پا رہا تھا جہاں پرانے ترک امراء کے ساتھ ادنی لوگ شانہ بہ شانہ کھڑے نظر آرہے تھے اور پھر محمد بن تغلق کی موت کے بعد اس کے وقار کا سب سے بڑا سہارا بھی ختم ہو گیا تھا۔اسی لیے وہ بد اخلاق سفلوں اور بازاری لوگوں کے حالات کا تذکرہ تاریخ میں کرنے کو تیار نہیں تھا۔بقول خلیق احمد نظامی ''یہ طبقاتی شعور بالآخر ایک ذہنی پیچیدگی بن گیا اور اس بنیاد پر سماج کے نچلے طبقوں کے سلسلے میں اس کا رویہ تلخ ہو گیا۔اس کی یہ تلخی کسی مذہبی یا سماجی بنیاد پر نہیں تھی بلکہ سیاسی بنیاد پر تھی۔

لیکن جلد ہی اس کو احساس ہوتا ہے کہ تاریخ کا دائرہ تو بہت وسیع ہے کیونکہ تاریخ اس کے لیے ایک ''اعلیٰ شعبہ علم'' ہے اور پھر اعتراف کرتے ہوئے تاریخ کی حدود کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے، ''تاریخ میں قدیم لوگوں کی نیکیاں اور برائیاں ان کے عدل و ظلم، ان کے مستحق ہونے اور نہ ہونے، ان کے اوصاف اور نقائص، ان کی عبادات اور جرائم اور ان کی فضیلتوں اور رذالتوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔تاکہ بعد کی نسلوں میں اس کے پڑھنے والے اس سے عبرت حاصل کر سکیں اور حکمرانی کے فوائد اور نقصانات اور دنیا کے لوگوں کی نیکی اور بد کرداری سے آگاہ ہو سکیں اور اس آگاہی کے بعد نیکیوں کی پیروی اور بد کرداری سے پرہیز کر سکیں۔''اسی لیے پیٹر ہارڈی نے یہ تبصرہ کیا کہ ''برنی تاریخ کو مذہبی علوم کی ایک شاخ مانتا تھا اور ماضی کو اس نے اچھائیوں اور برائیوں کے درمیان ایک جدوجہد تصور کیا ہے۔'' فی الحقیقت برنی نے عہد وسطیٰ کے مورخین کے برعکس اپنی توجہ عوامی زندگی پر بھی مرکوز کی ہے اور حکمرانوں اور ان کے متوسلین کے حالات کے ساتھ ساتھ عوامی زندگی کے خط و خال بھی پیش کیے ہیں۔اس کے نزدیک تاریخ کا مفہوم یہ تھا کہ لوگ تاریخ سے سبق لے کر اپنا حال اور مستقبل کو خوشگوار اور بہتر بنائیں۔اسی لیے ضیاء برنی نے حکمرانوں کی سیاست، معاشرتی اور معاشی اصلاحات، بازار کے نرخ، سرکاری ملازمین، لگان کا تعین اور وصولیابی، معاصر شعراء، اطباء، صوفیاء، ماہرین طبیعات، غرض کہ ہر اس چیز کے متعلق لکھا ہے جس کو آج کے دور کے جدید مورخین لکھنا پسند کریں گے۔کے۔ایس۔لال لکھتے ہیں کہ ''برنی کے یہ بیانات صاف بتاتے ہیں کہ وہ محض تذکرہ نویس نہیں بلکہ صحیح معنی میں مورخ تھا۔''

ضیاءالدین برنی علم تاریخ کو بہت فائدہ مند علم مانتا ہے۔اس کے نزدیک تاریخ سے ''اصحاب بصیرت اس طرح عبرت حاصل کر سکتے ہیں جس طرح کتب سماوی سے کرتے ہیں۔ کیونکہ اس میں انبیاء اور بعض سلاطین کے واقعات موجود ہیں۔''اسی لیے برنی تاریخ کو ''سرمایۂ اولوالابصار'' کہتا ہے۔ برنی کی نظر میں علم تاریخ کا تعلق علم حدیث سے ہے۔اس کے نزدیک ایک محدث کا مورخ ہونا ضروری ہے کیونکہ حدیث کی تدوین کے لیے تاریخ کا مطالعہ بہت ضروری ہو جاتا ہے۔ جس طرح محدثین نے 'فن اسماء الرجال' کے تحت حدیث کے روایوں کی جرح و تعدیل کی اور اس طرح شواہد و اسناد کا معیار بلند کیا ہے۔ بالکل اسی طرح ایک مورخ کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ وقوع پذیر واقعات کے منابع و مصادر کے لیے یہی طریقہ کار اپنائے۔اس طرح برنی کا مقصود علم تاریخ کے مرتبہ کو بلند کرنا تھا۔اس کے نزدیک ''تاریخ کا مطالعہ عقل و شعور کو بڑھاتا ہے۔اور انسان کی رائے اور تدبیر درست ہو جاتی ہے۔انسان دوسروں کے تجربات کا مطالعہ کر کے خود صاحب تجربہ ہو جاتا ہے۔''اسی لیے کہا گیا ہے کہ تاریخ ہزاروں سال کے تجربات انسانی مختصر وقت میں پیش کر دیتی ہے۔ ''علم تاریخ کی ایک خوبی یہ ہے کہ

آنے والی مشکلات کا علم تاریخ سے واقفیت کی بدولت ان کے وقوع سے پہلے ہی ہو جاتا ہے اور یہی تاریخ کا سب سے بہتر اور سب سے بڑا فائدہ ہے۔'' ''تاریخ میں انبیاء و صالحین کے حالات پڑھ کر انسان میں صبر و قناعت اور تسلیم و رضا کی خو پیدا ہو جاتی ہے اور برے لوگوں کی مذموم حرکات اور ان کے برے نتائج کی تفصیلات پڑھ کر ماتم اور معاصی سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔'' برنی کے نزدیک ''علم تاریخ کے ذریعہ پتہ چلتا ہے کہ خلفائ، سلاطین، وزراء اور ملوک کے نیک کاموں سے کس طرح عوام کو فائدہ پہنچتا ہے اور ان کا اثر دور اور نزدیک کے علاقوں تک کس طرح پہنچتا ہے۔'' برنی کے نزدیک تاریخ نویسی کی لازمی شرط راست گوئی ہے۔ اس لیے ''مورخ کا راست باز، راست نگار اور دیندار ہونا ضروری ہے کیونکہ مورخ بغیر شہادت پیش کیے جو بھی بات لکھتا ہے لوگ اس پر اعتبار کرتے ہیں۔ اگر مورخ کسی حکمراں یا کسی بڑے آدمی کے عدل و احسان اور اس کی خوبیوں کی تعریف کرے تو اس کی کمزوریوں اور عیوب کو بھی ظاہر کرے اور تاریخ لکھنے میں مصلحت و خوشامد کا انداز اختیار نہ کرے۔ اگر مصلحت دیکھے تو ان کو صاف الفاظ میں تحریر کرے ورنہ ذہین اور سمجھدار لوگوں کو اشارہ و کنایہ میں بتادے۔ اور جھوٹے خوشامدی تعریف کرنے والوں اور شعراء کی طرح دروغ گوئی اور مبالغہ سے احتراز کرے کیونکہ یہ لوگ لالچ کی وجہ سے مٹی کو سونا اور کنکر کو ہیرا کہنے میں شرم محسوس نہیں کرتے۔ ان کی عمدہ تحریریں بھی جھوٹ کا پلندہ ہوتی ہیں اور قیامت کے دن ایسے مصنف سخت ترین عذاب میں مبتلا ہوں گے۔''

برنی کے نظریۂ تاریخ سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ مورخ کو حقیقت پسند، غیر جانبدار اور ہر طرح کے تعصبات سے اوپر اٹھ کر تاریخ لکھنی چاہیئے، تبھی وہ حقیقی تاریخ نویسی کہلائے گی۔ یہ نظریۂ تاریخ وہ چودھویں صدی میں پیش کرتا ہے۔ امام عمرانیات اور بانی فلسفۂ تاریخ ابن خلدون نے اپنا مشہور زمانہ 'مقدمہ' 1378ء میں لکھا تھا جبکہ برنی کی وفات کو تقریباً بیس سال گزر چکے تھے۔ ظاہر ہے برنی ابن خلدون کا خوشہ چیں نہیں ہو سکتا۔ پروفیسر اقتدار حسین صدیقی کے مطابق ''تاریخی عوامل کے کردار کے تجزیہ میں وہ ابن خلدون کے پیشرؤوں میں کہے جا سکتے ہیں۔''

آج کے دور میں ہم تاریخ نویسی میں جس معروضیت کی بات کرتے ہیں وہ تاریخ نویسی کی لازمی شرط مانی جاتی ہے۔ برنی کے نظریہ تاریخ میں ہمیں کافی حد تک ان ہی شرائط کا علم ہوتا ہے۔ حقیقتاً برنی کے لیے تاریخ کوئی روداد یا واقعہ نگاری یا کوئی کہانی نہیں تھی وہ یقیناً ایک علم ہے، سماجی نظام کا علم اور اس کی بنیاد روایت پر نہیں بلکہ مشاہدہ اور تجربہ پر تھی۔ پہلے کے کسی مورخ کے بارے میں ایسا نہیں کہا جا سکتا۔ بہت تھوڑے مورخین ہی برنی کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔ برنی نے سماجی نظام کو باقاعدہ سمجھنے کے لیے مخلصانہ کوشش کی اور اس کی ذاتی پریشانیوں نے اسے حیرت انگیز بصارت عطا کر دی تھی۔

10.6 حقائق کی تعبیر (Interpretation of Facts)

برنی 'تاریخ فیروز شاہی' اور 'فتاوائے جہانداری' کا مصنف عہد وسطیٰ کی ایک غیر معمولی اور فکر انگیز شخصیت کا مالک، ایک عظیم مورخ و مفکر تھا، جس نے تاریخ فیروز شاہی لکھ کر دہلی سلطنت کی پچانوے سالہ تاریخ کو قلمبند ہی نہیں کیا بلکہ فتاوائے جہانداری لکھ کر سلاطین

کے لیے جہانبانی اور جہانداری کے اصول و ضوابط بنانے کی کوشش بھی کی۔ کیونکہ برنی کی تاریخ نویسی کی اساس مشاہدہ اور تجربہ پر مبنی تھی۔ خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ ''برنی کے نزدیک تاریخ کوئی ریکارڈ یا کوئی روزنامچہ یا کوئی کہانی نہ تھی۔ وہ یقیناً ایک سائنس تھی، طبقات عمرانی کی سائنس اور اس کی بنیاد مذہب یا روایت پر نہ تھی بلکہ مشاہدہ اور تجربہ پر تھی۔''

ضیاءالدین برنی تاریخ فیروز شاہی میں عموماً تاریخیں صحیح نہیں لکھتا اور اکثر وہ تاریخیں لکھتا ہی نہیں ہے۔ تاریخ فیروز شاہی کی اس خامی کو دوسری تصانیف کی مدد سے دور کیا جا سکتا ہے۔ برنی خود لکھتا ہے ''میں نے اس کا خیال نہیں کیا کہ کونسی فتح، بغاوت یا واقعہ پہلے پیش آیا اور کون سا بعد میں اور میں نے واقعات کی تاریخ وار ترتیب کی پابندی نہیں کی ہے تاکہ دانش مند، امور ریاست کا ان کا مجموعی ہیئت میں مشاہدہ کر کے عبرت اور بصیرت حاصل کر سکیں۔'' خلیق احمد نظامی کا کہنا ہے کہ ''برنی عملاً ایک خاصہ دیانت دار مورخ ہے۔ حقائق اس کے اپنے یا اس کے خاندان کے لیے خواہ کتنے ہی خوشگوار کیوں نہ ہوں وہ انھیں چھپاتا نہیں اور نہ مسخ کرتا ہے۔ اس کی ذہن کی سطح پر جو بھی حقائق ابھرے جوں کے توں درج کر دئے اور اپنے کسی دعویٰ کے ثبوت میں حقائق کو منتخب یا رد کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ بڑی راست بازی سے اعتراف کر لیتا ہے کہ چونکہ ''محمد بن تغلق کے سامنے سچ بولنے کی جرأت نہیں ہوئی اس لیے اس نے ریاکاری سے کام لیا۔'' کڑہ میں علاءالدین خلجی کی سازشانہ سرگرمیوں کا ذکر کرتے وقت جن کو برا بھلا کہتے ہوئے وہ ذرا نہیں جھجکتا وہیں اپنے چچا علاءالملک کی شمولیت پر پردہ ڈالنے کی بھی کوئی کوشش نہیں کرتا۔ برنی اعتراف کرتا ہے کہ ''سلطان محمد بن تغلق کے حضور میں مجھ میں اتنی جرأت نہ ہوئی کہ یہ عرض کرتا کہ یہ تمام مصیبتیں اور فتنے جو چاروں طرف اٹھ رہے ہیں اور یہ عام تنفر جو رونما ہو رہا ہے یہ سب نتیجہ ہیں کثرت سے سلطان کی سزائے موت دینے کا اور یہ کہ ان کی موت کی سزاؤں کو کچھ مدت کے لیے روک دیا جائے تو امن قائم ہو جائے گا اور لوگوں کے دلوں میں تنفر کم ہو جائے گا۔ میں سلطان محمد بن تغلق کے غصے سے ڈرتا تھا اور یہ بات اس کے سامنے نہ کہہ سکا۔''

تاریخ فیروز شاہی میں برنی نے مختلف مواقع پر سیاسی و دینی امور کے تعلق سے بعض اصول و ضوابط، پند و نصائح یا وصیتوں کو کچھ تاریخی شخصیات کی زبان سے تفصیلی طور پر ادا کروایا ہے۔ لیکن یہ گفتگو کسی دستاویز پر مبنی نہیں ہیں، ہو سکتا ہے کہ یہ مقبول عام حقائق ہوں جیسے، بلبن اپنے بیٹوں سلطان محمد شہید اور بغریٰ خان کو امور جہانبانی کے تعلق سے نصیحتیں کرتا ہے یا اپنے امراء و خواص کو ہدایات دیتا ہے۔ ایک اور موقع پر کم اصل اور رذیل لوگوں کے خلاف بعض امراء کو نصیحت کرنا وغیرہ شامل ہیں۔ جس طرح بلبن نے اپنے بیٹوں کو نصیحتیں کیں تھیں اسی طرح بغریٰ خان نے اپنے بیٹے سلطان کیقباد کو نصیحتیں کیں تھیں۔ برنی نے تفصیل سے ان گفتگوؤں کو قلمبند کیا ہے۔ اسی طرح سلطان علاء الدین کے تذکرے میں بھی یہ خصوصیت ہمیں دیکھنے کو ملتی ہے۔ برنی نے اپنے چچا علاءالملک اور سلطان علاءالدین کی اس گفتگو کا ذکر بہت تفصیل سے کیا ہے جس کے ذریعہ علاءالملک نے سلطان کے ذہن سے ایک نیا دین اور دنیا کو فتح کرنے کے احمقانہ خیالات دور کیے تھے۔ پروفیسر محمد حبیب اس گفتگو پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''برنی کی یادداشت یہاں اس کو مغالطہ میں ڈال دیتی ہے۔ جیسے ہمارے پاس خود برنی کی سند موجود ہے کہ علاءالدین خلجی عبادات کے طریقے اور ادائیگی سے واقف تھا پھر بھی اس نے کبھی روزہ نہیں رکھا اور جمعہ کی نماز میں بھی حاضر نہیں ہوا جو کہ ایک ایسا فرض تھا جسے بہت ہی کم سلاطین نے چھوڑنے کی جرأت کی تھی۔ علاءالدین روزہ نماز میں غفلت برت سکتا تھا

جیسا کہ برنی افسوس کے ساتھ لکھتا ہے لیکن اس کا ایمان صحیح تھا۔ برنی لکھتا ہے ''علاءالدین جاہلوں کی طرح روایتی اسلام میں پختہ اعتماد رکھتا تھا۔ نہ تو وہ بدعقیدہ یا بے دین انسانوں کے عقائد جانتا تھا نہ ان کے بارے میں اس نے سنا تھا اور نہ ہی انھیں برتتا تھا۔ ظاہر ہے روایتی اسلام پر اتنی صداقت سے گامزن کوئی شخص خواب میں بھی مذہب کے ختم کرنے کے بارے میں نہیں سوچے گا۔'' برنی نے سلطان علاءالدین خلجی اور قاضی مغیث کی اس گفتگو کو بھی بڑی تفصیل سے قلمبند کیا ہے جس میں قاضی مغیث نے سلطان کی پالیسیوں پر شرعی نقطہ نظر سے تنقید کی تھی۔ برنی کے تحریر کردہ ان مکالموں کا محور حکمراں کی حیثیت اور مقام، اس کے اختیارات اور ذمہ داریاں، راسخ العقیدگی اور دینداری کی اہمیت، خراج و محصولات اور سب سے زیادہ شریعت کے قوانین واحکامات کا نفاذ وغیرہ ہیں۔ برنی کے انداز بیان سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ان ہی حضرات کے خیالات ہیں لیکن کچھ مورخین ان خیالات و تصورات کو برنی کے ہی مانتے ہیں۔ کیونکہ برنی نے اسی طرح کے خیالات و تصورات، 'فتاوائے جہانداری' میں امور مملکت اور جہانبانی کے ضمن میں منضبط کیے ہیں۔ اسی لیے پیٹر ہارڈی نے ان تمام پند و نصائح کو جو بلبن نے اپنے بیٹوں اور امراء کو کی ہیں یا قاضی مغیث نے علاءالدین خلجی کی پالیسیوں پر جو تنقید کی ہے اس کو سراسر برنی کے خیالات تصور کیا ہے، جو صحیح تجزیہ نہیں ہے۔ قاضی مغیث کی گفتگو میں برنی تمام تر اپنے ہی خیالات پیش کر رہا ہے، کہنا درست نہ ہوگا۔ البتہ اس نے تفصیلات تحریر کرتے وقت ان خیالات و واقعات کو اپنے الفاظ میں ضرور ادا کیا ہے۔

ضیاءالدین برنی جب سلاطین کو یہ بتانا چاہتا ہے کہ کس طرح کے اصول جہانبانی ہونے چاہئیں تو وہ تاریخ سے امثال پیش کرتا ہے کہ ایسے حالات میں سلطان کو کیا اقدامات کرنے چاہئیں۔ مثلاً جب محمد بن تغلق نے برنی سے پوچھا کہ اگر حکمراں عوام میں نامقبول ہو رہا ہو تو اس وقت اسے کیا کرنا چاہیے۔ تو برنی نے بڑی صاف گوئی و جرأت کے ساتھ کہا کہ ایسے وقت میں سلاطین تخت سے دست بردار ہو جاتے ہیں اور اپنے بیٹے کو اپنا جانشین بناتے ہیں۔ سلطان محمد بن تغلق نے ایک موقع پر برنی سے معلوم کیا کہ کن جرائم کی سزا قتل ہو سکتی ہے تو برنی نے اس موقع پر سات مقامات کی نشاندہی کی۔ (1) ارتداد (2) قتل عمد (3) زنا بالجبر (4) بادشاہ کے خلاف بغاوت (5) باغیوں کا سرغنہ (6) بادشاہ کے دشمن کا ساتھ دینے والا اور (7) ایسا نافرمان جس کی نافرمانی کی وجہ سے ملک کو نقصان پہنچے۔

تاریخ فیروز شاہی میں ضیاء برنی نے خود اپنی حالت کے اسباب بھی تلاش کیے ہیں۔ مثلاً بلبن کے متعلق لکھتے وقت اچانک اس کے ذہن میں اپنی صورت حال کے موافق یا مخالف کوئی صورت ابھرتی ہے تو وہ اپنی بات کرنے لگتا ہے۔ جیسے ''اس فلک ناہنجار نے مجھ پر جو مظالم توڑے ہیں اگر لکھوں تو دو کتابیں تیار ہو سکتی ہیں۔'' یا جلال الدین خلجی کی خاص مجالس کا تذکرہ کرتے وقت وہ اپنی حالت زار کا رونا رونے لگتا ہے۔ لکھتا ہے ''وہ مایوسی جو میرے دل میں گھر کر گئی ہے لہو کے آنسو بن کر میری آنکھوں سے بہتی ہے۔ لہو کے دریا کی ایک لہر میری آنکھوں سے اٹھتی ہے میرے قلم سے ٹپکتی ہے اور کاغذ کو داغدار کر دیتی ہے۔'' برنی محمد بن تغلق کے تقریباً ہر فعل اور حکمت عملی اور اس کے سیاسی اصولوں پر تنقید کرتا ہے جن کے سبب ان کم اصلوں و رذیلوں کو بڑے بڑے عہدوں پر آنا ممکن ہوا۔ اس نقطۂ نظر کو وہ اپنی تاریخ میں بار بار دہراتا ہے۔ برنی کا مثالی حکمراں سلطان بلبن ہے کیونکہ اس کے عہد میں ترکوں کے مقام اور ان کی انتظام حکومت میں اجارہ داری کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ حسب و نسب کے معاملے میں برنی کے خیالات و افکار پوری طرح سلطان بلبن سے میل کھاتے تھے۔ لیکن محمد بن تغلق کے عہد حکومت

میں ترکوں کے مقام اور کی اجارہ داری ختم ہو گئی تھی۔ لہٰذا برنی اس بات کے لیے محمد بن تغلق کو مسلسل ہدف تنقید بناتا ہے کہ اس نے ہندوؤں اور کم اصل انسانوں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا۔ برنی لکھتا ہے ''میں اس بادشاہ کے اعجوبہ آفرینش متضاد اوصاف دیکھ کر حیران رہ جاتا تھا۔ ساری عمر میں اس کی مبارک زبان سے بد اصلوں، سفلوں، رذیلوں اور کمینوں کی توہین وتذلیل میں باتیں سنتا تھا۔ وہ دلائل و برہان کے ساتھ واقعات بیان کرتا کہ یہ کم اصل، حرام خور، گندہ نمک، شریر، کافر نعمت اور بد خو ہوتے ہیں اور یہ ظاہر کرتا کہ وہ بالطبع ان سفلوں اور بد اصلوں کا بتوں سے بھی زیادہ دشمن ہے لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ دیکھتا تھا کہ نجبا، مطرب بچہ، عزیز حمار اس کے بھائی فیروز حجام، منکا طباخ، مسعود خمار، لدھا باغبان، نایک جولاہا کا بیٹا شیخ بابو، پیر امالی، کشن باز ران اندری، احمد ایاز کا غلام مقبل اور دوسرے کمینوں، سفلوں اور کم اصلوں کو اعلیٰ رتبہ، ولایتیں اور حکومتیں دے کر بلند کیا۔ ایک ایسے بادشاہ کے متعلق عجیب سا معلوم ہوتا ہے جو سروری اور سرداری میں جمشید اور کیخسرو کا ہمسر تھا۔''

یہاں برنی نے جن پیشوں کی طرف اشارہ کیا ہے وہ ان مذکورہ بالا افسران کے آبائی پیشے تھے۔ پروفیسر محمد حبیب اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ افسر بذات خود بہت تعلیم یافتہ اور قابل لوگ تھے۔ چھ صدی پیچھے دیکھتے ہوئے ہم اس سلسلے میں محمد بن تغلق کی نظر کی کشادگی کی تعریف کے علاوہ کیا کہہ سکتے ہیں۔ برنی ان افراد سے ان کے حسب و نسب کی بنیاد پر نفرت کرتا تھا ان افسران کی قابلیت، صلاحیت یا ان کی کارگزاریوں کو ہدف تنقید نہیں بناتا ہے۔ برنی اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ ہندوستان پر حکومت اس کے سپوتوں کے بغیر چلانا آسان و ممکن نہیں تھا چاہے یہ سپوت اجلاف ہندو ہوں یا مسلمان۔ ان سب کا یہ مقام مسلم حکومت کے ڈیڑھ سو سال پر پھیلے عمل میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔

برنی کا تعلق بلبن کے عہد کے آزاد ترکوں کی جماعت سے تھا اور اس کے خیال میں اسلام کا تعلق پیدائش سے تھا شعوری انتخاب سے نہیں۔ اس لیے وہ ہندوؤں اور ہندوستانی نو مسلموں سے نفرت کرتا ہے جن کے اجداد کی برنی کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں تھی۔ سرکاری ملازمت کے سلسلے میں وفاداری اور قابلیت اس کے یہاں معیار نہیں تھا۔ اس کے نزدیک لیاقت کا واحد معیار عالی نسب ہونا تھا اور عالی نسب سے اس کا مطلب وسط ایشیاء یا ایران سے ہجرت کر کے آئے خاندانوں سے تھا۔ خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ ''زیادہ گہرائی سے تجزیہ کیا جائے تو ظاہر یہ ہوتا ہے کہ اس کے تعصبات کی آبیاری مذہبی نظریات نے نہیں بلکہ اس کی شکست خوردہ زندگی نے کی تھی۔''

تاریخ فیروز شاہی میں برنی جب فیروز شاہ تغلق کے حالات و واقعات قلمبند کرتا ہے تو تاریخ نویسی و مورخ کے لیے اپنے قائم کردہ معیارات سے انحراف کرتا ہوا نظر آتا ہے اور ایک بے شرم خوشامدی کی طرح فیروز شاہ تغلق کی شخصیت میں ملکوتی خوبیاں گنانے لگتا ہے۔ اس کے دربار کو وہ اللہ کے دربار سے تعبیر کرتا ہے، جہاں امراء ایسے کھڑے ہوتے ہیں جیسے عرش پر جبرئیل کھڑے ہوں۔ وہ فیروز شاہ کی شان میں مبالغہ آمیز قصیدے سے پڑھتے ہوئے اسے ملکوتی شخصیت کے درجے پر پہنچا دیتا ہے۔ خواجہ جہاں پر لعنت ملامت کرتا ہے تاکہ خواجہ جہاں کے ساتھ مل کر فیروز شاہ کے خلاف سازش کرنے کا پرانا الزام مٹ جائے۔ برنی کئی مقام پر لکھتا ہے کہ اس کی خواہش ہے کہ فیروز شاہ اس کی تاریخ پر ایک نظر ڈالے۔ لیکن ''میرے لیے یہ ممکن نہیں کہ میں اس تاریخ کو اس کی نظر ہمایوں کے سامنے گزار سکوں کہ یہ تاریخ جس کو اس کے

مبارک نام سے شرف بخشا گیا ہے۔'' خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ ''یہ بات محض ایک خواہش سے زیادہ نہ تھی، جو کتاب شروع کرنے کے بعد پیدا ہوئی تھی تالیف کا اصلی مقصد ہر گز یہ نہ تھا۔ کیونکہ ایک ایسی کتاب کے ذریعہ برنی کیسے فیروز شاہ کی عنایتیں حاصل کر سکتا تھا جس میں اس کے مربی محمد بن تغلق کے سلسلے میں نمرود اور فرعون کی سی برائیوں کو بیان کیا گیا ہے۔ اقتدار حسین صدیقی لکھتے ہیں کہ دراصل تاریخ فیروز شاہی ایک نہیں دو نسخے ہیں۔ ایک میں بلبن کی تخت نشینی سے لے کر محمد بن تغلق کی موت 1351ء تک کے واقعات کو قلمبند کیا گیا ہے اور دوسرے نسخہ میں فیروز شاہ تغلق کے ابتدائی چھ سال کے حالات مذکور ہیں۔ خلیق احمد نظامی کہتے ہیں کہ ''وہ دوسری کتاب نہ لکھ سکا اس لیے دونوں نسخوں کو ملا کر تاریخ فیروز شاہی کا نام دے دیا۔ کیونکہ تاریخ فیروز شاہی کے شروع اور بعد کے وہ دونوں حصے جن میں فیروز شاہ کا ذکر ہے، عبارت کے لحاظ سے اور طریقۂ فکر، تجزیہ اور رنگ بیان کے نقطۂ نظر سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ پہلے حصہ کا برنی بڑا تیز فہم، چبھتی ہوئی تنقید کرنے والا نقاد اور بعض مقامات پر تلخی برتنے والا شخص ہے۔ دوسرے حصے میں وہ ایک سیدھا سادہ چاپلوس خوشامدی ہے۔''

ضیاء الدین برنی اپنی تاریخ میں داخلیت کا بوجھ لے کر چلتا ہے۔ برنی نے دہلی سلطنت پر دو کتابیں ''تاریخ فیروز شاہی'' اور 'فتاوائے جہانداری' تحریر کی ہیں۔ انکے مطالعہ سے ہمارے سامنے دو باتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں کہ فتاوائے جہانداری میں برنی کی تصویر ایک سیاسی مدبر کی ہونی چاہیے تھی اور تاریخ فیروز شاہی میں ایک مورخ کی۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ فتاوائے جہانداری میں جب برنی کوئی سیاسی نظریہ پیش کرتا ہے تو تاریخی حوالہ ضرور دیتا ہے۔ اسی طرح جب تاریخ فیروز شاہی میں کسی واقعہ کا ذکر کرتا ہے تو اس کا تجزیہ کرتے وقت سیاسی مدبر بن جاتا ہے۔ برنی بہ یک وقت اپنی دونوں کتابوں میں مورخ اور سیاسی مدبر کی حیثیت سے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔

پروفیسر محمد حبیب کی رائے میں ''فتاوائے جہانداری' فی الحقیقت مصنف کی مشہور 'تاریخ فیروز شاہی' کی توسیع ہے۔ اس میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ ان بنیادی خیالات کو جن کا برنی اپنی پہلی تصنیف 'تاریخ فیروز شاہی' میں اظہار کر چکا ہے ان خیالات کو سیاسی فلسفہ کے ایک مربوط طرز کی شکل میں پیش کرے۔'' سیاسی نظریات میں برنی کی مدبرانہ خدمات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس نے شعوری طور پر مفکرانہ انداز میں مذہب اسلام اور سماجی و سیاسی ضرورتوں کے تناظر میں ادارۂ بادشاہت کا تجزیہ کیا ہے۔ یقیناً یہ اس کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ وہ بڑی جرأت مندی کے ساتھ بادشاہت کو غیر اسلامی قرار دیتا ہے کیونکہ بادشاہت کے اصول و روایات واقعتاً قرآن کے احکامات، رسول اللہ ﷺ کے اصول، خلفائے راشدین کی روایات کے بر خلاف ہیں۔ ساتھ ہی وہ مانتا ہے کہ سماجی نظام بنائے رکھنے کے لیے اور زمانے کی ضرورتوں نے بادشاہت کے وجود کی تائید کی ہے۔ دراصل برنی ایک روایتی بادشاہت کا خواہش مند تھا اور چاہتا تھا کہ ''سلطان بہت ہوشیاری سے اپنے مشیروں کا انتخاب کرے اور ان کے مشوروں کی مشعل راہ بنائے۔'' وہ بادشاہت کی مطلق العنانیت کے ساتھ ایک شوروی نظام کا عنصر چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے فتاوائے جہانداری میں حکومت کے ہر ادارہ کی روشنی میں سلطان کے فرائض کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ ''شریعت سیاسی سزاؤں کے مسئلہ پر ساکت تھی لہٰذا برنی نے عقل اور انسانیت کی بنیاد پر ان میں باضابطگی کے لیے کچھ اصولوں کو دریافت کرنے کا عزم کیا تھا۔'' قرون وسطی کے بہت سے سیاسی مفکروں اور مسلم دانشوروں نے شعوری طور پر وسیع علاقائی مملکتوں کا مطالعہ کیا تھا جہاں پر مرکزی امتیاز و اقتدار کے علاوہ کسی بھی دوسری صورت میں حکومت نہیں کی جاسکتی تھی اور یہ صرف ادارۂ بادشاہت کے ذریعہ ممکن تھا۔ لہٰذا سلاطین

کے لیے مستقل بنیادوں پر قوانین و ضوابط کا اجراء اور نفاذ ضروری تھا۔ کیونکہ مسلم شریعت عوامی فلاح و بہبود کے لیے مذہبی بنیاد پر کسی بھی تفریق کی اجازت نہیں دیتی ہے۔ دراصل 'فتاوائے جہانداری' دہلی سلطنت کے اداروں کی پچانوے سالہ کارگزاری کے جائزہ پر مبنی ہے۔ وہ لکھتا ہے ''ازروئے انصاف و حق گزاری بادشاہ صرف اس بادشاہ کو کہا جاسکتا ہے اور سمجھا جاسکتا ہے جس کی بادشاہی میں ایک شخص بھی بھوکا اور ننگا نہ سوئے۔ اور ایسے قوانین وضوابط بنائے کہ ان قوانین وضوابط کی پابندی کے بعد اس کی رعایا میں کوئی بھی ایسی پریشانی و بے بسی میں مبتلا نہ ہو جس سے اس کی جان ہلاک ہو۔'' اور اس لیے نصیحت نمبر چودہ میں واضح کرتا ہے کہ ''انتظامی اصطلاح میں ضابطہ ایک ایسا طریقۂ عمل ہے جسے سلطان اپنے اوپر ایک لازمی فرض کی حیثیت سے ریاست کی بہبود کے حصول کے لیے عائد کرتا ہے اور جس سے وہ قطعاً منحرف نہیں ہوتا۔ بقول پروفیسر محمد حبیب ''برنی پہلا ایسا سیاسی مفکر ہے جس نے مسلمانوں کے درمیان دنیاوی ضوابط کو صحیح قرار دیا تھا اور اس کارنامے کے لیے پوری طرح تعریف کا مستحق ہے۔ کیونکہ اس کا مقصد صرف واقعات کا تذکرہ نہیں تھا۔ بلکہ اس زمانے کے مزاج کی تصویر کشی کرنا تھا۔ علم تاریخ اس کے لیے ''سرمایۂ اعتبار'' تھا۔

ضیاءالدین برنی قرون وسطی کی ایک غیر معمولی اور فکر انگیز شخصیت، عظیم مورخ، مفکر اور مدبر جس نے ایک طرف دہلی سلطنت کی پچانوے سالہ تاریخ کو قلمبند کیا وہیں اس نے فتاوائے جہانداری لکھ کر سلاطین کے لیے جہانبانی و جہانداری کے اصول وضوابط بھی بنا کر پیش کیے۔ نیز ہندوستانی سماجی اور سیاسی نظام پر بھی بحث کی ہے۔ اس کی تحریریں تاریخ کے ایک شعوری فلسفہ کا نہایت پرزور اور موثر اظہار ہیں جو اس کو صف اولین کا مصنف و مدبر بناتی ہیں۔ وہ تجربہ و مشاہدہ کی بنیاد پر تاریخ کو رقم کرتا ہے اور ضرورت کی بنیاد پر قوانین وضوابط کے اصولوں کے نفاذ کا خواہش مند ہے، تاکہ ایک بہتر سیاسی و سماجی نظام کی مستحکم بنیادوں پر تعمیر ممکن ہو سکے۔ برنی نے اپنی عمر کے جس پڑاؤ پر 'تاریخ فیروز شاہی' کو تحریر کیا وہاں اس کی یادداشت کبھی کبھی اس کو مغالطہ میں مبتلا کر دیتی ہے اور وہ واقعات کی ترتیب زمانی کو آگے پیچھے کر دیتا ہے لیکن حقائق بیان کرنے میں اس کی یادداشت اسے دھوکا نہیں دیتی۔ برنی کا حسب و نسب کا فخر و غرور، ہندوؤں اور نو مسلموں سے اس کا غیر منطقی تعصب اور اس کی خود پسندی نے اسے مایوسی و ناامیدی کے سوا کچھ نہ دیا۔ کیونکہ اس کے یہ خیالات ارباب اقتدار کے لیے قابل قبول نہیں تھے۔ فی الحقیقت ضیاءالدین برنی نے تاریخ نویسی کو نئی جہتیں عطا کیں ہیں۔

10.7 طرز تحریر (Method of Writing)

ضیاءالدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی میں سلاطین و ملوک کے تاریخی حالات، نظم حکمرانی، احکامات، قوانین وضوابط، پند و نصائح وغیرہ بھرپور انداز میں پڑھنے کو ملتے ہیں۔ برنی نے ''اس جامع کتاب کی تالیف میں جو بہت سے مضامین کا مجموعہ ہے، بہت زحمت اٹھائی ہے۔'' اس لیے وہ انصاف پسند افراد سے تعریف کی توقع رکھتا تھا۔ اس کا اپنی تصنیف کے متعلق بہت اونچا خیال تھا۔ وہ کہتا ہے کہ ''اس (تاریخ فیروز شاہی) میں مختصر الفاظ کے ذریعہ وسیع مطالب ادا کیے ہیں۔ اس لیے یہ اس قابل ہے کہ اس کو نمونہ بنایا جائے۔ ازروئے انصاف وراستی اس تاریخ کی تعریف میں، میں یہ قطعہ پڑھوں تو مناسب ہوگا۔ ''اگر میں یہ کہوں کے دنیا میں میری تاریخ کی مثال نہیں تو کون میری بات پر یقین کرے گا، کیونکہ اس فن کا کوئی عالم موجود نہیں ہے۔'' ایک اور موقع پر لکھتا ہے کہ ''اس تالیف میں، میں نے جادوگری کی ہے، میں جانتا ہوں

اور علم تاریخ کے جاننے والے جو سیمرغ اور کیمیا ہو گئے ہیں، وہ بھی جانتے ہیں کہ ایک ہزار سال سے کوئی مورخ اس جیسی تاریخ جس میں احکام و اخبار جہانداری یک جا جمع کر دئے گئے ہیں، نہیں لکھ سکا۔''

ادبی لحاظ سے تاریخ فیروز شاہی ایک ادب پارہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ محمد حبیب لکھتے ہیں ''تاریخ فیروز شاہی پڑھتے وقت افسانہ پڑھنے کا احساس ہوتا ہے۔ پوری تصنیف میں غیر معمولی عمدہ اقتباسات منتشر ہیں۔ کوئی بھی ہند فارسی تاریخ، شخصیات کے تجزیہ اور مناظرہ کی تصویر کشی میں تاریخ فیروز شاہی کی ہمسری نہیں کر سکتی۔ برنی کسی بھی جگہ علم کا کوئی غیر ضروری مظاہرہ نہیں کرتا۔ وہ اس طرح لکھتا ہے کہ قاری کو سمجھنے میں کم سے کم کوشش کرنا پڑے۔ دوسری طرف برنی کے ناشائستہ الفاظ اور فقروں سے والہانہ شوق پر اظہار افسوس کرنا پڑتا ہے۔''

برنی کا طرز نگارش سادہ اور آسان ہے۔ اس نے اس دور کی عام بول چال کی فارسی زبان کا استعمال کیا ہے۔ جگہ جگہ حالات اور افراد پر اس کے طنزیہ جملے بڑے معنی خیز ہیں۔ کبھی کبھی وہ رنگین بیانی اور شاعرانہ مبالغہ سے کام لیتا ہے۔ معزالدین کیقباد کی عیش و طرب کی محفلوں کے ذکر میں وہ اپنی انشاپردازی کے جوہر دکھاتا ہے۔'' اس کی زبان پر مقامی زبان اور محاروں کا اثر نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ جو اس دور کے دوسرے مصنفین اور شعراء کی تحریروں میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ آغا مہدی حسن لکھتے ہیں ''برنی میں واقعہ نگاری اور تاریخ نویسی کی قابلیت اعلیٰ درجہ کی تھی اور اس اعتبار سے وہ اپنے زمانے کے مورخین میں سب سے بہتر تھا۔ فارسی پر اسے خوب دسترس حاصل تھی۔ مضمون نویسی اور عبارت آرائی پر اسے پورا عبور تھا اور سحر بیانی کا وہ امام تھا۔'' حقیقتاً وہ زبردست قوت بیان کا مالک تھا۔

فی الواقع برنی ایک بہت معتبر مورخ ہے اور تاریخ نویسی میں اس کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ وہ قرون وسطی کا پہلا مفکر ہے جس نے ہندوستان میں سیاسی ضروریات کو سب سے پہلے محسوس کرتے ہوئے سلاطین کو شریعت کے بجائے جہانداری و جہانبانی کے لیے ضوابط بنانے کی ضرورت کی پرزور وکالت کی اور سلاطین کو مستحکم و خوش حال حکومت بنانے اور چلانے کے لیے 'فتاوائے جہانداری' کی شکل میں ضوابط و قوانین بنا کر پیش بھی کیے۔ اس کی یہ دونوں کتابیں تاریخی ادب میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں۔

10.8 کلیدی الفاظ (Keywords)

خانی	:	سرداری
ملوک	:	ملک کی جمع، شاہی امیر
شحنگی	:	کوتوال، بحیثیت زمانہ کوتوال
کوتوال	:	شہر پولس کا سردار
ندیم	:	مصاحب، ہمنشین، یار
اولوالابصار	:	صاحب نظر، صاحب عقل، فہم
اسماءالرجال	:	لوگوں کے نام

عمرانیات	:	سماجیات
ارتداد	:	ترک اسلام
حمار	:	گدھا، گدھے والا
طبّاخ	:	باورچی
سیمرغ	:	ایک روایتی بہت بڑا پرندہ
کیمیا	:	نادر و نایاب، کیمسٹری

10.9 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

10.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. تاریخ فیروز شاہی کا سن تالیف کیا ہے۔
2. برنی کے والد کا نام کیا تھا۔
3. منہاج السراج کی تالیف کا نام بتائیے۔
4. برنی کس سلطان کا ندیم تھا۔
5. سیر الاولیاء کس کی تصنیف ہے۔
6. برنی کس صوفی بزرگ سے بیعت تھا۔
7. برنی کے نانا حسام الملک کس سلطان کے دربار سے وابستہ تھے۔
8. 'ثنائے محمدی' کو کس نے تحریر کیا ہے۔
9. برنی کی تاریخ پیدائش کیا ہے۔
10. سلطان محمد شہید کس سلطان کا بیٹا تھا۔

10.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. برنی کے لیے مثالی سلطان کون تھا اور کیوں؟
2. تاریخ فیروز شاہی کے دائرہ تحریر کی وضاحت کیجیے۔
3. برنی نے تاریخ فیروز شاہی میں کن ماخذوں کا استعمال کیا ہے؟
4. برنی سلطان محمد بن تغلق سے کیوں نفرت کرتا تھا؟
5. فتاوائے جہانداری پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔

10.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. ضیاءالدین برنی کے نظریۂ تاریخ پر تفصیل سے بحث کیجیے۔
2. بحیثیت مورخ و مفکر برنی کا تعین و تشخیص کیجیے۔
3. 'ہند فارسی تاریخ نویسی میں تاریخ فیروز شاہی کو ایک سنگ میل قرار دیا جاسکتا ہے' اس بیان کی وضاحت کیجیے۔

10.9 مزید مطالعہ کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. K.A. Nizami, *On History and Historians of Medieval India*, Delhi, 1983.
2. Jagdish Narayan Sarkar, *History of History Writing in Medieval India*, Calcutta, 1977.
3. H. Siddiqui, 'New Light on Ziauddin Barani as Historian', *Islamic Culture*, Vol. XIII, No. 201, January-April 1988.
4. ضیاءالدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، اردو ترجمہ سید معین الحق، لاہور 1983ء۔
5. ضیاءالدین برنی، فتاوائے جہانداری، اردو ترجمہ بعنوان سلاطین دہلی کا سیاسی نظریہ، محمد حبیب و بیگم افسر عمر سلیم خان، دہلی 1979ء۔
6. محب الحسن، ہندوستانی دور وسطی کے مورخین، اردو ترجمہ مسرور ہاشمی، دہلی 1985ء۔
7. اقتدار حسین صدیقی، اردو میں تاریخ نویسی کی ابتداء، رام پور 2008ء۔
8. نبی احمد سندیلوی، تذکرۂ مورخین، کراچی 1988ء۔

اکائی 11۔علاقائی سلطنتوں کی تاریخ نویسی

(Traditions of Regional Sultanates)

اکائی کے اجزا

11.0	تمہید
11.1	مقاصد
11.2	کلہن
11.3	تاریخ مبارک شاہی
11.4	تاریخ محمدی
11.5	فتوح السلاطین
11.6	برہان مآثر
11.7	سندھ وملتان
11.8	تاریخ فرشتہ
11.9	ریاض السلاطین
11.10	مراۃ سکندری
11.11	ظفر الوالیہ بمظفر وآلیہ
11.12	اکتسابی نتائج
11.13	کلیدی الفاظ
11.14	نمونہ امتحانی سوالات
11.14.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
11.14.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
11.14.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
11.15	مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

11.0 تمہید (Introduction)

ہندوستان میں متعدد بڑی بڑی اور عظیم سلطنتیں وجود میں آئیں۔ قدیم ہندوستان میں موریہ، گپت اور ہرش کی سلطنت، عہد وسطیٰ میں مملوک، خلجی، تغلق اور مغل سلطنت وغیرہ۔ قدیم دور میں چونکہ باقاعدہ تاریخ نویسی کا رواج نہیں تھا اس لیے اشوک اور سمندر گپت جیسے حکمرانوں نے اپنے کارنامے پتھروں اور ستونوں پر کندہ کروائے۔ تحریر کے چلن کے عام ہونے کے بعد ہرش نے اور بعد کے حکمرانوں نے اپنے درباریوں کے ذریعے اپنے دور حکومت کے واقعات تحریر کرائے جیسے بان بھٹ کی ہرش چرتر اور بلہن کی وکرمانک دیو چرتر وغیرہ۔ ہندوستان میں سب سے پہلی باقاعدہ تاریخی تصنیف کلہن کے ذریعے لکھی گئی کشمیر کی تاریخ 'راج ترنگنی' تھی جس میں ہمیں متعدد مآخذ بطور خاص کتبات کے استعمال کا حوالہ ملتا ہے۔ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں دہلی سلطنت کے قیام کے بعد باقاعدہ تاریخ نویسی کا آغاز ہوا۔ ترک حکمرانوں کے درباریوں اور امیروں نے متعدد تاریخیں لکھیں جیسے تاج المآثر، طبقات ناصری، تاریخ فیروز شاہی، خزائن الفتوح وغیرہ جو کہ عموماً حکمرانوں کی زبان یعنی فارسی میں ہوا کرتی تھیں۔ جس طرح دہلی سلطنت کی تاریخیں تحریر ہویں اسی طرح ہندوستان کے متعدد علاقوں اور صوبوں میں علاقائی حکومتوں کے ماتحت بھی یہ روایت قائم رہی۔ سندھ میں یہ روایت محمد بن قاسم کی فتح سندھ کے بعد قائم ہوئی اور چچ نامہ جیسی تصنیف وجود میں آئی جب کہ کشمیر میں کلہن کے ذریعے اس روایت کی بنیاد ڈالی گئی۔ ہندوستان کے دیگر حصوں میں علاقائی تاریخ نویسی کو دہلی سلطنت کے بکھرنے اور علاقائی سلطنتوں اور ریاستوں کے ابھرنے کے بعد فروغ ملا۔ سید اور لودھی حکمراں بھلے ہی دہلی سے حکومت کرتے تھے مگر ان کی حیثیت ایک علاقائی طاقت سے زیادہ کچھ نہیں تھی اور اسی وجہ سے ان کے دور میں لکھی گئی تاریخوں جیسے تاریخ مبارک شاہی وغیرہ کو بھی علاقائی تاریخ کے ضمن میں رکھا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ عہد وسطیٰ میں جونپور، بنگال، گجرات، مالوا، بہمنی سلطنت، بیجاپور، گولکنڈہ، احمد نگر، وجے نگر، سندھ وغیرہ میں متعدد تاریخیں وجود میں آئیں جن پر ہم آئندہ صفحات میں گفتگو کریں گے۔

11.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- ہندوستان میں ابتدائی عہد وسطیٰ اور عہد وسطیٰ کے دوران علاقائی تاریخ نویسی کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- ہندوستان کے مختلف علاقوں میں تاریخ نویسی کے طرز اور انداز بیان کو سمجھ سکیں گے۔
- علاقائی تاریخ نویسی میں علاقائی حکومتوں اور سلطنتوں کے کردار کا جائزہ لے سکیں گے۔
- علاقائی سرکاری اور غیر سرکاری تاریخوں کو شناخت کر سکیں گے۔
- علاقائی تاریخ نویسی میں مختلف زبانوں کے استعمال کا مشاہدہ کر سکیں گے۔

11.2 کلہن (Kalhana)

کلہن کا شمار کشمیر کے اولین اور نامور مؤرخین میں سر فہرست آتا ہے۔ اس کے آباؤ اجداد کشمیر کے شاہی دربار میں اثر و رسوخ رکھتے تھے. کلہن بارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں للتادتیہ کے آباد کردہ شہر پری ہاس پور میں پیدا ہوا۔ اس کے باپ کا نام چنپک تھا جو والی کشمیر راجہ ہرش (1089ء 1101ء) کا دوار پتی، یعنی درّوں کا محافظ و وزیر تھا۔ چنپک کا بڑا بھائی کنک تھا جو نامور موسیقار تھا۔ راجہ ہرش دیو فنِ موسیقی میں کنک کا شاگرد تھا۔ کلہن ہمہ جہت شخصیت کا مالک تھا۔ اسے علم و ادب، شاعری، موسیقی اور حکمت سے گہرا لگاؤ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے ان علوم و فنون میں گہری دسترس حاصل کی اور شہرت و عظمت کی بلندیوں تک جا پہنچا۔

وہ بیک وقت مؤرخ، محقق، شاعر، حکیم، مدّبر اور دانشور تھا۔ وہ ایک محب وطن قلم کار تھا۔ اس نے ''راج ترنگنی'' کے عنوان سے سنسکرت زبان میں منظوم تاریخ لکھ کر گراں قدر خدمت سرانجام دیں۔ سنسکرت کے عالموں اور مورخین میں کلہن کو جو بلند پایہ مقام حاصل ہے وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آیا ہے۔ کلہن برہمن ذات تھا لیکن عقیدے کے اعتبار سے شیومت کا پیروکار تھا۔ اس نے شیو اور بدھ کا ذکر یکساں احترام سے کیا ہے جس سے عیاں ہوتا ہے کہ وہ انتہا پسندی کے بجائے مذہبی رواداری کا قائل تھا۔ کلہن کا مطالعہ اور مشاہدہ بہت وسیع تھا۔ اس نے کشمیر کے قدیم جغرافیہ کے حوالے جو معلومات فراہم کی ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کشمیر کا کونہ کونہ چھان کر اس نے معلومات کا وسیع ذخیرہ جمع کیا تھا۔ چونکہ وہ ایک بلند پایہ شاعر بھی تھا اس لیے اس نے اپنی تصنیف راج ترنگنی میں تشبیہات و استعارات کا بر محل استعمال کیا ہے۔

راج ترنگنی سرزمین کشمیر کی قدیم ترین اور نہایت مستند تاریخ ہے۔ اس کتاب کو کلہن نے سنسکرت زبان میں منظوم انداز میں والی کشمیر راجہ جے سنگھ کے عہد حکومت میں 1148ء میں لکھنا شروع کیا اور دو برس کے عرصے میں یعنی 1150ء میں مکمل کر لیا۔ راج ترنگنی سے قبل اگرچہ کشمیر میں تاریخ نویسی کی روایت پہلے سے موجود تھی اور کلہن کے چند پیش رو مورخین اس فن میں طبع آزمائی کر چکے تھے لیکن تاریخ میں کلہن کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے جس جذبے اور محنت و لگن سے تاریخ نویسی کی روایت ڈالی اس سے فن تاریخ نویسی میں بام عروج پر متمکن ہوا۔ اس کی مستند اور جامع تاریخ کو کشمیر اور برعظیم ہند میں تاریخ کا اولین ماخذ سمجھا جاتا ہے۔

اس حقیقت کا اعتراف مؤرخ آر سی مجمدار نے اپنی تصنیف 'دی کلاسیکل ایج' میں یوں کہا ہے۔ ہندوستان قدیم کی تمام حکومتوں پر یہ فخر صرف کشمیر کو حاصل ہے کہ قدیم ترین ایام کی ایک کتبی تاریخ اس کے پاس موجود ہے۔ ڈاکٹر رادھا کرشن اپنی تصنیف 'انڈین فلاسفی' میں لکھتے ہے. ''جہاں ہندوستان کو اپنے ماضی کی تاریخ کا کھوج لگانے کے لیے رامائن اور مہابھارت کا سہارا لینا پڑتا ہے، کشمیر ایک ایسا خطہ ہے جسے اپنی ہزاروں سال پر محیط ریکارڈ شدہ تاریخ پر فخر کرنا چاہیے۔'' ڈسکوری آف انڈیا کے مولف کی رائے ہے۔ ''یونانیوں، چینیوں اور عربوں کے برعکس ہندوستانی تاریخ نویس نہیں تھے اور نہ کتاب جسے تاریخ سمجھنا چاہیے 'راج ترنگنی' ہے۔

راج ترنگنی جن قلمی کتبوں اور مآخذ کی مدد سے لکھی گئی ہے ان میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں۔ سورت نامی شاعر کی ایک طویل نظم جس میں قدیم شعراء کے کلام کے نمونے تھے۔ کھیم اندر کی تصنیف 'نرپاولی'، پنڈت ہیلاراج کی 'پارتھی واولی'، 'نیلامت پران'، راج ترنگنی سے قبل گیارہ مصنفین وشعراء کی لکھی گئی چیدہ چیدہ تصانیف۔ ان مآخذوں کے علاوہ کلہن نے پتھر کے کتبوں، قدیم سکوں اور مخطوطات وغیرہ سے استفادہ کرتے ہوئے تاریخی واقعات اور حالات کو قلمبند کیا۔

راج ترنگنی کا آغاز والی کشمیر راجہ گوننداول (3121 قبل مسیح) کے عہد حکومت سے ہوتا ہے اور 1150ء میں راجہ جے سنگ کے عہد حکومت پر اس کا خاتمہ ہوتا ہے۔ راج ترنگنی آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ فاضل مصنف نے باب کو ترنگ کا نام دیا ہے۔ راج ترنگنی کا طرز تحریر زیادہ تر رامائن اور مہابھارت سے ملتا جلتا ہے۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ راج ترنگنی خالص سنسکرت زبان میں ایک طویل نظم کے قالب میں لکھی گئی ہے۔ یہ آٹھ ترنگوں (حصوں) پر مشتمل ہے۔ جن میں کل 7926 شلوک (اشعار) لکھے گئے ہیں۔ آٹھویں ترنگ سب سے طویل ہے۔ یہ راجہ اچل (11-1110ء) کے عہد حکومت سے شروع ہو کر راجہ جے سنگھ کے عہد حکومت تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس حصے کے بہت سے حالات وواقعات مصنف کے چشم دید ہیں۔ پہلی تین ترنگوں میں کوئی تاریخ نہیں دی گئی۔ چوتھی ترنگ کے شلوک نمبر 703 میں پہلی بار اس نے سن کا ذکر کیا ہے اور وہ 3889 لوکک سموت ہے جو کہ 14-813 عیسوی بنتا ہے۔ اس کے بعد کے تمام حالات وواقعات اس نے کسی نہ کسی حد تک سن وار لکھے ہیں۔

11.3 تاریخ مبارک شاہی (Tarikh-i-Mubarak Shahi)

یحییٰ بن احمد بن عبداللہ سرہندی (وفات ۷۰۸ھ/۱۳۹۹ء) نے اِس کتاب کو تاریخ مبارک شاہی کے نام سے لکھا ہے۔ وہ دہلی کے سید حکمرانوں کا درباری تھا یا درباریوں میں شامل ہونے کی خواہش رکھتا تھا۔ اس نے اپنی کتاب کا نام سید حکمراں مبارک شاہ کے نام پر رکھا۔ کتاب کی ابتداء میں وہ لکھتا ہے کہ ابوالفتح مبارک شاہ کی تخت نشینی کے موقع پر وہ تحفہ میں اس کتاب کو دینا چاہتا تھا۔ اس نے دہلی سلاطین کے واقعات منہاج سراج، برنی اور امیر خسرو سے جو اس کے پیشرو تھے جمع کر لیے ہیں، اور فیروز تغلق کے سالِ جلوس ۱۳۵۱ء سے ۱۴۲۵ء تک کے واقعات ثقہ روایات اور عینی مشاہدات کی بنا پر قلم بند کئے ہیں، اس نے امیروں سپاہیوں کے کام ادوارِ حکومت کے اعتبار سے سلسلہ وار تاریخ اور ترتیب یعنی تخت نشینی، تقرر، فوجی مہمات بغاوتوں کو علی الترتیب تحریر کیا ہے، اور لوگوں کی شہادتوں اور گواہیوں پر بھروسہ کیا ہے۔ اس کی کتاب درحقیقت ایک علاقائی روزنامچہ تھی۔ وہ تاریخ کو فوجی اور سیاسی واقعات کا مجموعہ بنا دیتا ہے اور وہ تاریخ نویسی کو داخلیت پر محمول کرتا ہے گویا سب کچھ خدا کی مرضی سے ہوا، وہ ہر دور کی تاریخ اس جملے پر ختم کرتا ہے 'واللہ اعلم' یعنی اصل حقیقت خدا ہی جانتا ہے، محمد غوری کے زمانے سے ہندستان میں بدلتی ہوئی اسلامی تصویر کو تقدیر اور خدا کی مرضی پر منحصر کرتا ہے اور محمد بن تغلق کی دشواریوں کا تجزیہ کرتے ہوئے انسانی افعال اور فیصلوں سے منسوب کرتا ہے۔

تاریخ مبارک شاہی بنیادی طور پر محمد غوری کے زمانے سے لے کر تقریباً 1434 تک کے سیاسی واقعات کا ایک سیدھا سادہ بیان

ہے۔ یہ شمالی ہندوستان کے مسلم حکمرانوں اور امرا کے کارناموں کو تفصیل سے بیان کرنے کی کوشش کرتی ہے جس میں ہر دورِ حکومت اپنے آپ میں مکمل ہوتا ہے اور اس کا سابقہ یا بعد کے دور سے کوئی تعلق نہیں رکھا گیا ہے۔ تاریخ مبارک شاہی میں تغلق دور سے سیاسی واقعات کا بیان زیادہ تفصیلی اور ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔

ای۔ سری دھرن (E. Sreedharan) کے مطابق ''سرہندی کی تصنیف انفرادی واقعات کو دوبارہ بیان کرنا ہے جس کا کوئی اصل کردار نہیں ہے۔ وہ شاذ و نادر ہی (کسی واقعے کی) تشریح کرتا ہے کیونکہ قدرت خداوندی نے سبب کی وضاحت کی جگہ لے لی ہے۔''

ہربنس مکھیا (Harbans Mukhia) کے مشاہدہ میں کسی اہم واقعے کے اسباب کی مکمل وضاحت کی صرف ایک مثال موجود ہے اور وہ محمد بن تغلق کی سلطنت کے ٹوٹنے اور بکھر جانے کا ہے- یہاں، جو سات اسباب شامل کیے گئے ہیں، اس میں کسی بھی خدائی طاقت یا خدا کی ناراضگی کا تقریباً کوئی حوالہ نہیں دیا گیا ہے۔ یہ تمام اسباب معاشی، سیاسی اور فوجی ہیں، جو محمد بن تغلق کی جلد بازی، غیر اخلاقی، غیر دانشمندانہ اور جابرانہ اقدامات پر مشتمل ہیں۔ اس کے باوجود اگر تنقیدی طریقوں، اسباب کی وضاحت اور اس کی تاریخ نویسی کی کمیوں کو ایک طرف رکھ دیں، تو سرہندی کا کام، جیسا کہ پیٹر ہارڈی (Peter Hardy) لکھتا ہے، ''نثر اور نظم میں اخلاقی اصولوں سے بھرپور ہے۔''

11.4 تاریخ محمدی (Tarikh-i-Mohammadi)

بہمد خانی کے والد کالپی کے 'سلطان' کے تحت جھانسی کے شمال میں واقع 'ایرچ' کے مقطی (والی) تھے۔ خانی کی تاریخ محمدی، جو 1439 میں مکمل ہوئی، منہاج سراج کی طبقات ناصری کی طرز پر ایک عالمی تاریخ ہے لیکن اس میں دہلی کے بعد کے سلطانوں، امیر تیمور اور کالپی کے سلاطین کی اپنے ہندو اور مسلمان پڑوسیوں کے ساتھ جدوجہد کے واقعات شامل ہیں۔ اس کی تصنیف میں صوفیوں کے تذکرے بھی شامل ہیں۔ منہاج بنیادی طور پر گزشتہ تاریخوں پر انحصار کرتا ہے جب کہ خانی نے پہلے لکھی گئی تاریخوں کو ہی اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ البتہ منہاج کی طرح ہی، خانی بھی اپنے ذرائع کی سچائی کو جانچنے میں زیادہ زور نہیں دیتا۔

دونوں ہی اہم مورخ ہیں۔ پیٹر ہارڈی لکھتے ہیں: ''حدیث کی طرح تنقید کے قاعدوں کی غیر موجودگی، معجزاتی عناصر کی پائے جانے سے ظاہر ہوتی ہے- خواب، حال، مراقبے اور برائی پر قہر خداوندی نازل ہونے کا تذکرہ بھی پایا جاتا ہے- کوئی بھی ایسی تاریخ میں غیر جانبداری کی توقع نہیں کر سکتا جو کردار کے لحاظ سے زیادہ تر مذہبی ہیں۔ یہ مورخین کافر کو برا بھلا کہتے ہیں اور اس پر لعنت بھیجتے ہیں۔''

حالانکہ ہارڈی اس بات کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ یہ مورخین صرف ان کافروں جیسے منگولوں کو برا کہتے ہیں جو مسلمانوں پر ظلم کرتے ہیں، جس کے ساتھ ہی وہ حکومت کے باغی مسلمانوں پر بھی لعنت بھیجتے ہیں۔ یہ بات بھی مد نظر رہے کہ وہ کافروں کی بھی اچھی باتوں جیسے عدل و انصاف کی تعریف کرنے سے نہیں چوکتے اور حکومت کے قوانین کو شریعت سے الگ کر کے دیکھتے ہیں۔ اس طرح ان کی دی گئی معلومات کو مذہبی کہہ کر نکارا نہیں جا سکتا نہ ہی ان کی اہمیت کم کی جا سکتی ہے۔

11.5 فتوح السلاطین (Futuh-ul-Salatin)

خواجہ عبد الملک عصامی (۱۳۱۱ء) دہلی میں پیدا ہوا، اس کے دادا عزالدین عصامی اسماعیل بلبن کے عہد میں سپہ سالار تھے، اس نے اپنے والد کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بہت ہی کم عمر میں باپ کی شفقت سے محروم ہو گیا ہو گا جب محمد بن تغلق نے ۱۳۲۷ء میں دہلی کے امراء کو اور صوفیا وغیرہ کے تقریباً ۱۲۰۰ خاندانوں کو دیو گیر جانے پر مجبور کیا تو عصامی بھی اپنے نوّے سالہ دادا کے ساتھ روانہ ہوا، اس کے دادا تلپت ہی میں (دلّی کے قریب) فوت ہو گئے لیکن عصامی بعافیت دیو گر پہنچ گیا اور آئندہ بائیس سال کے دوران وہ ایک غیر معمولی ادیب کی حیثیت سے تلخی و ناکامی کی زندگی بسر کرتا رہا، اپنے معاصرین سے متنفر ہو کر وہ حجاز جانا چاہتے تھے، چنانچہ انھوں نے اپنی مثنوی ۴۹۔۱۳۵۰ء میں مکمل کرنے کے تھوڑے دنوں بعد رختِ سفر باندھا اور مدینہ میں سکونت اختیار کی اور وہیں پر وفات پائی۔

عصامی کی شہرت کا دار و مدار اس کی تصنیف مثنوی فتوح السلاطین پر ہے۔ جسے اس نے بہمنی خاندان کے بانی علاؤالدین حسن بہمن شاہ کی سرپرستی میں نظم کیا، یہ مثنوی تقریباً آٹھ ماہ کی مدّت میں مکمل ہوئی اس میں کل گیارہ ہزار چھ سو تیرانوے ۱۱۶۹۳ اشعار ہیں۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی مثنوی فتوح السلاطین شاہ نامہ ثابت ہو، اس لیے وہ بہمنی سلطان کے لیے فردوسی بن گیا، اسی کے نام سے اس کو معنون کیا تا کہ اس کی سرپرستی حاصل رہے اور ایک دائمی شہرت حاصل ہو، اس نے محمد بن تغلق کو جو سخت و سست کہا اس کا بنیادی سبب اس کے اپنے مصائب تھے۔ حالانکہ وہ تغلق دور کا اکیلا مصنف ہے جو سلطان کے خوف و عنایات سے اوپر ہے۔

فتوح السلاطین (۵۰۔۱۳۴۹ء) ہندوستان میں غزنوی حکومت (۹۹۷ء۔۱۱۷۳ء) غوری حکومت (۱۱۷۳ء۔۱۲۰۵ء) اور دہلی سلطنت کے زمانے تک مسلمانوں کے کارناموں کا ایک سرسری جائزہ ہے جو طویل رزمیہ نظم کی صورت میں ہے، تاریخی نقطۂ نظر سے اس کی قدر و منزلت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس میں حقائق بیان ہوئے ہیں اور شاعرانہ مبالغہ آرائی سے پرہیز کیا گیا ہے، نظام الدین احمد نے طبقاتِ اکبری میں اور بدایونی نے منتخب التواریخ میں اس کی تصنیف کو ماخذ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ عصامی حسن نظامی کا مرہونِ منت ہے، جس کا وہ اعتراف کرتا ہے جس کی اس نے پیروی کی لیکن وہ اس بلندی کو نہ پا سکا جس کو نظامی نے حاصل کیا کیونکہ وہ تاریخی کتاب نہیں لکھنا چاہتا تھا بلکہ رزمیہ نظم کہنا چاہتا تھا۔

11.6 برہان مآثر (Burhan-i-Maathir)

دکن کی تاریخ بالخصوص گلبرگہ اور بیدر کی بہمنی اور احمد نگر کی نظام شاہی کا حال جاننے کے لیے ایک اور اہم تصنیفؔ برہان مآثرؒ ہے جو سید علی بن عزیز اللہ طباطبائی نے تحریر کی ہے۔ عزیز اللہ نے پہلے گولکنڈہ کے حکمران محمد قلی قطب شاہ(1580-1612) اور پھر برہان نظام شاہ(1591-95) کی خدمت میں خدمات انجام دیں۔ انہوں نے اس کتاب کی تالیف 1592ء میں مکمل کی۔ وہ سلطان محمد بن تغلق اور بہمنی سلطنت کے قیام کی تاریخ کے لیے عصامی کا مقروض ہیں۔

11.7 تاریخ فرشتہ (Tarikh-i-Farishta)

محمد قاسم ہندو شاہ استر آبادی (پیدائش غالباً ۱۵۷۲ء/۹۸۰ھ) کے والد غلام علی ہندو شاہ بیجاپور میں آباد ہوئے۔ مرتضی نظام شاہ (۱۵۶۵ء تا ۱۵۸۸ء) کی ملازمت میں فرشتہ کو اس کے حفاظتی دستے میں جگہ ملی، مرتضیٰ شاہ کی وفات کے بعد وہ میرا حسین (۱۵۸۹ء) کے ساتھ رہا، میرا حسین کے قتل کے بعد فرشتہ بیجاپور میں ابراہیم عادل شاہ کی ملازمت میں (۱۸۹۰ء) آیا، جب ابراہیم عادل شاہ کی بیٹی بیگم سلطان کی شادی اکبر کے بیٹے شاہزادہ دانیال سے طے ہوئی تو (جولائی ۱۶۰۴ء) اس نے بیگم کے ہمراہ سفر کیا اور اپنی تالیف ۱۶۰۶ء میں مکمل کی، ابراہیم عادل شاہ ہی کی نسبت اس نے اپنی کتاب کا نام گلشنِ ابراہیمی رکھا جو بعد کے زمانہ میں تاریخِ فرشتہ کے نام سے مشہور ہوئی، اس کتاب کے دو نسخے دستیاب ہیں، ایک نسخہ ۱۶۰۷ء کا لکھا ہوا ہے جب کہ دوسرا ۱۶۰۹-۱۰ء کا ہے اور یہی دوسرا نسخہ تاریخِ نورس نامہ کے نام سے معروف و مشہور ہے۔ ہندوستانی دورِ وسطی میں جو بھی روزنامچے لکھے گئے ان میں تاریخ فرشتہ (گلشنِ ابراہیمی) اہم ترین ہے۔ اس کتاب کی شروعات ایک مقدمہ سے ہوتی ہے جس میں ہندوؤں کی تاریخ کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے، مقدمہ کے بعد شاہانِ اسلام کے واقعات اور مشائخ عظام کی سوانح ہے، جن کا تعلق سلطان سبکتگین غزنوی کے زمانے سے ہندستان سے رہا ہے، کتاب کے اختتام پر ہندوستان کے جغرافیائی حالات، ہندوؤں کی تاریخ شناسی اور ہندو راجاؤں کا ذکر ہے جو فرشتہ کے زمانے میں باجگزار حکمراں تھے۔

فرشتہ کے زمانے میں ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ نویسی کا انداز آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر مسلم حکمرانوں کے حالات تک محیط ہوتے تھے۔ اور علاقائی فرمانرواؤں اور مشائخ کا خاص تذکرہ غزنوی دور سے شروع ہوتا تھا۔ نویں صدی ہجری/پندرہویں صدی عیسوی سے عام تاریخوں میں ان فارسی تاریخوں کی پیروی ہونے لگی جو مغل اور گجراتی سلاطین کی سرپرستی میں لکھی گئیں (ان میں میر خواند کی روضۃ الصفا، خواند میر کی خلاصۃ الاخبار (۱۵۰۰ء) حبیب السیر (۱۵۲۳ء) شامل ہیں۔ روضۃ الصفا کا اثر عبد الکریم بن محمد کی الطبقات المحمودیۃ شاہیہ (۱۴۹۹ء-۱۵۰۰ء) اور فیض اللہ کی تاریخ صدرِ جہاں (۲-۱۵۰۱ء) میں بھی نظر آتا ہے (دونوں مورخ محمود شاہ بیگڑا کی سرکار میں ملازم تھے)۔

اکبر نے مقامی اور علاقائی تاریخ نویسی کی حوصلہ افزائی اس لیے کی تھی کہ اس کی سلطنت کی کڑیاں مغلوں سے قبل مسلم سلاطین سے ملائی جاسکیں، اور یہ تاثر پیدا ہو کہ اس کی حکومت اسلامی حکومت کے تسلسل کا درجہ رکھتی ہے ان میں عباس خاں شیروانی کی تحفۂ اکبر شاہی (۱۵۷۹ء) اور ابوالفضل کا اکبر نامہ شامل ہے۔ اس کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ مغل سلطنت کی شان و شوکت کے مطابق ایک عام اور مفصل علاقائی تاریخ لکھوائی جائے اس کی مثال نظام الدین احمد کی طبقاتِ اکبری (۱۵۹۳-۱۵۹۲ء) ہے۔ فرشتہ عبد الکریم اور فیض اللہ کی تصانیف سے متعارف تھا وہ کہتا ہے کہ ابراہیم عادل شاہ نے اسے روضۃ الصفا کا ایک نسخہ عطا کیا اور کہا کہ مملکتِ ہند کی تاریخ لکھتے وقت اس میں سلاطینِ دکن کے حالات، نظام الدین احمد کی طبقات سے زیادہ واضح اور مفصل ہو۔ گلشن ابراہیمی (تاریخ فرشتہ) ایک سن وار تاریخ ہے جو تمام قدیم تاریخ، زبانی روایات، اور خود فرشتہ کے ذاتی مشاہدات پر مبنی ہے۔ اس کا مقصد مسلمانوں کے عظیم الشان دورِ حکومت کی تاریخ نگاری ہے ایسا لگتا ہے کہ یہ طبقات اکبری کا تتمہ یا خلاصہ ہے۔ فرشتہ کے یہاں ہندو راجاؤں کی اور ان کے دور کی تفصیل ہے، عربوں کی ہندوستان میں آمد، افغانوں کی

اصل اور ان کے کارنامے کابل میں عربوں کا اقتدار اور سبکتگین کی حکومت کے واقعات طبقاتِ اکبری (نظام الدین احمد) میں بیان کئے گئے واقعات سے زیادہ ہیں، فرشتہ واقعات وحادثات کی چھان بین میں اپنا وقت صرف نہیں کرتا بلکہ تاریخ الفی اور طبقاتِ اکبری سے واقعات کو ہو بہو نقل کر دیتا ہے۔ اور بعض جگہوں پر ایسا بھی ہوا ہے کہ طبقاتِ اکبری کی عبارتیں ویسے ہی نقل کر دیتا ہے۔ گلشنِ ابراہیمی یا تاریخِ فرشتہ کی تاریخ نویسی کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھنے کی ضرورت ہے تاکہ اس کے متضادات اور مختلف بیانات اور تاریخی اغلاط کو از سرِ نو مرتب کیا جاسکے۔

11.8 ریاض السلاطین (Riyaz-ul-Salatin)

1788ء سے پہلے قرون وسطی بنگال کی کوئی مسلسل تاریخ فارسی میں نہیں لکھی گئی۔ جب تک بنگال سلطنت دہلی کے ماتحت رہا، دہلی کے مرکزی اہم مورخین نے اپنی تحریروں میں دہلی بنگال سے متعلق موضوع کو جگہ دی۔ بعد میں نظام الدین احمد اور فرشتہ نے اپنی تحریروں میں بنگال کی تاریخ مرتب کرنے کی کوشش کی۔ لیکن بنگال کی ایک مسلسل تاریخ جو فارسی زبان میں 18ویں صدی کے آخر میں لکھی گئی تھی، اسے **ریاض السلاطین** کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ کتاب اودھ کے بارہ بنکی ضلع کے زیدپور قصبہ کے رہنے والے غلام حسین سلیم جو بنگال کے مالدہ میں جاکر پوسٹل سکریٹری کے طور پر مقرر ہوا تھا، نے ایک انگریز افسر جارج اُڈنی کی درخواست پر ترتیب دی تھی۔

1787-88ء میں مرتب ہونے والی اس کتاب کو دیباچہ کے ساتھ چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ دیباچے میں مصنف نے جغرافیائی تفصیلات کے ساتھ ساتھ بنگال کے قدیم بادشاہوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ پہلی جلد میں ان لوگوں کی تاریخ لکھی گئی ہے جنہیں دہلی کے سلطانوں نے بنگال پر حکومت کرنے کے لیے مقرر کیا تھا۔ دوسری جلد میں بنگال کے آزاد بادشاہوں کی تاریخ، تیسری جلد میں تیمور کے ماتحت ناظمین کی تاریخ اور چوتھی جلد میں برطانیہ کے دور میں بنگال کی تاریخ کا ذکر کیا گیا ہے۔ مصنف نے زیادہ تر طبقات اکبری اور تاریخ فرشتہ کو اپنے ماخذ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ بہت سی اہم فارسی تصانیف کو مصنف نے نظرانداز کر دیا ہے یا وہاں تک اسکی رسائی نہ تھی۔ اس تصنیف میں تواریخ اور حقائق میں مزید کوتاہیوں کے ساتھ ساتھ تاریخ سازی کی معیاری روایات کو بھی نظرانداز کیا گیا ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود یہ کتاب بنگال کی تاریخ کے لیے ایک اہم ماخذ ہے۔

گجرات سلطنت کی بنیاد ظفر خان نے مظفر شاہ (1404-11) کا لقب اختیار کر 1450ء میں رکھی تھی۔ مظفری خاندان کے حکمرانوں نے علماء، شعراء اور صوفیاء وغیرہ کو بلا تفریق وملت پناہ دی۔ اس کے نتیجے میں مسلم علماء کے ساتھ ساتھ ہندو اور جین مذہب کے دانشوروں اور شعراء نے گجرات کے سلاطین کے تعریف میں لاتعداد تحریریں لکھیے۔ مثلاً اُدے راج (Udai Raj) نے جو محمود شاہ بیگڑا کے درباری تھے، نے سنسکرت زبان میں **راج وینود** (Raj Vinod) کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ اُدئے راج نے محمود شاہ کی تعریف کرتے ہوئے اسے ایک طاقتور، عظیم اور ہندو مت کا محافظ قرار دیا ہے، گویا وہ ایک کٹر ہندو بادشاہ ہو۔ اسی طرح کی ایک دوسری سنسکرت تصنیف گنگا داس پرتاپ ولاس (Pratap Vilas) مصنف گنگا دھر (Ganga Das) کا بھی ذکر کیا جاسکتا ہے۔ ہندوستان کے علاوہ دیگر ممالک بالخصوص فارس، یمن اور مصر کے بہت سے عالم اور مورخین نے بھی ان کی سلطنت اور دربار میں پناہ لی۔

11.9 مراۃ سکندری (Mirat-i-Sikandari)

'مراۃ سکندری' مصنف سکندر بن محمد منجھو، گجرات کی تاریخ کا ایک بہت اہم ادبی ماخذ ہے۔ سکندر منجھو نے کچھ وقت گجرات کے مغل صوبیدار مرزا عزیز کوکا کی خدمت میں گزارا اور مرزا عزیز کوکا کے ساتھ گجرات کے سلطان مظفر شاہ سوم کے خلاف جنگ بھی لڑی۔ 1617ء میں جب جہانگیر احمد آباد میں اپنا خیمہ لگایا ہوا تھا تو سکندر منجھو جہانگیر کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور جہانگیر اس کی حکمت اور علم سے بہت متاثر ہوا اور خود جہانگیر نے تزک جہانگیری میں لکھا ہے کہ سکندر منجھو کو گجرات کی تاریخ کا بہت اچھا علم ہے۔ سکندر نے 1611ء کے آس پاس اپنی تصنیف مکمل کیا۔ اس کتاب میں گجرات کے سلاطین ظفر خان (مظفر شاہ اول) سے مظفر شاہ سوم (73-1561) کی وفات تک کی تاریخ مرتب کی گئی ہے۔ یہ کتاب سیاسی تاریخ کے ساتھ ساتھ گجرات کے فن تعمیر، سماج خصوصاً صوفی بزرگوں کی سوانح حیات اور گجرات کی ثقافتی تاریخ کے لیے ایک قابل قدر ذرائع ہے۔ مصنف نے بہت سے واقعات ذاتی معلومات کی بنیاد پر لکھے ہیں۔ اور اس وقت اس ادب کو مکمل کرنے کے لیے سکندر منجھو نے بہت سے ناقابل حصول ادب کا سہارا لیا۔ **'ظفر الولہ بمظفر و آلہ'** مصنف حاجی الدبر بھی مراۃ سکندری سے بہت مستفید ہوئے تھے۔

11.10 ظفر الوالیہ بمظفر و آلیہ (Zafar-ul-Walia bi Muzaffar-wa-Alia)

گجرات اور مالوہ کی تاریخ جاننے کے لیے ایک اور اہم مقبول ماخذ 'ظفر الوالیہ بمظفر و آلیہ' ہے جسے عبداللہ محمد بن عمر المکی المعروف حاجی اُدبیر نے 1605ء میں عربی زبان میں لکھا تھا۔ عبداللہ محمد تقریباً 1540ء میں مکہ میں پیدا ہوئے۔ 15 سال کی عمر میں وہ اپنے والد کے ساتھ ہندوستان آئے اور احمد آباد کو اپنا مسکن بنایا۔ 1559ء میں وہ ایک حبشی سردار محمد الغ خان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسی سردار کی طرف سے انہیں حاجی ادبیر کا نام دیا گیا اور اسی نام سے تاریخ میں مشہور ہوئے۔ جب اکبر نے 1573ء میں گجرات کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کیا تو مصنف کے والد کو بہت سے اوقاف کا انتظام سونپا گیا اور اس زمین کی آمدنی حرمین بھیجی جاتی تھی جس کی ذمہ داری حاجی ادبیر کے سپرد تھی۔ جب مصنف کے والد کا انتقال ہوا تو وہ کچھ عرصے کے لیے خاندیش کے ایک سردار فولاد خان کی خدمت میں بھی خدمات انجام دیے۔

اس کتاب کو مرتب کرنے کے لیے مصنف نے بہت سے اہم معاصر تصانیف کا استعمال کیا تھا جو موجودہ وقت میں ناپید ہیں۔ اس کتاب میں حاجی ادبیر نے گجرات کے سلاطین کے ساتھ ساتھ بہت سے دوسرے تاریخی واقعات، سوانح عمریوں اور خاندانوں کی تفصیلات بھی دی ہیں۔ خصوصاً جونپور، مالوہ، خان دیش، گجرات اور دہلی کے سلطانوں کی تاریخ درج کی گئی ہے۔ گجرات میں مصنف کی طویل خدمات اور ان تاریخوں کو نقل کرنے کی وجہ سے جواب ناقابل رسائی ہیں، ظفر الولہ بمظفر و آلہ کو زیادہ اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔ مصنف نے مالوہ اور گجرات کے سلطانوں کے بارے میں جو واقعات بیان کیے ہیں اُن میں سے کثیر کسی اور کتاب میں نہیں ملتے۔ اس طرح حاجی ادبیر بہت ساری تاریخی تفصیلات کا واحد ذریعہ ہیں اور ان کو نظر انداز کرنا ناممکن ہے۔ یہ مقالہ 1910 عیسوی میں ڈینیسن راس نے ہندوستان کی برطانوی حکومت کے لیے لکھا اور لندن سے شائع کیا۔

گجرات اور مالوہ سلطنتوں کے بارے میں ہمارے مشترکہ ماخذ نظام الدین اور فرشتہ کی تحریریں ہیں، اسی طرح مالوہ کی تاریخ گجرات کے اکثر منابع میں درج ہے، لیکن ان کے علاوہ مکتوبات اشرفی جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، شہاب حکیم کی **'مآثر محمود شاہی'**، مراۃ سکندری، محمد بہماد خانی کی **'تاریخ محمدی'**، نامعلوم مصنف کی **'تاریخ مظفر شاہی'**، **'تاریخ نصیر شاہی'** وغیرہ کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔

سندھ اور ملتان دونوں کا ذکر نظام الدین اور فرشتہ نے اپنی تحریروں میں کیا ہے۔ لیکن مکمل سندھ کے مسلمان سلاطین کی تاریخ کا تذکرہ سب سے پہلے میر محمد معصوم جو اکبر کے درباری شاعر اور نظام الدین احمد بخشی کے دوست تھے، نے **'تاریخ سندھ یا تاریخ معصومی'** کے نام سے مرتب ہے۔ اس نے سندھ پر عربوں کی فتح سے لے کر اکبر کے دور تک پورے سندھ کی تاریخ کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ سندھ کی فتح، ہندوستان کے شہنشاہوں اور گورنروں کی تاریخ اور سمرا و سما خاندانوں کی تاریخ، ارگون خاندان کی تاریخ اور سندھ کی تاریخ 1574ء سے اکبر کی فتح 1599-1600 تک۔ میر محمد نے تاریخ کو بغیر کسی تعصب کے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے سندھ کے چھوٹے چھوٹے تاریخی واقعات کو مرتب کر کے اپنی تاریخ تیار کی ہے۔

طاہر محمد نسیانی کی **'تاریخ بلدہ تھتہ المعروف بہ تاریخ طاہری'**، مرزا محمد صالح ترخان بن سید جلال تتوی کی **'ترخان نامہ'** اور علی شیر قانع ٹھٹوی کی **'تحفۃ الکرام'** وغیرہ سندھ اور ملتان کی تاریخ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

11.11 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ کو بہت سے اہم علاقائی ادب کے بارے میں مفید معلومات ملیں گی۔ ان ذرائع سے ہمیں معلوم ہوگا کہ ان علاقائی ریاستوں نے اپنے علاقے میں دہلی سلطنت کے ورثے کو قائم کرنے اور اس کے تحفظ کے لیے شدید کوششیں کیں۔ علاقائی بادشاہوں اور سلاطین نے بلا تفریق اپنی استطاعت کے مطابق ہر ایک کو اپنے دربار میں پناہ دی اور وہ درباری بھی پوری دیانتداری کے ساتھ اپنے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ مثال کے طور پر ادئے راج اور گنگا دھر وغیرہ کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ اس اکائی کے مطالعہ کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دہلی سلطنت کے مرکزی مصنفین کے برعکس علاقائی علماء اور مورخین نے ہندوستان کے عام لوگوں کی تاریخ لکھنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں سماج کے تمام طبقوں کے مسائل کو بڑی دلچسپی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس یونٹ کا مطالعہ کرنے سے علاقائی ریاستوں کے جاری کردہ سکوں سے ان کی سماجی، سیاسی اور اقتصادی تاریخ حالات کے بارے میں اور ان کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ صوفی ادب کا تجزیہ کرنے کے بعد ان کے خانقاہی نظام، صوفیاء کی روزمرہ کا معمول اور ان کی تعلیمات پر ایک خاص روشنی پڑتی ہے۔ ہمیں معلوم ہوگا کہ صوفیاء اکرام اپنی خانقاہوں کے دروازے سبھی کے لیے ہمیشہ کھلا رکھتے تھے۔ اور ان کی تعلیمات اور اخلاقیات کا ہی نتیجہ تھا کی گنگا جمنی تہذیب اپنے نقطہ عروج تک پہنچی۔ اس یونت سے یہ سمجھنے میں مدد ملے گی کہ ان علاقائی حکمرانوں کے ساتھ ان صوفیوں کے تعلقات میں کیسی تبدیلیاں آرہی ہیں جو اپنے آباؤاجداد صوفیاء سے مختلف تھے۔

11.12 کلیدی الفاظ (Keywords)

دیوگیری : مہاراشٹرا میں دولت آباد شہر

کالپی : یوپی کا ایک تاریخی شہر

سندھ : پاکستان کا ایک صوبہ

11.13 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

11.13.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. ریاض السلاطین کے مصنف کون ہیں؟
2. وجے نگر کے تولوو اخاندان کی بنیاد کس نے رکھی؟
3. کیرتی لتا کے مصنف کا نام بتائیے۔
4. مدوراو جیم نظم میں کس کی فتوحات کا ذکر کیا گیا ہے؟
5. جوامع الکلم کس صوفی کی ملفوظات ہے؟
6. فرشتہ نے اپنی کتاب تاریخ فرشتہ کس سلطان کو وقف کی تھی؟
7. راج ونود مصنف اُدیراج میں کس بادشاہ کی تاریخ مرتب کی گئی ہے؟
8. A History of Jaunpur:Shiraz-i-Hind کس کی تصنیف ہے؟
9. کس خاندان کے حکمرانون کے سکوں پر ہنومان کی تصویر بنی ہوئی تھیں؟
10. رشدنامہ کس کی تصنیف ہے؟

11.13.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات(Short Answer Type Questions)

1. طغرئی طرز کے سکوں پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. شرقی سلطنت کی تاریخ کے لیے صوفی ادب کا مختصر احوال پیش کیجیے۔
3. وجے نگر سلطنت کے لیے غیر ملکی ذرائع کی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔
4. راجستھان کے کھیات ذرائع کی اہمیت کا تنقیدی جائزہ لیں۔
5. وجئے نگر کی تاریخ کے لیے غیر ادبی ماخذ پر ایک مضمون لکھیے۔

11.13.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. علاقائی ریاستوں کی تاریخ کے مطالعہ کے لیے علم مسکوکات کی اہمیت اور افادیت پر اپنی رائے کا اظہار کیجیے۔
2. گجرات اور مالوہ کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے لیے ادبی ذرائع پر ایک مضمون لکھیے۔
3. تاریخ دکن کے مطالعہ کے ذرائع پر ایک نوٹ لکھیے۔

11.14 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. H.K. Sherwani ed., *History of Medieval Deccan*, Andhra Pradesh Govt. Text-book Press, Hyderabad, 1974.
2. Syed Ejaz Hussain, *Bengal Sultanate: Politics, Economy and Coins (1205-1576)*, Manohar, New Delhi, 2003.
3. Syed Ejaz Hussain, *Shiraz-i-Hind: A History of Jaunpur Sultanate*, Manohar, New Delhi, 2017.
4. Upendra Nath Day, *Medieval Malwa: A Political and Cultural History (1401-1562)*, Munshiram Manoharlal, Delhi, 1965.
5. Robert Sewell, *A Forgotten Empire (Vijayanagar): A Contribution to the History of India*, Swan Sonnenschein & Co., London, 1900.
6. M.S. Commissariat, *A History of Gujrat*, 2 vols., Longsmans, Green & Co., London, 1938.

اکائی 12۔ابوالفضل

(Abul Fazl)

اکائی کے اجزا

12.0		تمہید
12.1		مقاصد
12.2		ابوالفضل کے ابتدائی حالات
	12.2.1	اکبر کے دربار میں رسائی
	12.2.2	تصنیفات
12.3		اکبر نامہ، ساخت اور موضوعات
12.4		اکبر نامہ کے مآخذ اور طرز تحریر
12.5		ابوالفضل، علم تاریخ و تاریخ نویسی
12.6		اکتسابی نتائج
12.7		کلیدی الفاظ
12.8		نمونہ امتحانی سوالات
	12.8.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
	12.8.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
	12.8.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
12.9		مزید مطالعہ کے لیے تجویز کردہ کتابیں

12.0 تمہید (Introduction)

ہندوستان میں فارسی تاریخ نویسی کا آغاز دہلی سلطنت کے عہد سے ہوا جو بالآخر مغل دور میں اپنے کمال کو پہونچ گیا۔ جہاں ایک طرف مغل حکمرانوں نے اپنے اپنے عہد کی تاریخ مرتب کرنے کے لیے مورخین کا تقرر کیا، وہیں دوسری طرف انفرادی طور پر بھی بعض اہل قلم نے اپنے ذوق و وجدان کے مطابق واقعات کو درج کیا۔ اس طرح تحریری شکل میں ایک بڑا تاریخی سرمایہ وجود میں آگیا۔ یہ بات قابل غور ہے کہ تنہا عہد وسطیٰ ہند میں لکھی گئی فارسی تاریخوں کی تعداد وسط ایشیاء اور ایران کی مجموعی تعداد سے زیادہ ہے۔ عہد وسطیٰ کے مورخین میں ابوالفضل کا نام سب سے معتبر مانا جاتا ہے جس نے اکبر نامہ جیسی بے مثال تاریخ تصنیف کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مواد کی تلاش، واقعات کی تفتیش اور حقائق کی تحقیق میں ابوالفضل نے جس احتیاط اور دقتِ نظر کا مظاہرہ کیا ہے، وہ بہت a کم دیکھنے کو ملتا ہے۔ اکبر نامہ میں عہد اکبری کے سیاسی، سماجی، معاشی اور ثقافتی تمام پہلوؤں پر مستند بحث ہوئی ہے۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں اعداد و شمار کے ذریعہ مغل ریاست کے انتظامی امور اور مختلف محکمہ جات بالخصوص محصول اور زراعت و پیداوار سے متعلق تفصیلات کو انتہائی مدلل اور محقق انداز میں پیش کر کے 16 ویں صدی کے ہندوستان کا مکمل نقشہ کھینچ دیا ہے۔ اس یونٹ میں اکبر نامہ کی تاریخی حیثیت اور ابوالفضل کی تاریخ نویسی کے مختلف مبادی و مفروضات پر بحث ہوگی۔

12.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- 16 ویں صدی کے دوسرے نصف کے علمی و فکری ماحول کا جائزہ لے سکیں گے۔
- ابوالفضل کے ابتدائی حالات کا ایک تفصیلی جائزہ لے سکیں گے۔
- ابوالفضل کے سیاسی، مذہبی اور علمی مزاج پر اثر انداز ہونے والے محرکات پر ایک نظر ڈال سکیں گے۔
- اکبر نامہ اور آئین اکبری کی تاریخی حیثیت، لکھنے کے مراحل اور طریقِ کار کو جان سکیں گے۔
- بطور ماخذ اس کا ایک تنقیدی تجزیہ کر سکیں گے۔

12.2 ابوالفضل کے ابتدائی حالات (Early Life of Abul Fazl)

ابوالفضل 1551ء میں آگرہ میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد شیخ مبارک سے حاصل کی جو اپنے عہد کے مشہور عالم دین و صوفی تھے اور جن کے خیالات میں مسلکی رواداری اور مذہبی وسعت پائی جاتی تھی۔ ابوالفضل بچپن سے ہی ذہانت اور اچھی یادداشت کا مالک تھا۔ چنانچہ پانچ سال کی عمر سے ہی پڑھنے اور لکھنے لگا۔ حالانکہ ابوالفضل نے کم عمری میں ہی بیشتر مروجہ علوم میں واقفیت حاصل کر لی تھی، لیکن رسمی علوم اور قدیم مذہبی مباحث میں اس کو زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ کچھ وقت کے لیے اس نے تعلیم سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور اپنی صلاحیت کے حوالے سے اس کے اندر شکوک و شبہات بھی پیدا ہونے لگے۔ بہر حال وہ دوبارہ تعلیم کی طرف متوجہ ہوا اور 15 سال کی عمر میں علوم منقولہ کے ساتھ ساتھ یونانی فلسفہ کی باریکیاں جو عربی زبان میں ترجمہ ہو چکی تھیں، صوفی تصورات، اشراقی فلسفہ اور مسلم فلاسفہ جیسے ابن سینا وغیرہ کے کاموں سے واقف ہو چکا تھا۔ ابوالفضل کے تعلیمی انہماک کا یہ عالم تھا کہ دو تین دن بغیر کھائے پیئے گزر جاتے تھے۔ دوسرے جب اس پر تعجب کا اظہار کرتے، تو وہ ان کا جواب کچھ اس

انداز میں دیتا کہ "ایک بیمار شخص کو کھانے سے طاقت ملتی ہے۔ لوگوں کو اس پر کیوں تعجب ہونا چاہیے جب ایک شخص کھانے سے گریز کرتا ہے تاکہ وہ اپنی روح اور قوت ذہن کو جلا بخش سکے۔"

ابوالفضل کی اکثر تعلیم اس کے والد شیخ مبارک کے ہاتھوں ہوئی۔ دوران تعلیم تقریباً 20 سال کی عمر میں وہ اپنے والد کے ساتھ خود بھی تدریسی خدمات انجام دینے لگا۔ لیکن تعلیم وتدریس سے ابوالفضل کو وہ ذہنی اور روحانی سکون میسر نہیں ہوا جس کی شاید اس کو تلاش تھی چنانچہ اکثر اس کے اندر تڑپ پیدا ہوتی کہ کہیں گوشہ نشینی اختیار کرلے یا پھر راہبوں کے ہمراہ نکل پڑے۔

دربار میں رسائی سے قبل ابوالفضل اور اس کا خاندان سخت مصیبت میں گرفتار رہا۔ اس کے والد شیخ مبارک کو تنگ نظر علماء کے ظلم و تعصب کا شکار ہونا پڑا تھا۔ ابوالفضل کے ذہن ومزاج پر اس تجربہ کا اثر تادم آخر باقی رہا۔ دراصل شیخ مبارک پر، جو شروع میں شرعی قوانین کے سخت پابند اور ایک قدامت پسند عالم دین تھے، مہدویت کے حامی ہونے کا الزام لگایا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسلام شاہ سور کے دور میں شیخ مبارک نے مہدوی تحریک کے لیڈر شیخ علائی اور عبداللہ نیازی کا ساتھ دیا تھا اور درباری علماء، جن کی قیادت شیخ عبداللہ سلطان پوری کر رہا تھا، کے فتوی کفر کے مقابلے میں ان کا دفاع کیا تھا۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں اس الزام کی تردید کی ہے، حالانکہ بعض دوسرے مآخذ سے شیخ مبارک کے مہدوی تحریک سے تعلق خاطر کا اندازہ ہوتا ہے۔ درباری علماء اور ریاستی اقتدار مہدوی تحریک کے مخالف اس لیے تھے کیونکہ اول تو اس تحریک کے بانی سید محمد جونپوری نے مہدی موعود ہونے کا دعوی کیا تھا (اس دعوے میں ایک سیاسی عنصر موجود ہے) اور دوسرے یہ کہ یہ تحریک ایک زاہدانہ طرز اسلام کی تبلیغ کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے حامیوں کو دنیوی، مالی اور درباری عیش وعشرت سے دور رہنے کی تلقین کرتی تھی۔ لہذا علمائے وقت کا شیخ مبارک پر یہ الزام محض تعصب اور تنگ نظری کا نتیجہ تھا۔

شیخ مبارک پر علمائے وقت کے مظالم کا یہ سلسلہ نہیں رکا۔ اکبر کے عہد میں (تقریباً 70-1569ء کے بعد) درباری علماء بالخصوص شیخ عبدالنبی اور شیخ عبداللہ سلطان پوری نے شیخ مبارک کے خلاف دربار میں عرضداشت پیش کی کہ وہ بدعتی ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کر رہے ہیں۔ اسکے جواب میں اکبر نے معاملے کی تحقیق اور کارروائی کا ذمہ علماء پر چھوڑ دیا کہ شریعت کی روشنی میں اس امر کا فیصلہ کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت تک اکبر خود درباری علماء کے زیر اثر تھا۔ ادھر شیخ مبارک علماء کی سازشوں سے بچتے ہوئے اپنے بیٹوں کے ساتھ در در بھٹک رہے تھے لیکن آگرہ میں دوست و احباب بھی ان کو پناہ دینے سے کترا رہے تھے۔ انہی دنوں شیخ مبارک نے شیخ سلیم چشتی سے بھی مدد چاہی کہ وہ درِ بار شاہی میں ان کی سفارش کیجیے۔ لیکن شیخ چشتی نے بدلے میں چند روپے دے کر گجرات ہجرت کرنے کی صلاح دی۔ بالآخر مرزا عزیز کوکا کی سفارش اور طرفداری سے اکبر کا من بدلا اور علماء کی سازش اور کوششوں کو درکنار کرتے ہوئے بادشاہ نے اس مظلوم خاندان کو امان دی۔ ابوالفضل نے اپنے خاندان پر گزری ہوئی مصیبتوں اور تنگ نظر علماء کی سازشوں کو بغیر نام لیے بہت تفصیل سے آئین اکبری میں بیان کیا ہے۔

12.2.1 اکبر کے دربار میں رسائی (Access to Akbar's Court)

1574ء میں فیضی کے توسط سے ابوالفضل کو دربار میں رسائی ملی۔ حالانکہ وہ ذہنی طور پر دربار کی ملازمت کے لیے تیار نہیں تھا کیونکہ اس کا ذہن علم حقیقی کی تلاش میں گم تھا اور وہ ایک گوشہ نشین کی طرح زندگی گزارنا چاہتا تھا تاکہ وجود حقیقی کے اسرار سے واقف ہو سکے۔ لیکن شیخ مبارک اور

فیضی جو 1567ء سے اکبر کی ملازمت میں تھا، کے اصرار کرنے پر بالآخر ابوالفضل شاہی ملازمت اختیار کرنے پر راضی ہو گیا۔

1574ء میں ابوالفضل پہلی بار دربارِ اکبری میں حاضر ہوا اور اکبر کے حضور آیۃ الکرسی کی شرح پیش کی۔ اس طرح بقول ابوالفضل وہ بغیر کسی سفارش کے محض اپنی علمی قابلیت کی وجہ سے دربار میں حاضر ہوا اور کامیابی سے ہمکنار ہوا۔ اس شرح کے بارے میں ملا عبدالقادر بدایونی کا بیان ہے کہ وہ شیخ مبارک کی تحریر کردہ تھی جس کو ابوالفضل نے اپنے نام سے پیش کیا۔ ظاہر ہے یہ علمی حسد کی واضح مثال ہے کیونکہ عبدالقادر بدایونی کسی بھی حال میں ابوالفضل کو قرآن کے صحیح فہم اور اس کی تشریح کے لائق نہیں سمجھتا تھا۔ بہر حال ابوالفضل کی اکبر سے یہ ملاقات مختصر تھی کیوں کہ اکبر کو فوراً بنگال کی طرف کوچ کرنا پڑا۔ لیکن دوران سفر اکبر نے چند مواقع پر ابوالفضل کو یاد ضرور کیا۔ 1575ء میں اکبر کی فتح پور واپسی پر ابوالفضل دربار میں دوبارہ حاضر ہوا اور سورۃ الفَتح کی ایک شرح پیش کی۔ تعجب ہے کہ بدایونی نے اس شرح کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔

دربار میں ملازمت اختیار کرتے ہی ابوالفضل کو 20 کا منصب دیا گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کو 20 گھوڑ سوار اپنی تحویل میں تیار رکھنے تھے اور اسی مناسبت سے اس کی تنخواہ بھی طے تھی۔ ابوالفضل اپنی فراست، بادشاہ کے تئیں وفاداری اور دربار میں اپنی علمی و سیاسی خدمات کے عوض بتدریج ترقی کرتا رہا، یہاں تک کہ 1585ء میں 1000، 1592ء میں 2000، اور 1602ء میں 5000 کے منصب تک پہونچ گیا۔ گرچہ ابوالفضل رفتہ رفتہ اعلیٰ منصب پر پہنچ گیا، مگر ذہن میں رہے کہ ابوالفضل کی خدمات بالعموم ذاتی اور علمی نوعیت کی تھیں اور اس نے فوجی یا جنگی سطح پر کوئی خاص کارنامہ انجام نہیں دیا تھا۔ مثال کے طور پر 1585ء میں جب ابوالفضل کو 1000 کا منصب دیا گیا، اسی سال زین خان کوکا کی قیادت میں سُوات کی طرف فوجی مہم بھیجی گئی تھی۔ جب اس مہم کی مدد کے لیے مزید کمک بھیجنے کا ارادہ کیا گیا، تو ابوالفضل نے اکبر کے حضور اپنی خدمات پیش کیں۔ لیکن اکبر نے ابوالفضل کے بجائے راجہ بیربر کو مزید فوج دے کر روانہ کیا۔ شاید ابوالفضل کی فوجی قابلیت پر اکبر کو کم اعتماد تھا۔ تاہم اس سے انکار نہیں کہ بعض موقعوں پر ابوالفضل نے سیاسی اور سفارتی ذمہ داریاں بھی نبھائیں۔ 1586ء میں شاہ قلی مہرام کے ساتھ ابوالفضل کو دہلی کا گورنر مقرر کیا۔ 1599-1600ء میں بالخصوص دکن کی مہم پر ابوالفضل نے بہترین سیاسی سوجھ بوجھ اور فوجی و سفارتی صلاحیت کا مظاہرہ کیا اور اس طرح 1601ء میں قلعہ اسیر گڑھ پر قبضہ کرنے میں اہم کردار نبھایا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مغل ریاست کے فکری نمائندہ ہونے اور اکبر کے سیاسی و مذہبی افکار کے ترجمان ہونے کی وجہ سے ابوالفضل اکبر کی نظر میں بے مثال تھا اور ان کے درمیان ہمیشہ اچھے تعلقات قائم رہے۔ لیکن اکبر کے آخری عہد میں چند وقت کے لیے ان تعلقات میں کشیدگی بھی پیدا ہو گئی تھی۔ دراصل اس کشیدگی کی وجہ ابوالفضل اور شہزادہ سلیم (مستقبل کا جہانگیر) کے درمیان کشمکش تھی۔ اس کے علاوہ ابوالفضل پر یہ الزام بھی لگایا گیا کہ وہ دربار میں تو مذہبی وسعت اور وسیع المشربی کی بات کرتا ہے جبکہ اپنے گھر میں وہ قرآن کے نسخے تیار کرواتا ہے اور ان پر شرح لکھوا کر بیرونِ ملک بھجواتا ہے۔ اس طرح اکبر کی نظر میں ابوالفضل کی فکری دیانت داری پر سوال اٹھایا گیا تاکہ اکبر کے ذہن میں ابوالفضل کے تئیں شبہات پیدا ہوں۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں اس کشیدگی کا سبب اپنے دشمنوں کی سازشوں کو قرار دیا ہے۔ دوسرے مآخذ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ ذخیرۃ الخوانین کے مصنف شیخ فرید بھکری اور مآثرُ الاُمراء کے مصنف شاہ نواز خان کے مطابق ابوالفضل کو 2000 کا منصب دیے جانے کے بعد امراء یہاں تک کہ شہزادہ سلیم کے اندر بھی حسد پیدا ہو گئی۔ چنانچہ اس جذبہ کے تحت امراء اور سلیم نے اکبر کو راضی کر لیا کہ ابوالفضل کو دکن روانہ کر دیا جائے تاکہ دربار سے اس کا اثر و رسوخ کم ہو۔

انہی دنوں اکبر کے لیے سب سے بڑی مشکل سلیم کی بغاوت تھی۔ چنانچہ اکبر نے 1602ء میں ابوالفضل کو دکن سے واپس بلایا۔ حالانکہ اس وقت تک سلیم اور اکبر کے درمیان مصالحت ہو چکی تھی لیکن سلیم کو اس بات کا اندیشہ تھا کہ ابوالفضل کے دربار میں واپس آنے سے اس کے مفاد کو نقصان پہونچ سکتا ہے۔ یہ اندیشہ بعید از قیاس بھی نہیں تھا کیونکہ ایک طرف سلیم اور ابوالفضل کے رشتے اچھے نہیں تھے اور دوسری طرف اکبر کو ابو الفضل کی فہم و فراست اور مشوروں پر حد درجہ اعتماد تھا۔ چنانچہ سلیم نے اُورچھہ سردار بیر سنگھ دیو بندیلا کو اشارہ دیا کہ دکن سے واپسی پر وہ ابوالفضل کا قصہ تمام کر دے۔ اجین کے قریب بیر سنگھ بندیلا نے ابوالفضل کو گھیر لیا۔ جنگ میں ابوالفضل قتل ہوا اور اس کا سر قلم کر کے سلیم کے پاس بھیج دیا گیا۔ اس وفاداری کے صلہ میں جہانگیر نے بادشاہ بننے کے بعد بیر سنگھ بندیلا کو 3000 کا منصب عطا کیا۔ یہ واقعہ 1602ء میں پیش آیا۔

اکبر کے قائم کردہ عبادت خانہ میں ہونے والی بحثوں میں ابوالفضل کا انتہائی اہم رول رہا۔ عبادت خانہ کے قیام کا مقصد اسلام اور دوسرے مذاہب کی تعلیمات و عقائد پر غور و بحث کرنا تھا، تاکہ مذہب اور خدا کے صحیح اور حقیقی مفہوم کا علم ہو سکے۔ عبادت خانے کی مجلسوں میں ابو لفضل نے اپنی علمی قابلیت، ذہانت اور علوم نقلیہ و عقلیہ میں واقفیت کے سبب قدامت پسند علماء کے نظریات کی سختی سے تردید کی۔ اس طرح اس نے تنگ نظر علماء بالخصوص شیخ عبدالنبی اور عبداللہ سلطان پوری کے تعصب اور مذہبی خیانت کو بے نقاب کر دیا جس کے نتیجے میں ان کا اثر اور مذہبی رسوخ کم ہو گیا۔ چنانچہ اکبر بھی سیاسی معاملات میں ان علماء کی مداخلت سے چھٹکارہ پا گیا۔ اس سلسلہ میں بدایونی کا مشاہدہ بالکل درست ہے کہ "بادشاہ نے ابوالفضل کی خوب پذیرائی کی بالخصوص اس وجہ سے کہ ابوالفضل میں ایک ایسے لائق فرد کی امید تھی جو ملاؤں کو ایک سبق سکھا سکے۔"

ابوالفضل اور مذہبی علماء کے درمیان اس کشمکش کو، جو آخر کار کٹر مذہبی گروہ کے زوال پر ختم ہوئی، دو طرح سے دیکھنا چاہیے۔ اول تو یہ کہ اس کے والد شیخ مبارک کے خلاف درباری تنگ نظر علماء کی سازشوں کا ابوالفضل کے ذہن پر منفی اثر تھا۔ چنانچہ یہ ذاتی تجربہ اتنا تلخ تھا کہ اس کو متعصب علماء سے دیرینہ رنجش اور ناراضگی تھی۔ دوسرے یہ کہ ان محفلوں میں اس کی عقلیت پسندی اور مذہبی رواداری کو جلا ملی۔ مباحثہ کے دوران اس نے مذہب کی حقیقت اور روحانیت کو سمجھا۔ گویا اکبر کی سرپرستی میں دربار میں اس کو ایک ایسا سازگار ماحول ملا جس کی مدد سے وہ اپنی ذہنی بے چینی سے باہر نکل پایا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کشمکش صرف اور صرف ذاتی عناد اور رنجش کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ اس کے پس پردہ ابوالفضل کا یہ نظریہ تھا کہ مذہبی تنگ نظری روایت کی اندھی تقلید سے پیدا ہوتی ہے جس کے فریب میں آکر بندہ اندھا ہو جاتا ہے اور ان تمام کے خلاف نفرت اور دشمنی کا بگل بجا دیتا ہے جو اس سے نظریاتی یا مسلکی اختلاف رکھتے ہیں۔

12.2.2 تصنیفات (Writings)

ابوالفضل کی علمی، تاریخی اور ادبی صلاحیت بے مثال تھی۔ ابوالفضل نے دوران ملازمت اپنی شہرہ آفاق تاریخ "اکبر نامہ" کے علاوہ متعدد تصنیفات انجام دیں۔ مندرجہ ذیل سطور میں اس کی چند اہم تصانیف کا ذکر کیا جاتا ہے۔

- مکاتباتِ علامی یا انشائے ابوالفضل: اس کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصے میں وہ خطوط شامل ہیں جو ابوالفضل نے اکبر کی طرف سے مختلف حکمرانوں اور امراء کو لکھے تھے۔ دوسرا حصہ ان خطوط اور عرضداشتوں کا مجموعہ ہے جو ابوالفضل نے اکبر اور بعض دوسرے امراء کو لکھے تھے اور تیسرے حصہ میں انشاپَردازی سے متعلق ابوالفضل کے مشاہدات اور بعض مضامین شامل ہیں۔
- عیار دانش: یہ کَلیلہ و دمنہ کا وہ نسخہ ہے جو اکبر کے کہنے پر از سر نو مرتب کیا گیا۔ حالانکہ اس سے قبل کلیلہ و دمنہ کا فارسی میں ترجمہ ہو چکا تھا، لیکن

چونکہ وہ ترجمہ مشکل اور بوجھل تھا اس لیے آسان اور سلیس زبان میں اس کو مرتب کرنے کا حکم جاری کیا گیا۔

- مناجات ابوالفضل: انتہائی مشکل اور مصنوعی اسلوب میں لکھی گئی اس کتاب میں بنیادی طور پر خدا سے کی گئی مناجات شامل ہیں۔ لیکن اس ضمن میں خدا کے وجود اور اس کے عرفان کی بابت بعض اہم مضامین بھی زیر بحث آئے ہیں جن سے ابوالفضل کے مذہبی نظریات پر روشنی پڑتی ہے۔
- ابوالفضل نے "تاریخ الفی" کا مقدمہ بھی تحریر کیا ہے۔ تاریخ الفی ایک آفاقی تاریخ ہے جس میں اسلام کی تاریخ پیغمبر محمد کی بعثت سے اسلام کے ایک ہزار مکمل ہونے تک یعنی 1582ء تک کی تاریخ لکھی گئی۔ یہ کتاب اکبر کے حکم پر لکھی گئی جس کی ترتیب میں دربار کے اہل علم بشمول عبدالقادر بدایونی نے حصہ لیا تھا۔ حالانکہ ابوالفضل اس تاریخ کی تدوین میں بحیثیت مرتب شامل نہیں تھا لیکن اس کی تکمیل کے بعد اس نے اس پر ایک مقدمہ تحریر کیا تھا، جو بدقسمتی سے دستیاب تاریخ الفی کے مخطوطے میں موجود نہیں ہے۔
- اسی طرح اکبر کے حکم پر مہابھارت کا بھی ترجمہ کیا گیا تھا جو عبدالقادر بدایونی نے نقیب خان اور شیخ سلطان تھانیسری کے ساتھ مل کر مکمل کیا تھا۔ ابوالفضل نے اس ترجمہ پر بھی ایک مقدمہ تحریر کیا تھا۔
- ابوالفضل نے اکبر کے حکم پر ضیاء بخشی کی "طوطی نامہ" کی تلخیص کی تھی۔ یہ اخلاق کی ایک کتاب ہے جس میں ایک طوطے کے ذریعہ 52 کہانیاں بیان کی گئی ہیں جن کا بنیادی موضوع اخلاقی تعلیم دینا ہے۔

12.3 اکبر نامہ، ساخت اور موضوعات (Akbarnama: Structure and Contents)

ابوالفضل کا سب سے بے مثال علمی اور تاریخی کارنامہ اس کی تصنیف 'اکبر نامہ' ہے جو حقیقی معنوں میں دنیا کی عظیم ترین تاریخوں میں شمار ہوتی ہے۔ اکبر نامہ دراصل ایک تاریخی بیانیہ ہے جس میں آدم سے لے کر اکبر کے 46ویں سالِ جلوس تک کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ 1589ء میں بادشاہ اکبر نے ابوالفضل کو مغل سلطنت کی تاریخ لکھنے پر مامور کیا جس میں ابوالفضل کو سات سال لگے۔ مغل ریاست کی تاریخ کا خیال شاید اکبر کو پہلے سے ہی تھا۔ چنانچہ اس سے قبل اکبر نے 1587ء میں ایک فرمان صادر کر کے شاہی ملازمین، امراء اور شاہی خاندان کے افراد کو آمادہ کیا کہ وہ ریاست سے متعلق اپنی یادداشتیں قلم بند کریں تاکہ مغل سلطنت کے ابتدائی ایام بالخصوص بابر اور ہمایوں کے حالات مستند طور پر مرتب ہو سکیں۔ اس کے نتیجے میں چند تصنیفات سامنے آئیں جیسے جوہر آفتابچی نے، جو ہمایوں کا ہمسفر اور مشک بردار تھا، تذکرۃ الواقعات لکھی جو تاریخ ہمایوں اور تاریخ ہمایوں شاہی کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اسی طرح بایزید بیات نے، جو تبریز کا باشندہ تھا اور بعد میں ہمایوں کے عہد میں مغل فوج میں شامل ہو گیا تھا، "تاریخ ہمایوں و اکبر" اور گلبدن بانو بیگم نے، جو اکبر کی پھوپھی تھی، "ہمایوں نامہ" لکھی۔ دوسرے مآخذ کے ساتھ ساتھ ابوالفضل نے اکبر نامہ کی تصنیف میں ان کتابوں سے بھی مواد لیا۔

ابوالفضل کے مطابق دوران تصنیف، یعنی سات سالوں میں، اس نے اکبر نامہ کے پانچ مسودے تیار کیے۔ ہر بار کچھ کمی کے باعث مسودہ پر نظر ثانی کرتا اور اپنے ذوق کے مطابق اس کی تزئین و تحسین میں قوت صرف کرتا۔ یہ سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ پانچ بار نظر ثانی اور اصلاح کے بعد بھی وہ اپنی کوششوں سے مطمئن نہیں تھا۔ چنانچہ چھٹے مسودے پر کام کرنا چاہتا تھا کہ اکبر نے اس کو اس سے باز رکھا اور اس طرح ابوالفضل نے 1595-96ء میں مکمل مسودہ اکبر کے حضور میں پیش کر دیا۔ البتہ اس میں 1602ء تک اضافہ کرتا رہا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اکبر نامہ کا آخری اور مکمل مسودہ تیار ہونے سے پہلے، ابتدائی مسودات یا ان کے بعض حصے بشمول آئین اکبری دربار کے

امراءاور دانشوروں کو مطالعہ کے لیے دیے گیے تھے۔ نظام الدین احمد کی "طبقات اکبری" اور ملا عبدالقادر بدایونی کی "منتخب التواریخ" دونوں میں اکبر نامہ کے حوالے ملتے ہیں، جب کہ یہ دونوں تاریخیں اکبر نامہ کے مکمل ہونے سے پہلے ہی لکھی جا چکی تھیں۔ غالبا یہ ابوالفضل کا نہج تھا تاکہ واقعات کی تصدیق ہو سکے اور آخری مسودہ مکمل ہونے سے قبل جملہ کوتاہیوں کو دور کیا جا سکے۔

ابوالفضل کے منصوبے کے مطابق اکبر نامہ اور آئین اکبری ایک ہی کتاب کے دو حصے تھے۔ لیکن بعد کے مرتبین اور مترجمین نے اکبر نامہ کو الگ اور آئین اکبری کو علاحدہ کتاب کی حیثیت سے شائع کر دیا۔ ابوالفضل کے ذریعہ مرتب کردہ اکبر نامہ میں تین دفتر (حصہ یا جلد) تھے۔ پہلے دو دفتر میں تاریخی بیانیہ جبکہ تیسرا دفتر، جو آئین اکبری کے نام سے موسوم تھا، ریاست کے آئین اور انتظامی معاملات سے متعلق تھا۔ اکبر نامہ کے پہلے دفتر میں مغل خاندان کی تاریخی وراثت کا ذکر ہے جس میں اکبر کے رشتے چنگیز خان اور امیر تیمور سے جوڑے گئے ہیں۔ اس جلد کی شروعات آدم سے ہوتی ہے اور اکبر کے 17 ویں سال جلوس تک کے واقعات درج کیے گئے ہیں۔ (حالانکہ بعد کے مرتبین نے اس پہلے دفتر کو بھی دو جلدوں میں تقسیم کر دیا۔ پہلی جلد میں آدم سے بادشاہ ہمایوں تک کے حالات اور دوسری جلد میں اکبر کی تخت نشینی سے 17 ویں سالِ جلوس تک کے واقعات۔ اب یہی تقسیم رائج ہے)۔ دوسرے دفتر میں اکبر کے 46 سالِ جلوس یعنی 1602ء تک کے واقعات درج ہوئے ہیں، کیونکہ 1602ء میں ابوالفضل کے قتل ہو جانے سے یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ تیسرے دفتر یعنی آئین اکبری میں مغل سلطنت کے انتظامیہ پر اعداد و شمار کی روشنی میں تفصیلی معلومات فراہم کی گئی ہے۔ اس دفتر یعنی آئین اکبری کو بھی بعد کے مترجمین نے تین حصوں میں تقسیم کر دیا اور اب یہی اس کی مروجہ اور تسلیم شدہ شکل ہے۔

اکبر نامہ میں تاریخی بیانیہ (Historical Narrative) کی نوعیت دو طرح کی ہے۔

1. اکبر کے عہد سے پہلے کی تاریخ، جو پہلی جلد کا موضوع ہے، کا بیانیہ اس طرح ہے کہ گویا ہر حکمران کا دورِ حکومت ایک علاحدہ اکائی ہے۔ اس طرح ہر حکمراں کے دور کو علاحدہ علاحدہ بیان کرتے ہوئے، ان کے عہد میں پیش آنے والے تمام واقعات کو ایک ہی جگہ درج کیا گیا ہے، البتہ ترتیبِ واقعات خاص خیال رکھا گیا ہے۔
2. لیکن اکبر کے دور کی تاریخ، جو دوسری اور تیسری جلد کا موضوع ہے، کا بیانیہ "سالانہ" (Regnal) ہے۔ یعنی ہر سال میں پیش آنے والے تمام واقعات و حالات کو ایک جگہ لکھا گیا ہے۔ اس طرح اکبر کے دور کا تاریخی بیانیہ سال بہ سال آگے بڑھتا ہے جس میں ہر سال کو ایک علاحدہ اکائی کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ ہر ایک سال کے تمام واقعات کو اسی سال کے ضمن میں پیش کرنے کا نقصان یہ ہے کہ بیانیہ میں اکثر اوقات تسلسل اور ربط باقی نہیں رہ پاتا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی واقعہ ایک سے زائد سالوں پر پھیلا ہوا ہے، تو اس کو دوسرے سال کے ضمن میں بھی بیان کیا جائے گا۔ دوسری طرف ایک واقعہ کا ذکر کرتے کرتے درمیان سے دوسرا واقعہ شروع ہو جاتا ہے کیونکہ دونوں واقعات ایک ہی سال میں واقع ہوئے ہوتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اول تو بیانیہ میں تسلسل قائم نہیں رہ پاتا اور دوسرے واقعات میں تکرار بھی عام ہوتی ہے۔

آئین اکبری، جو اکبر نامہ کا آخری حصہ (دفتر) ہے اور جو تقریبا 1598ء تک لکھی جا چکی تھی، پانچ ابواب پر مشتمل ہے جن میں ریاست کی انتظامیہ اور آئین سے متعلق اہم معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ آئین اکبری کی حیثیت جدید دور کے Gazetteer کی ہے جس میں مغل ریاست کے مختلف محکمہ جات کی کارگزاریوں کی تفصیل بالخصوص ریاست کے مرکزی اور صوبائی انتظامی ڈھانچے کی بابت ایسی معلومات فراہم ہوئی ہیں کہ مغل ریاست کی ایک بہتر تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ آئین اکبری کا یقینا سب سے اہم کارنامہ وہ اعداد و شمار ہیں جو زراعت، پیداوار، تشخیص اور محصول کی

وصولیابی کے متعلق دیے گئے ہیں۔اس طرح ابوالفضل نے ٹھوس دلائل پیش کر کے مغل عہد کے معاشی اور اقتصادی نظام پر قدرے بہتر روشنی ڈالی ہے۔آئین اکبری کے پانچ ابواب اور ان کے مشمولات مندرجہ ذیل سطور میں مختصراً بیان کیے جاتے ہیں۔

1. پہلے باب میں شاہی مغل گھرانے سے متعلق معاملات کی تفصیلات ہیں۔ مثلاً شاہی خاندان سے وابستہ مختلف شعبہ جات، شاہی ٹکسال، فن خطاطی اور مصوری، شاہی توپیں، بندوقیں اور شاہی اصطبل کے ساتھ ساتھ تعمیراتی سامانوں کی قیمتوں اور مزدوروں کی تنخواہوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔
2. دوسرے باب میں فوجی ادارے کا بیان ہے۔اس میں فوج کی درجہ بندی اور تنخواہوں کے اصول وغیرہ کا ذکر ہے۔اس باب میں 200 سے 1000 کے منصب پر فائز منصب داروں کی ایک فہرست بھی دی گئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ صالح اور نیک افراد، اسکالرز، شعراء اور موسیقاروں کی بھی ایک فہرست شامل ہے۔اس باب میں زمینی عطیات کے ساتھ ساتھ تعلیم اور ازدواجی قوانین کا بھی ذکر ہے۔
3. یہ باب معاشی نظام اور زرعی تاریخ کے حوالے سے سب سے اہم ہے کیونکہ اس میں لگان کی شرح کا ٹیبل دیا گیا ہے۔اس کے علاوہ آئینِ دَہ سالہ کا ذکر ہے جس کی بنیاد پر ریاست کے مختلف صوبوں کے لیے مختص محصول کی شرح کا تعین کیا گیا ہے۔اس باب میں مغل ریاست کے 12 صوبوں (یہ تعداد بعد میں 15 ہو گئی تھی) کے احوال پر بھی تفصیل پیش کی گئی ہے۔یہ باب ریاست کے متعلق اعداد و شمار کا ایک ذخیرہ پیش کرتا ہے جسکی مدد سے ریاست کی معاشی اور زرعی تاریخ اور حالات کا صحیح صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔
4. اس باب میں بالخصوص ہندوؤں کے فلسفیانہ، مذہبی اور باطنی نظریات کا احاطہ کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ ہندوؤں کے سماجی اور ثقافتی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ "احوالِ ہندوستان" کے نام سے موسوم اس باب میں ہندوستانی قدیم علوم مثلاً علمِ نجوم اور جغرافیہ کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔یہ باب انتہائی اہم ہے کیونکہ البیرونی کے بعد شاید ابوالفضل ہی تنہا ایسا دانشور اور مصنف ہے جس نے ہندوؤں کے فلسفہ، علوم اور سماجی رسومات پر توجہ دی، مطالعہ کیا اور ان کو درج کیا ہے۔لیکن مورخ ہربنس مکھیا کی نظر میں یہ باب آئین اکبری کا سب سے کمزور باب بھی ہے اور اسکی دو وجوہات ہیں۔
   a. ابوالفضل نے ہندوؤں کے فلسفیانہ نظریات و مبادی کو دوسرے مآخذ سے محض مستعار لے کر بیان کر دیا ہے۔مثلاً ابوالفضل پر البیرونی کا رنگ غالب ہے۔اس کا نقصان یہ ہوا ہے کہ ہمیں عہد اکبری کے ہندو دانشوروں کے نقطہ نظر اور فکری منظر نامے کا علم نہیں ہو پایا۔
   b. ابوالفضل نے اپنے عہد کے ہندو سماج اور رسم و رواج کا ذکر کرنے کے بجائے ہندو سماج کی ایک کتابی اور رسمی (Narrative) تصویر پیش کی ہے۔البتہ اس میں صرف ایک استثناء ہے اور وہ یہ کہ وہ راجپوت قبائل کا ذکر کرتا ہے۔

اکبر نامہ اور آئین اکبری کی تصنیف میں ابوالفضل پر کن مآخذ کا اثر غالب ہے، اس کی تفصیل آئندہ صفحات میں آئے گی، لیکن یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ جیسا کہ مشہور مورخ محمد اطہر علی کا خیال ہے کہ گو ابوالفضل اور البیرونی میں ہندو عقائد، فلسفہ اور سماجی رسومات کے بیان کرنے کے حوالے سے گہری مماثلت پائی جاتی ہے لیکن ان میں بنیادی اختلافات بھی ہیں۔سب سے نمایاں فرق یہ ہے کہ البیرونی کے یہاں ہندو عقائد اور رسومات کے بیانیہ پر تنقید کا پہلو حاوی ہے۔جبکہ ابوالفضل ان عقائد و رسومات کی محض مختصر تصویر پیش کرتا ہے جس میں تنقید کا پہلو مسلکی اعتبار سے موجود نہیں ہے۔

5. آئین اکبری کے پانچویں باب میں بادشاہ اکبر کے فرمودات و ارشادات بیان ہوئے ہیں۔ساتھ ہی اس میں ابوالفضل نے اپنا مختصر سوانحی خاکہ بھی پیش کیا ہے جس سے ہمیں اس کے علمی سفر، نظریہ اور اس کے خاندان کے حالات معلوم ہوتے ہیں۔

12.4 اکبر نامہ کے مآخذ اور طرز تحریر (Sources and Akbarnama, and Style of Writing)

ابوالفضل صحیح معنوں میں وہ پہلا مورخ ہے جس نے تاریخی مآخذ کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے ان تمام واقعات و حالات کو قلم بند کیا جن کا تعلق مغل سلطنت بالخصوص اکبر سے تھا۔ حالانکہ ابوالفضل اپنی معلومات کے مآخذ کا ذکر بہت کم کرتا ہے لیکن مواد کے حصول اور تلاش و تحقیق سے متعلق اس نے بعض اہم تفصیلات کا ذکر کیا ہے جس سے اس کے طرزِ تاریخ نویسی پر روشنی پڑتی ہے۔ آئندہ سطروں میں ان مآخذ کا ذکر کیا جائے گا جو اکبر نامہ کی تصنیف پر اثر انداز ہوئے خواہ ابوالفضل نے ان کا ذکر کیا یا نہیں۔ ساتھ ہی مواد کے حصول میں اس کے طریقِ کار کا بھی جائزہ لیا جائے گا۔

1. ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اکبر نامہ کے ابتدائی حصے میں چنگیز خان اور تیموریوں کے آباؤاجداد کی بابت معلومات کے لیے ابوالفضل نے رشید الدین کی "جامع التاریخ" سے استفادہ کیا ہے۔ یہ تاریخ 1310ء میں ایران کے ایلخانی حکمرانوں کے لیے لکھی گئی تھی جس میں چنگیز خان اور اس کے قبیلہ کی تاریخ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ امیر تیمور اور اس کے پیشرؤں کی تاریخ کے لیے ابوالفضل نے شرف الدین علی یزدی کی "ظفر نامہ" سے مواد اخذ کیا ہے۔ 1425ء میں مکمل ہوئی یہ کتاب صدیوں تک تاریخ نویسی کے ایک عمدہ نمونہ کے طور پر پڑھی جاتی رہی اور اس نے ابوالفضل کی تحریر اور بیانیہ پر بھی بہت اثر ڈالا۔
2. ابوالفضل کے مواد کا ایک بڑا ذخیرہ اس طرح جما ہوا کہ پرانے درباری ملازمین و افسران اور شاہی ممبران کو یہ فرمان جاری ہوا کہ وہ اپنی یادداشت اور ابتدائی مغل ریاست کے بارے میں اپنے مشاہدات لکھ کر دربار بھیج دیں تاکہ ان کی تصدیق کے بعد ان کو تاریخی سند کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔ اس کے نتیجے میں چند اہم ذاتی اور تاریخی دستاویز سامنے آئے۔ جیسے بایزید بیات کی "تاریخِ ہمایوں و اکبر شاہی" جوہر آفتابچی کی "تذکرۃ الواقعات" اور گلبدن بانو بیگم کی "ہمایوں نامہ"۔ اس طرح عینی شاہدین کے بیان کردہ مشاہدات کو اہمیت و اولیت دی گئی۔
3. شاہی فرامین جو مختلف صوبوں کے افسران اور امراء کو ارسال کیے گئے تھے، ان کو اکٹھا کیا گیا اور ان سے مواد اخذ کیا گیا۔
4. 1575ء میں اکبر کے حکم سے ایک محکمہ قائم کیا گیا جس میں واقعہ نویسوں کے ذریعہ دربار سے متعلق رپورٹ، روداد اور کارگزاریاں تیار کی جاتی تھیں۔ ابوالفضل نے اس طرح کے تمام دستاویز کو اپنے مآخذ کے طور پر استعمال کیا۔
5. ریاست کے مختلف حصوں سے موصول ہونے والی درخواستیں اور عرضداشتیں بھی ابوالفضل کے لیے اہم مواد تھیں۔
6. ابوالفضل نے راجپوت مآخذ اور زبانی روایات سے بھی استفادہ کیا۔ اس کی جھلک ہمیں آئین اکبری میں دیکھنے کو ملتی ہے بالخصوص راجپوت قبائل اور ہندو سماجی اور تہذیبی اقدار کے ضمن میں۔ مورخ اطہر علی کا خیال ہے کہ آئین اکبری میں "احوالِ ہندوستان" کے باب میں ہندو عقائد، علوم اور رسومات کے حوالے سے جو مواد اکٹھا کیا گیا ہے، اس کا بڑا حصہ ان زبانی روایات پر مشتمل ہے جو ابوالفضل کو ہندو اور جین علماء سے حاصل ہوئیں۔ ظاہر ہے اکبر کے دربار میں یہ دانشور موجود تھے اور عبادت خانہ میں متعدد مذہبی امور پر بحث کے دوران اس باہمی تبادلہ خیال اور لین دین کے مواقع پیدا ہوئے ہوں گے۔ مزید یہ کہ اکبر اور ابوالفضل دونوں کو ہندو فلسفہ اور مذہب میں دلچسپی تھی۔ چنانچہ اکبر کے عہد میں متعدد سنسکرت مذہبی اور اخلاقی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ اطہر علی کا ماننا ہے کہ ابوالفضل نے ان تراجم سے بھی قدرے فائدہ اٹھایا ہوگا۔
7. ابوالفضل کے لیے سب سے اہم مآخذ خود بادشاہ کی ذات تھی۔ ابوالفضل نے ایسی تمام تفصیلات جن کی بابت متضاد یا متفرق شہادتیں مہیا ہوئی تھیں، اکبر کے حضور پیش کیں اور خود بادشاہ سے حقیقت حال کی تصدیق چاہی۔ اس طرح اکبر نے ان پر نظر ثانی کی اور بعض مقامات پر تحقیق و تصحیح بھی کی۔ یہی وجہ ہے کہ جدید مورخین کا خیال ہے کہ اکبر نامہ اور آئین اکبری میں جو تصورات اور نظریات ذکر ہوئے ہیں وہ دراصل اکبر کے ذہنی

مزاج اور فکری کیفیت کا بیان ہیں۔ صرف فرق یہ ہے کہ وہ ابوالفضل کے قلم سے ادا ہوئے ہیں۔ بادشاہ کے علاوہ ابوالفضل خود اپنی شہادتوں اور اپنے والد شیخ مبارک کے مشاہدات کو بھی بطور مآخذ استعمال کرتا ہے۔

مندرجہ بالا تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوالفضل نے اکبر نامہ کی تصنیف میں واقعات کو جمع کرنے اور حقیقت کی ترجمانی کے لیے مختلف نوعیت کے مآخذ کا استعمال کیا تاکہ اکبر کے دور کی تاریخ اپنی مکمل شکل میں مرتب کی جاسکے۔ لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا ابوالفضل نے بہت کم اپنے مآخذ کا نام لے کر ان کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ آئین اکبری کی مترجم جیرٹ نے ابوالفضل پر تنقید کی ہے کہ "وہ پیرا گراف کے پیرا گراف دوسرے مآخذ سے ادھار لیتا ہے (بلکہ چوری کرتا ہے) لیکن ان کا نام تک نہیں لیتا۔ شاید اس کو کوئی ڈر نہیں یا پھر اسے سرقہ کے الزام سے بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔" ہربنس مکھیا نے اس پہلو پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آئین اکبری میں ہندو نظامِ انصاف کے متعلق بحث "منواسمرتی" سے ماخوذ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اسی طرح بابر کے حالات بالخصوص کابل سرکار کی تفصیلات بابر نامہ سے لی گئی ہیں۔ ممکن ہے ابوالفضل نے "تزک بابری" کا فارسی ترجمہ استعمال کیا ہو جو 1589ء میں عبدالرحیم خان خاناں کے ذریعہ کیا گیا تھا۔ اس کا قوی امکان ہے کیوں کہ، تھیکسٹن (Thackston) کے مطابق ترکی زبان میں ابوالفضل کی اہلیت کے پختہ ثبوت نہیں ملتے۔ دوسری طرف بعض ایسے واقعات ہیں جو بعینہ بایزید بیات کی 'تاریخ ہمایوں و اکبر شاہی' اور جوہر آفتابچی کی 'تذکرۃ الواقعات' سے ماخوذ ہیں۔

اکبر نامہ کے مآخذ کے سلسلے میں یہ بات خاص قابلِ توجہ ہے کہ بعض مقامات پر ابوالفضل اپنے مآخذ سے مواد اخذ کرتے وقت اس کے بیانیہ میں اس طرح تبدیلی کر دیتا ہے جس سے اس کے مفہوم، نوعیت اور اثر انگیزی میں نمایاں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ رجحان ملا عبدالقادر بدایونی کے یہاں زیادہ حاوی ہے جیسا کہ اگلے باب میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی سب سے عمدہ مثال "محضر" کا دستاویز ہے۔ "محضر" کا ذکر تو اکبر نامہ میں ملتا ہے لیکن مکمل دستاویز کی صورت میں نہیں جیسا کہ عبدالقادر بدایونی اور نظام الدین احمد نے کیا ہے۔ البتہ ابوالفضل نے اپنی زبان میں مختصراً "محضر" کا خلاصہ اور لب لباب بیان کیا ہے۔ لیکن اس عمل میں ابوالفضل نے معانی اور نتائج میں قابل قدر تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ مثال کے طور پر دراصل "محضر" دستاویز میں اکبر کو بحیثیت مجتہد یہ حق دیا گیا ہے کہ اگر کسی مسئلہ میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہو، تو اکبر اپنے فہم سے ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کر سکتا ہے، یا کوئی نئی رائے قائم کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ قرآنی نص کے خلاف نہ ہو۔ لیکن ابوالفضل نے "محضر" کی ترجمانی اس طرح کی کے اکبر کو تمام مذاہب اور مسالک کے درمیان جج کی حیثیت حاصل ہے، نہ کہ صرف مسلم مسائل میں۔ مورخ اقتدار عالم خان نے ابوالفضل کے اس عمل کی توجیہ یہ بیان کی ہے کہ جس وقت ابوالفضل اکبر نامہ لکھ رہا تھا، اس وقت تک اکبر کا تصور بادشاہت دھیرے دھیرے اسلامی مسلکی اور فقہی پابندیوں سے آزاد ہو چکا تھا۔ اکبر اب تمام قوموں پر آفاقی حکمرانی کا دعویدار تھا جس میں ہندو بھی شامل تھے۔ لہذا ابوالفضل نے "محضر" کے اوّلین مباحث میں تصرف سے کام لے کر معنیٰ خیز تبدیلی پیدا کر دی۔ اس طرح کی اور بھی مثالیں موجود ہیں۔

بہر حال اس امر میں کوئی شک نہیں کہ ان کمیوں کے باوجود ابوالفضل نے مآخذ کے تئیں تنقیدی رویہ اپنایا۔ اس نے صرف ایک ماخذ پر انحصار کرنے کے بجائے ہر واقعے سے متعلق تمام مآخذ یکجا کیے، ان کی تحقیق کی اور ان کا موازنہ کرنے کے بعد اکبر نامہ میں شامل کیا۔ اس کا طریقِ کار یہ تھا کہ اس نے چند سوالات اور معیارات وضع کر رکھے تھے اور مآخذ کو ان معیارات پر پرکھ کر حقائق کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کرتا تھا۔ ان سب پر مزید یہ کہ اکبر کے تصور بادشاہت اور مغل ریاست کے عمومی نظریہ سے منحرف کوئی بھی معلومات قابلِ اعتبار نہیں سمجھی جاتی تھی۔

12.5 ابوالفضل، علم تاریخ وتاریخ نویسی (Abul Fazl: History and Historiography)

ابوالفضل نے علمِ تاریخ کی اہمیت وافادیت پر اکبر نامہ کی دوسری جلد میں گفتگو کی ہے۔ علمِ تاریخ کے حوالے سے ابوالفضل کے خیالات میں بتدریج تبدیلی ہوتی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں ابوالفضل کی نظر میں علمِ تاریخ کی کوئی خاص وقعت نہیں تھی بلکہ وہ محض ایک افسانہ تھا جس کا مطالعہ وقت کا زیاں تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کے خیال میں تبدیلی ہوئی اور بالآخر اس کو یقین ہو گیا کہ "انسان کے تجربات اور مشاہدات جو تاریخ کی کتابوں میں درج ہیں، عقل و دانش اور علم و آگہی کا ایک مفید ذخیرہ ہیں" کیونکہ ان کے اندر علماء و دانشوروں اور فلسفیوں کے قیمتی علوم محفوظ ہیں۔ چنانچہ ابوالفضل اس نتیجہ پر پہونچا کہ اپنی تمام کمیوں کے باوجود علم تاریخ کا سیکھنا اور اس کا مطالعہ از حد ضروری ہے۔ اس کے علاوہ علمِ تاریخ کے افادی پہلو پر بھی ابوالفضل کی نظر تھی۔ اس کے نزدیک علمِ تاریخ انسان کو رنج و غم سے ابھرنے کا حوصلہ بھی دیتا ہے۔ ابوالفضل علمِ تاریخ کی مثال ایک دواخانہ سے دیتا ہے جہاں لوگوں کو ان کے رنج کا مداوا اور غم کا علاج ملتا ہے۔ اس طرح علمِ تاریخ غمزدہ کے لیے بہترین مرہم ہے۔

علم تاریخ کی اہمیت سے قطع نظر، ابوالفضل کو ماضی میں لکھی گئی تاریخ کی کتابوں سے شدید شکایت تھی اور ان کی متعدد کمیوں کی اس نے نشاندہی بھی کی۔ اس کا خیال تھا کہ قدیم مورخین خود غرض تھے جنہوں نے اپنے مقصد کی خاطر اور اپنے ذاتی مفادات کے پیش نظر غلط بیانیوں سے کام لیا تھا اور ساتھ ہی جھوٹ و سچ کو خلط ملط کر دیا تھا۔ دوسری طرف دیانت دار اور حقیقت پسند مورخین ایسے سادہ لوح تھے کہ ان کی تاریخیں احمقانہ حد تک سادہ اور بے مزہ تھیں۔ ابوالفضل کے اس رجحان کی ایک عمدہ مثال ملا عبدالقادر بدایونی نے اپنی منتخب التواریخ میں پیش کی ہے۔ بدایونی لکھتا ہے کہ ابو الفضل نے ایک مرتبہ اس سے شکایت کی کہ تاریخوں اور تذکروں میں گزشتہ انبیاء کا تذکرہ نہیں ہے۔ بدایونی کے جواب سے غیر مطمئن ہو کر ابوالفضل نے مزید سوال پوچھا کہ آخر اسلامی تاریخوں اور تذکروں میں اہلِ بیت کا ذکر کیوں نہیں ہے۔ ان سوالات سے دراصل ابوالفضل اپنے اس نظریہ کا اظہار کر رہا تھا کہ اب تک کی اسلامی تاریخ تعصبات اور جانبدارانہ رنجش کا شکار ہے۔ چنانچہ علمِ حقیقی کا عرفان نہیں بلکہ گمراہی کا سبب ہے۔

قدیم مورخین کے طریقہ تحقیق پر تبصرہ کرتے ہوئے ابوالفضل نے تنقید کی کہ ان میں ناقدانہ نظر کی کمی ہے جس کے سبب نہ تو وہ مآخذ کی صحیح چھان بین کر پاتے اور نہ ہی غلط و صحیح کے درمیان امتیاز۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بے شمار لوگ ماضی کے حالات کے تئیں گمراہ ہو گئے۔ ابوالفضل کے اعتراضات و اِشکالات دراصل فارسی تاریخ نویسی کی اس روایت پر ہیں جو 13 ویں صدی کے ہندوستان میں فروغ پا رہی تھی۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ ابوالفضل کی باریک نظر نے ان تاریخوں کے بیانیہ اور طرزِ تاریخ نویسی میں چھپی ہوئی کمزوریوں کو صحیح معنی میں پہچانا ہے۔

علم تاریخ کی مادی اور افادی معنویت کے ساتھ ساتھ ابوالفضل کی نظر میں تاریخ عرفانِ الٰہی تک رَسائی کا بھی ایک ذریعہ و وسیلہ تھا۔ چونکہ عرفان الٰہی اور علم حقیقی کے لیے عقل وادراک کا استعمال ضروری ہے اور عقل وادراک دوسروں کے مشاہدے اور تجربے سے مزید پختہ ہوتا ہے، اس طرح علمِ تاریخ بھی علمِ حقیقی کے حصول میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ ابوالفضل نے فارسی تاریخ نویسی میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کر کے اس کو نئی جہت دی۔ درج ذیل میں چند ایسی بنیادی صفات کا ذکر کیا جاتا ہے جو ابوالفضل کی تاریخ نویسی میں مرکزی حیثیت رکھتی ہیں۔ ابوالفضل نے تاریخ نویسی کا دائرہ کار بہت وسیع کر دیا۔ بلاشبہ اکبر نامہ کی تصنیف کا ایک اہم مقصد اکبر کے عہد کی مکمل اور واقعی تصویر پیش کرنا تھا۔ ابوالفضل نے یہ کارنامہ دو طرح سے انجام دیا۔ اول اس نے اکبری عہد کے تمام اہم واقعات و حالات کو بالترتیب بیان کیا جو کہ اکبر نامہ کی پہلی دو جلدوں میں درج ہیں۔ دوسرے ابوالفضل نے اعداد و شمار اور آرکائیول معلومات کی بنیاد پر مغل ریاست کی ایک منظم اور مُنضبط تصویر پیش کی جیسا کہ آئین اکبری میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس طرح ابوالفضل نے

نہ صرف یہ کہ 16 ویں صدی کے ہندوستان کے سیاسی، جنگی اور درباری قصے بیان کیے ہیں بلکہ مغل سلطنت کی معاشی اور ثقافتی زندگی سے متعلق حقائق کا بھی ایک اہم ذخیرہ فراہم کیا ہے اور ساتھ ساتھ مختلف صوبوں کے انتظامی معاملات، محصول کے اعداد و شمار، قانونی لائحہ عمل یہاں تک کہ جغرافیائی اور ماحولیاتی معلومات بھی مہیا کی ہیں۔ چنانچہ ابوالفضل نے تاریخ نویسی کو دربار اور اس کے عوامل کے محدود دائرے سے نکال کر ایک ہمہ گیر کردار عطا کر دیا جس سے سماج کی مکمل تصویر ابھر کر سامنے آ سکے۔

مورخ خلیق احمد نظامی کا خیال ہے کہ ابوالفضل کی تاریخ نویسی میں یہ وسعت عربی تاریخ نویسی کی رہینِ منت ہے۔ یعنی مضامین اور مباحث میں تنوع اور وسعت کے نقطۂ نظر سے ابوالفضل پر عربی تاریخ نویسی کی روایت کا اثر نمایاں معلوم ہوتا ہے۔ گویا ممکن ہے کہ ابوالفضل نے فارسی تاریخ نویسی کو دربار کی محدود چہار دیواری سے باہر نکال کر ریاست و مملکت کے معاملات کو اس کے تمام تر وسعت کے ساتھ بیان کرنے کا اثر عربی تاریخ نویسی سے ہی قبول کیا ہو۔ البتہ مضامین میں وسعت کے حوالے سے یہ بات ذہن میں رہے کہ یہ وسعت دراصل نفسِ مضمون یا نقطۂ نظر کی وسعت نہیں ہے۔ یعنی ابوالفضل نے دربار کے علاوہ دوسرے سماجی، معاشی اور ثقافتی پہلوؤں کو اس لیے بیانیہ کا حصہ بنایا ہے کیوں کہ اس سے اکبر کے اقتدار اور شاہانہ عظمت کی تصویر مزید بارونق ہو جاتی ہے۔ گویا یہ تمام تفصیلات محض ایک پس منظر ہے تاکہ اکبر کے تسلط اور اس کی عظمت کی جلوہ نمائی ہو سکے۔ بہر حال یہ تمام اعتراضات اپنی جگہ درست، لیکن اس میں شک کی گنجائش نہیں کہ ابوالفضل نے پہلی بار فارسی تاریخ نویسی میں سولہویں صدی کے ہندوستان کی ایک مکمل اور واقعی داستان بیان کی جس میں انتہائی توجہ اور دِقّتِ نظر سے تمام اعداد و شمار کو پیش کیا گیا۔

ابوالفضل نے تاریخ نویسی میں عقلیت پسندی اور غیر مذہبی رجحان کو ترجیح دی۔ ابوالفضل نے مغل ریاست کو ایک شاہانہ ریاست کے طور پر پیش کیا جس کا اولین مقصد ایک مضبوط، پائیدار اور مستحکم اقتدار کا قیام تھا۔ ابوالفضل نے اکبر نامہ اور آئین اکبری میں مغل ریاست کا جو تصور پیش کیا ہے وہ ایک ایسی ریاست ہے جو کثیر مذہبی اور کثیر ثقافتی ہے۔ یعنی ایک ایسی ریاست جس کے قیام و استحکام میں بلا تفریقِ مذہب و ملت ہر فرد شامل ہو سکتا تھا۔ یہ ریاست مذہبی و مسلکی بنیادوں پر قائم کوئی فرقہ وارانہ ریاست نہیں تھی۔ بظاہر یہ نظریہ بہت خاص نہیں لگتا لیکن یہ بات ذہن میں رہے کہ عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان میں ابوالفضل سے قبل کی فارسی تاریخوں میں تاریخی بیانیہ مذہبی نقطۂ نظر اور مسلکی پیرایہ بیان میں تشکیل دیا گیا تھا۔ ابوالفضل نے پہلی بار کسی بھی طرح کے مذہبی اور مسلکی مبادیات سے ہٹ کر عقلی بنیادوں پر اور غیر مذہبی اسلوب میں مغل ریاست کی تاریخ قلم بند کرنے کی رَوِش کا آغاز کیا۔

ابوالفضل کی نظر میں ہندوستانی تاریخ مغل دور میں اسلامی تاریخ کا تسلسل نہیں تھی اور نہ ہی یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی مذہبی جدوجہد کا دور تھا۔ چنانچہ اکبر نامہ میں ریاست کی افواج کے لیے "مجاہدانِ اسلام یا غازیانِ اسلام" کے بجائے "مجاہدانِ اقبال اور غازیانِ دولت" کی اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں۔ کیونکہ اس کے نزدیک یہ جدوجہد مغل ریاست، جو استقلال اور پائیداری کی ضمانت تھی اور وہ تمام قوتیں جو پائیدار ریاست یعنی مغل ریاست کے وجود کے خلاف تھیں، کے درمیان تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس تصورِ ریاست میں راجپوت امراء اور سرداروں کے مذہبی اور سیاسی اختیارات کا پاس رکھا گیا تھا۔

ابوالفضل کی تاریخ نویسی کا شاید سب سے اہم پہلو، جو اکبر نامہ کی تصنیف کا بھی اولین مقصد اور بنیادی محرک تھا، یہ ہے کہ اس کی نظر میں مغل ریاست کی عظمت، شوکت اور استحکام کا منبع و مصدر صرف اور صرف اکبر ہے۔ یعنی مغل ریاست اکبر کی سرپرستی اور قیادت میں انسانی تاریخ کا

انتہائے کمال ہے اور اس بلندی کا سرچشمہ اکبر کی ذات ہے۔ گویا اکبر کے ذاتی اور صفاتی کمالات نے 16 ویں صدی کی مغل ریاست اور ہندوستانی سماج و تہذیب کو کمال کی سطح تک پہونچایا جو اس کے بغیر ممکن ہی نہیں تھا۔

تاریخی مضامین میں وسعت اور طریقِ کار میں جِدَّت کے ساتھ ساتھ ابوالفضل کی تاریخ نویسی میں بعض کمیاں بھی ہیں جن کی نشاندہی ضروری ہے۔ ابوالفضل کے تاریخی بیانیہ میں اکبر ایک نیم اُلوہی بادشاہ ہے جس سے وفاداری بذات خود ایک نیکی ہے اور جس کے خلاف بغاوت کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ ابوالفضل نے واقعات کو اس طرح بیان کیا ہے جس سے ان مفروضات کی تائید ہوتی ہے۔ اس کے یہاں صرف ان سیاسی واقعات و حالات کا ذکر ہے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ اکبر سے متعلق ہیں کیونکہ تاریخی بیانیہ کا مرکز اکبر کی ذات ہے۔ باقی واقعات و تفصیلات صرف ضمنی ہیں جو اکبر کے کمالات کو مزید اجاگر کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض موقعوں پر ابوالفضل ایسے واقعات کا ذکر نہیں کرتا یا تفصیل نہیں دیتا جس سے اکبر کی ذہانت اور سیاسی وروحانی فراسَت پر حرف آئے۔ مثال کے طور پر اکبر نامہ میں "کروڑی تجربہ" کے بارے میں زیادہ تفصیلات نہیں ہیں۔ چونکہ یہ تجربہ ناکام ہو گیا تھا اور کروڑیوں کی زیادتی کے سبب زرعی پیداوار کو نقصان ہوا اور کسانوں کے حالات خراب ہو گئے، لہذا اس پالیسی کی ناکامی کو تاریخی بیانیہ سے حذف کر دیا گیا۔ جبکہ اس کی تفصیلات عبدالقادر بدایونی اور ملا نظام الدین احمد کی تاریخوں میں موجود ہیں۔

حالانکہ فرداً فرداً واقعات کی تفتیش میں ابوالفضل کا طریقِ کار قابل تعریف ہے، لیکن ماضی کے تاریخی بیانیہ کے حوالے سے اس کا رویہ معروضی (Objective) نہیں بلکہ انتہائی جانبدارانہ (Subjective) اور تاثراتی ہے۔ وہ حالات، افراد اور واقعات پر اپنی رائے دیتا ہے جو اس کے تجزیہ سے پیدا ہوتی ہیں اور بسا اوقات سبق آموزی کے جذبہ سے پیدا ہوتی ہے، نہ کہ اس میں یقینی طور پر معروضیت پائی جاتی ہے۔ عام حالات میں ابوالفضل عقل و ادراک کی خوب وکالت کرتا ہے اور روایت پسندوں و مقلدین پر طنز بھی کستا ہے۔ لیکن اکبر کی صفات، روحانی قوت اور مافوق الفطرت کمالات کا ذکر کرتے وقت وہ اپنے ہی درس کو بھول جاتا ہے۔ چنانچہ اکبر کے ساتھ ایسی صفات و خصوصیات منسوب کرتا ہے جسے عقل قبول نہیں کر سکتی۔

ابوالفضل کی تحریر اور طرز نگارش انتہائی مشکل، غامض اور بعض اوقات ناقابلِ فہم حد تک پیچیدہ ہے۔ ابوالفضل کے ایک دوست نے اعتراض جتاتے ہوئے اس سے پوچھا کہ "تمہیں اتنی زحمت اٹھانے کی کیا ضرورت ہے اور کیوں اس (مشکل) اسلوب میں لکھتے ہو۔ ہزاروں میں کوئی ایک ہو گا جو اس شاہکار تصنیف کو صحیح صحیح پڑھ سکے گا اور اس کے نئے جادوئی طرزِ اُسلوب کو سمجھ پائے گا؟ تم کو کس سے امید ہے کہ وہ حق کو بھرپور پہچانے گا؟ ابوالفضل نے دوست کے اعتراض کا یہ کہہ کر جواب دیا کہ "مجھے عوام سے کیا غرض۔" اس طرح اس نے عام فہم اسلوبِ تحریر اپنانے کے بجائے ایسا طرزِ بیان اختیار کیا جس سے اس کے علمی ذَوق کی تسکین ہوتی تھی۔ ابوالفضل کا پُر تَصَنُّع بیانیہ، عہد وسطیٰ کی تاریخی روایت کے برعکس، وسط ایشیا اور ایران کے تاریخی نمونوں جیسے شرف الدین علی یزدی اور میر خواند وغیرہ سے زیادہ مانوس نظر آتا ہے۔ ایسا نہیں کہ صرف اس کا اسلوب پیچیدہ ہے، بلکہ وہ نئے نئے الفاظ کا استعمال کرتا ہے اور کبھی کبھی پرانے الفاظ کو نئے معنی میں استعمال کرتا ہے جس سے تفہیم میں مشکل ہوتی ہے۔ کیا یہ نتیجہ بعید از امکان ہے کہ ابوالفضل کی نظر میں اکبر کا اقتدار جس اقبال و بلندی کا متقاضی تھا، وہ صرف ایک رنگین، بوجھل اور شاندار اسلوب میں ہی ادا ہو سکتا تھا۔ گویا ایک عام فہم اسلوبِ بیان اکبر کے پیچیدہ افکار اور ہمہ جہت مزاج کا متحمل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ تعجب یہ ہے کہ اکبر نے، جس نے قدیم اور مشکل فارسی سے آسان فارسی میں کتابوں کے ترجمے کروائے، ابوالفضل کے اسلوب پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔

12.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

ابوالفضل عہد وسطیٰ کے ہندوستان کا یقیناسب سے اہم مورخ ہے جس نے اکبر نامہ جیسی شاہکار تصنیف لکھی۔ وہ اکبر کے سیاسی و مذہبی خیالات کا ترجمان اور مغل ریاست کی نظریاتی اساس کا نمائندہ تھا۔ 27 سال اکبر کے دربار میں ابوالفضل نے مختلف سطح پر مغل ریاست کے لیے خدمات انجام دیں۔ خاص طور پر عبادت خانہ میں اس نے روایتی اور تنگ نظر علماء کے متعصبانہ مذہبی تصورات پر سخت حملہ کیا اور اس طرح اکبر کو ان کے اثر سے آزاد کرانے اور بادشاہ کے ذہن میں مذہب کے آفاقی حقائق کو مستحکم کرنے میں اہم رول نبھایا۔ ابوالفضل کا سب سے اہم کارنامہ "اکبر نامہ" کی تصنیف ہے جو اکبر کے عہد کی ایک جامع تاریخ ہے۔ اکبر نامہ میں جہاں ایک طرف اکبر کے عہد کے سیاسی و فوجی واقعات کا تفصیلی ذکر ہے، وہیں دوسری طرف آئین اکبری میں ، جو اکبر نامہ کا آخری حصہ ہے، عہد وسطیٰ کی تاریخ میں پہلی بار ریاست کے انتظامی معاملات کو اعداد و شمار کی مدد سے بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح ابوالفضل نے مغل ریاست کی صرف سیاسی تاریخ ہی نہیں بلکہ معاشی، سماجی اور زرعی تاریخ بھی رقم کر دی ہے جس کی وجہ سے جدید مورخین کے لیے مغل ریاست کی مکمل تاریخ لکھنا ممکن ہو سکا۔

عہد وسطیٰ کی دوسری تاریخوں کے برعکس ابوالفضل نے مغل عہد کی تاریخ کو عقلی، غیر مذہبی اور غیر مسلکی نقطۂ نظر سے لکھا۔ اس کی تاریخ کا مرکزی کردار اسلام نہیں بلکہ اکبر ہے، مذہب نہیں بلکہ ریاست ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اکبر نامہ میں اکبر کو تاریخی تسلسل کی معراج اور تاریخی کمالات کا منبع و مصدر بنا کر پیش کیا گیا ہے اور یہی غالباً اس کی سب سے بڑی کمزوری بھی ہے لیکن اس کمی کے باوجود اکبر نامہ اور آئین اکبری تاریخی سرمایہ میں ایک بے مثال اضافہ ہے جس کی مثال دوسری تہذیبوں میں کم ہی ملتی ہے۔

12.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

محضر : وہ دستاویز جس میں اکبر بادشاہ کو بطور مجتہد تسلیم کیا گیا اور جس کے ذریعہ اکبر کو دینی اور دنیوی دونوں معاملات میں فیصلہ کن اختیارات دیے گئے۔ اس دستاویز پر دربار کے علماء کے بھی دستخط تھے۔

عبادت خانہ : 1575ء میں تعمیر کی گئی وہ عمارت جس میں مختلف مذاہب کے علماء اور دانشور جمع ہو کر مذہبی، فقہی اور علمی مسائل پر مباحثہ کرتے تھے۔ یہ عمارت اکبر کے حکم سے تعمیر کی گئی۔

تاریخ الفی : اکبر کے حکم سے مرتب کی گئی تاریخ جس میں اسلام کی ایک ہزار سال کی تاریخ رقم کی گئی ہے۔

تزک بابری : بابر کی سوانح جس کا ترکی سے فارسی میں ترجمہ عبدالرحیم خان خانان نے کیا۔

عقلیت پسندی : وہ نظریہ ہے جس کی رو سے دینی و دنیوی مسائل میں عقل کی برتری کو تسلیم کیا جاتا ہے۔

12.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

12.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. اکبر کے دربار میں ابوالفضل کو سب سے پہلے کتنے کا منصب عطا کیا گیا۔
2. ابوالفضل کا قتل کب اور کس کے ہاتھوں ہوا۔
3. اکبر نامہ کے علاوہ ابوالفضل کی دو کتابوں کا نام بتایئے۔
4. ابوالفضل نے اکبر نامہ کے کتنے مسودے تیار کیے اور مکمل مسودہ اکبر کے حضور کب پیش کیا گیا۔
5. ہندوؤں کے فلسفیانہ، مذہبی اور باطنی نظریات کا احاطہ اکبر نامہ کے کس حصے میں کیا گیا ہے۔
6. ان چند مآخذ کے نام بتائیں جن سے ابوالفضل نے استفادہ کیا۔
7. آئین اکبری میں کن امور کا ذکر کیا گیا ہے۔
8. اکبر نامہ کی پہلی جلد میں کس عہد کی تاریخ لکھی گئی ہے۔
9. مغل ریاست کی زرعی تاریخ لکھنے کے لیے ابوالفضل کی کس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔
10. مغل دربار میں ابوالفضل کی رسائی کس کے توسط سے ہوئی۔

12.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. ابوالفضل کی تعلیم اور ابتدائی حالات پر نوٹ لکھیے۔
2. وہ کیا سیاسی اور مذہبی حالات تھے جن کا ابوالفضل کے ذہن پر بہت اثر پڑا وضاحت کیجیے۔
3. آئین اکبری پر ایک مضمون لکھیے۔
4. اکبر کے دربار میں ابوالفضل کے کردار اور خدمات پر روشنی ڈالیے۔
5. علم تاریخ کے حوالے سے ابوالفضل کے نظریہ پر مضمون لکھیے۔

12.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. اکبر نامہ کے مآخذ کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔
2. ابوالفضل کی تاریخ نویسی کے بنیادی تصورات کا تنقیدی تجزیہ کیجیے۔
3. اکبر نامہ کے بنیادی ڈھانچے اور مضامین پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔

12.9 مزید مطالعہ کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. Ali, M. Athar, 'Sulh-i Kul and Religious Ideas of Akbar', in *idem, Mughal India*: *Studies in Polity, Ideas, Society and Culture*, Oxford University Press, New Delhi, 2006.
2. _____, 'Translations of Sanskrit Works at Akbar's Court', *Social Scientist*, Vol. 20, No. 9/10, 1992.
3. Habib, Irfan, 'Two Indian Theorists of the State: Barani and Abul Fazl', in *Mind over Matters: Essays on Mentalities in Medieval India*, eds., D.N. Jha and Eugenia Vanina, Tulika, New Delhi, 2009.
4. Haider, Najaf, 'Translating Texts and Straddling Worlds: Intellectual Communication in Mughal India', in *The Varied Facets of History*: *Essays in Honour of Aniruddha Ray*, eds., Ishrat Alam and Syed Ejaz Hussain, Primus, Delhi, 2011.
5. Hasan, Nurul, 'The Mahzar of Akbar's Reign', in *Religion, State and Society in Medieval India: Collected Works of S. Nurul Hasan*, ed. Satish Chnadra, OUP, New Delhi, 2005.
6. Khan, Iqtidar Alam, 'Akbar's Personality Traits and World Outlook: A Critical Reappraisal', *Social Scientist*, Vol. 20, No. 9/10, 1992.
7. Nizami, K.A., *On History and Historians of Medieval India*, Mushiram Manoharlal, New Delhi, 1983.
8. Nizami, Azra, *Socio-religious Outlook of Abul Fazl*, Asia Pub. House, New Delhi, 1972.
9. Mukhia, Harbans, *Historians and Historiography during the Reign of Akbar*, Vikas Publishing House, New Delhi, 1976.
10. Rezavi, Nadeem Ali, 'Religious Disputations and Imperial Ideology: The Purpose and Location of Akbar's *Ibadatkhana*', *Studies in History*, Vol. 24, No. 2, 2008.
11. Rizvi, S.A.A., *Religious and Intellectual History of the Muslims in Akbar's Reign with special reference to Abul Fazl*, Munshiram Manoharlal Publishers, New Delhi. 1975.
12. Siddiqi, Noman Ahmad, 'Shaikh Abul Fazl' in *Historians of Medieval India*, ed., Muhibbul Hasan, Meenakshi Prakashan, Meerut, 1968.
13. سید صباح الدین عبدالرحمن، بزمِ تیموریہ، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، 1946
14. محمد حسین آزاد، دربارِ اکبری، آزاد بک ڈپوٹ، لاہور، 1921
15. شیخ محمد اکرام، رودِ کوثر، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، 2013 (اشاعت اول 1954)

اکائی 13۔ نظام الدین احمد

(Nizamuddin Ahmad)

اکائی کے اجزا

13.0	تمہید
13.1	مقاصد
13.2	مورخ کا دائرہ کار
13.3	نظام الدین احمد کے حالات زندگی
13.4	مورخ کے ذرائع معلومات
13.5	نظام الدین احمد کا فلسفۂ تاریخ
13.6	حقائق کی تعبیر
13.7	اکتسابی نتائج
13.8	کلیدی الفاظ
13.9	نمونہ امتحانی سوالات
13.9.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
13.9.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات
13.9.3	طویل جوابات کے حامل سوالات
13.10	مزید مطالعہ کے لیے تجویز کردہ کتابیں

13.0 تمہید (Introduction)

مغل بادشاہ اکبر کے عہد حکومت میں مغل سلطنت کی توسیع واستحکام کے ساتھ علوم وفنون، شعر وادب، صنعت وحرفت، تہذیب و ثقافت وغیرہ میں قابل قدر ترقی ہوئی۔ ''اس کے عہد میں سیاسی، فکری، مذہبی اور علمی سطح پر ایسے رجحانات اور میلانات کو فروغ حاصل ہوا جن سے اختلاف تو کیا جاسکتا ہے لیکن ان کے دوررس اثرات سے انکار ممکن نہیں۔'' ان حالات نے علوم وفنون کی ترقی وترویج کے لیے ایک سازگار اور سنہرا ماحول تیار کیا اور بڑی مقدار میں سرکاری ونیم سرکاری، علاقائی وعمومی نیز تزک یں وغیرہ جیسی تاریخی کتب اپنے عہد کے علماء وفضلاء نے تحریر کیں۔ ان میں کچھ نے آزادانہ ماحول میں اپنی ذاتی خواہش وشوق کی بنیاد پر تاریخیں لکھیے۔

مغل بادشاہ اکبر کی حکومت کے میر بخشی خواجہ نظام الدین احمد نے بھی تین جلدوں میں ایک تاریخ 'طبقات اکبری' کے نام سے لکھی جو ہندوستان کی عمومی تاریخوں میں ایک خاص وقعت اور اہمیت کی حامل ہے۔ جس کا تتبع بعد کے کچھ مورخین نے بھی کیا۔ طبقات اکبری سے قبل ہندوستان میں قائم مختلف علاقائی مسلم حکومتوں کی کوئی جامع ومکمل تاریخ نہیں لکھی گئی تھی۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے خواجہ نظام الدین احمد نے اپنے دور تک کی ہندوستان میں وجود میں آئیں مسلم حکومتوں کی تاریخ کو ''طبقات'' کے طرز پر تحریر کیا۔ 'طبقات' کا لفظ تہہ در تہہ معلومات فراہم کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر ایک ہی وقت میں مختلف قوموں کے حکام کی تاریخ مرتب کی جائے تو ایک خاندان کی تاریخ یا ایک گروہ کی تاریخ کو ایک طبقہ کہا جاسکتا ہے۔ طبقات کے انداز سے تاریخ لکھنے کا نظام خالصتاً مسلم مورخین کی ایجاد ہے۔ مسلم تاریخ نویسی کی تاریخ میں شناخت کی جانے والی اکائیوں میں 'طبقات' بہت اہمیت کے حامل ہیں۔

13.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- نظام الدین احمد کے حالات زندگی سے واقفیت حاصل کر سکیں گے۔
- مورخ کے دائرہ کار کا جائزہ لے سکیں گے۔
- مورخ کے ذرائع معلومات کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- نظام الدین احمد بخشی کے فلسفۂ تاریخ کو سمجھ سکیں گے۔

13.2 مورخ کا دائرہ کار (Historian's Area of Study)

طبقات اکبری ہندوستان کی عمومی تاریخ ہے جو ناصر الدین سبکتگین کے دور 977ء سے شروع ہو کر اکبر بادشاہ کے 38ویں سال جلوس میں 1593ء پر ختم ہوتی ہے۔ ملّا عبدالقادر بدایونی اس کو ''طبقات اکبر شاہی'' کے نام سے ذکر کرتا ہے اور طاہر محمد عماد الدین حسن مصنف 'روضۃ الطاہرین' اس کا نام ''سلطان نظامی'' بھی لکھتا ہے۔ تاریخ کی دنیا میں یہ بلند پایہ معتبر تاریخ ''طبقات اکبری'' کے نام سے

معروف و مشہور ہے۔ پروفیسر اقتدار حسین صدیقی لکھتے ہیں کہ ''ابوالفضل سے متاثر ہو کر یا اس کے 'اکبر نامہ' کے خلاف رد عمل میں چند فضلاء نے تاریخ پر یادگار کتابیں لکھیں اور اپنے مورخین ہونے کی چھاپ چھوڑی۔ ان لوگوں میں 'طبقات اکبری' (طبقات اکبر شاہی) کے مولف اکبر کے میر بخشی نظام الدین احمد اور ملّا عبدالقادر بدایونی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔''

طبقات اکبری تین ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں ایک مقدمہ، نو طبقات اور ایک خاتمہ شامل ہے۔ پہلی جلد میں ایک مقدمہ ہے اور طبقہ سلاطین دہلی کا ذکر کیا گیا ہے۔ مقدمہ میں غزنویوں کے حالات سلطان ناصر الدین سبکتگین 977ء سے خسرو ملک بن خسرو شاہ 1187ء تک کے حالات درج ہیں۔ جلد اول طبقہ اول کے تحت سلطان معزالدین محمد سام غوری (شہاب الدین غوری) سے لے کر 1526ء میں سلطان ابراہیم لودھی کی پانی پت میں شکست اور بابر کی فتح پر ختم ہوتی ہے۔ دوسری جلد میں بابر بادشاہ سے لے کر اکبر بادشاہ کے 34ویں سال جلوس یعنی 1593ء تک کے تمام اہم واقعات و حالات بیان کیے ہیں بغیر اپنے تبصرہ کے۔ بقول اقتدار حسین صدیقی ''اس میں وہ واقعات بھی بیان کیے گئے ہیں جن کو ابوالفضل نے نظر انداز کر دیا تھا۔'' اس کے آخر میں دور اکبری کے امرائ، علماء، مشائخ، حکماء و شعراء کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ تیسری جلد میں اس وقت کی علاقائی سلطنتوں کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ یہ علاقے پہلے دہلی سلطنت کا ہی حصہ تھے۔ دکن کی بہمنی سلطنت اور بنگال کی سلطنت کے علاوہ سب سلطنتیں 1398ء میں امیر تیمور کے ہندوستان پر حملے اور دہلی سلطنت کے سقوط کے بعد پندرہویں صدی میں قائم ہوئیں تھیں۔ یہ جلد اس لیے بھی اہم ہے کہ اس میں صرف دو سلطنتوں کالپی اور خاندیش کو چھوڑ کر جو بہت چھوٹیں تھیں، باقی تمام بڑی اور اہم علاقائی سلطنتوں کی تاریخ کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

طبقات اکبری سے پہلے ہندوستان کی علاقائی سلطنتوں کی کوئی جامع اور مکمل تاریخ نہیں لکھی گئی تھی۔ طبقات اکبری نے تاریخ کی اس کمی کو پورا کر دیا۔ ہر طبقہ کو تحریر کرتے ہوئے نظام الدین احمد نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ وہ اس کا آغاز اپنی کتاب کی تالیف کی نزدیکی تاریخ سے شروع کرے۔ جب وہ صوبہ یا ریاست خاص، آزاد و خود مختار وجود کی اساس رکھنے میں کامیاب ہوئی اور پھر اس کا تذکرہ اکبر کی مغل سلطنت میں ضم ہونے تک کرتا ہے۔ اس طرح مغل سلطنت کی اتحاد و استحکام کی علامت کے طور پر تصویر کشی کرتا ہے۔ کیونکہ طبقات کی تالیف کا واحد مقصد عہد اکبر میں مختلف علاقائی سلطنتوں کی فتح اور پھر مغل حکومت میں ان کے الحاق سے وابستہ واقعات رقم کرنا تھا۔ اس کی تالیف بنیادی طور پر ایک سیاسی تاریخ ہے جس میں حکمرانوں کی تخت نشینی، فتوحات، بغاوت وغیرہ جیسے اہم واقعات ہی درج کیے گئے ہیں۔ اس لیے نظام الدین بخشی نے نہ تو ریاست کی پالیسیوں کو درج کرنا موزوں سمجھا اور نہ ہی اسباب و علل اور نتائج کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی۔ وہ بہمنی سلطان محمد شاہ کا ذکر چند سطور میں کرتا ہے اور کبھی کبھی تو اس نے حکمراں کا صرف نام اور مدت حکومت لکھ کر اپنا بیان ختم کر دیا ہے۔

کتاب کے آخر میں اکبر کی سلطنت کی وسعت، لمبائی، چوڑائی کو بیان کیا ہے۔ وہ ہندوستان کے متعلق لکھتا ہے کہ ''ہر ایک کوس میں کئی گاؤں آباد ہیں۔ آج کل تین ہزار دو سو (3200) قصبے ہیں اور ہر ایک قصبہ سے متعلق سو، دو سو، پانچ سو اور ہزار تک گاؤں ہیں۔ اور ان بستیوں میں آج کل چھ ہزار چار ارب اور چالیس کروڑ ٹنکہ آمدنی ہے۔ ان سب قصبات میں سے ایک سو بیس (120) بڑے شہر ہیں جو آج کل

معمور وآباد ہیں اور ان قصبات کی تفصیل کی اس مختصر (کتاب) میں گنجائش نہیں ہے۔ اور دئے ہوئے شہروں کی تفصیل حروف تہجی کے اعتبار سے لکھی جائے گی، انشاءاللہ۔'' لیکن زندگی نے اسے ایسا کرنے کا موقعہ نہیں دیا اور 1003ھ/1594ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

13.3 نظام الدین احمد کے حالات زندگی (Nizamuddin Ahmad's Biography)

خواجہ نظام الدین احمد کے اجداد کا تعلق ہرات سے تھا۔ اس کے والد خواجہ محمد مقیم ہروی بابر بادشاہ کے ساتھ ہندوستان آئے تھے جن کا شمار بابر کے قریبی امیروں میں ہوتا تھا۔ خواجہ مقیم نے ہمایوں اور اکبر کے زمانے میں بھی مختلف عہدوں پر رہتے ہوئے انتظامی اور عسکری خدمات انجام دی تھیں۔

خواجہ نظام الدین احمد کی پیدائش 1551ء میں اکبرآباد میں ہوئی۔ حسب دستور تعلیم و تربیت کا انتظام ہوا۔ ملّا علی شیر جو اپنے زمانے کے ایک فاضل اور شیخ الہ داد فیضی سرہندی مولف ''اکبر نامہ'' کے والد تھے، اس کے اساتذہ میں سے ایک تھے۔ نظام الدین احمد نے اپنے وقت کے لحاظ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ والد کے حکم پر تاریخی کتب کا مطالعہ کیا اور بعد میں علم تاریخ سے ایک خاص شغف و رغبت پیدا ہو گئی۔ جس کا نتیجہ ''طبقات اکبری'' کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ خواجہ نظام الدین احمد کو شعر و ادب سے بھی دلچسپی تھی۔ طبقات اکبری میں کئی مقام پر اس نے اپنے اشعار بھی نقل کیے ہیں۔ یہ علوم شریعہ سے بھی شغف رکھتا تھا۔ اکبر کے شعراء و ادباء اس کے مصاحب و دوست رہے ہیں۔ مشہور عالم ملّا حسن علی موصلی جب گجرات آئے تو خواجہ نظام الدین احمد اور ان کے بیٹے محمد شریف نے بعض علوم ان سے پڑھے تھے۔ تصوف سے بھی لگاؤ تھا۔ اس لیے مشائخ سے ارادت و عقیدت سے پیش آتے تھے۔ خواجہ نظام الدین احمد کی اسی اعلیٰ تعلیم و تربیت نے ان کو معاملہ فہمی اور دوست پرستی میں ضرب المثل بنا دیا تھا۔ نظام الدین احمد کی بہ یک وقت عسکری و انتظامی صلاحیتوں، شعر و ادب اور علم تاریخ میں مہارت نے انھیں عہد اکبری کی ایک منفرد و غیر جانبدار شخصیت بنا دیا تھا۔

نظام الدین احمد بخشی اکبر کے دربار سے کب وابستہ ہوا اور کس عہدہ پر تقرر ہوا تھا، اس کی یقینی جانکاری نہیں ہے۔ یہ اکبر کے 27ویں سال جلوس 1583ء میں صوبہ گجرات کا بخشی مقرر ہوا تھا۔ یہاں اس نے اپنی فوجی مہارت کا ثبوت دیتے ہوئے نہ صرف مظفر گجراتی کی بغاوت کو فرو کیا بلکہ امن و امان قائم کرنے میں بھی کامیابی حاصل کی۔ جس سے خوش ہو کر اکبر نے اس کی تنخواہ میں اضافہ کیا بلکہ خلعت سے بھی سرفراز کیا۔ بعدہٗ جونپور میں کچھ عرصہ متعین رہا۔ 1589ء میں نظام الدین احمد کو دربار طلب کیا گیا جہاں وہ ترقی کی نئی منازل طے کرتا گیا۔ جلد ہی اسے اجمیر، گجرات اور مالوہ کی خالصہ زمینوں کی نگرانی سپرد کی گئی۔ 92-1591ء میں شمس آباد کا پرگنہ اسے بطور جاگیر ملا تھا۔ 91-1590ء میں جب آصف خاں مرزا جعفر بخشی بیگی کو جلالہ روشنائی کی سرکوبی کے لیے کابل کی مہم سپرد کی گئی تو خواجہ نظام الدین احمد کو میر بخشی کے منصب پر فائز کیا گیا۔ تقریباً 7-8 سال تک خواجہ نظام الدین احمد کا گجرات میں قیام رہا۔ اسی زمانے میں اس نے یہاں شعر و ادب کی محفلیں بھی گرم کیں۔ یہاں پر شیخ محمد اسحاق فاروقی اور میر معصوم بھکری مولف 'ذخیرۃ الخوانین' اس کے دوست اور وکیل تھے۔ ملّا حیفی ساؤجی، ملّا حالتی جیسے شعراء سے بھی اس کی ہم نشینی رہی۔ طبقات اکبری کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ملّا عبداللہ رازی، لطفی منجم، میر شریف و

قوعی نیشاپوری، ملّاحیاتی گیلانی، ملّابقائی، ملّازمینی جیسے نابغار علماء وشعراءاس کے مصاحب رہے ہیں۔1592ء میں اکبر بادشاہ کے کشمیر کے سفر میں نظام الدین احمد بھی شریک سفر تھا۔1594ء میں اکبر بادشاہ نے لاہور سے شکار کاارادہ کیاتو نظام الدین احمد بھی بادشاہ کاہم رکاب تھا۔ لیکن راستے میں تپ محرقہ میں مبتلاہو گیااور دریائے راوی کے کنارے 23صفر1003ہجری28اکتوبر1594ء کوپینتالیس سال کی عمر میں خواجہ نظام الدین احمد کاانتقال ہو گیا۔لاہور میں اس کے اپنے باغ میں تدفین عمل میں آئی۔یوں توایسی قابل اور مرنجان مرنج ہستی کے اٹھ جانے کاہر شخص کورنج تھالیکن ملّاعبدالقادر بدایونی نے بڑاماتم کیااور ایک قطعہ بھی لکھا۔ملّاعبدلقادر بدایونی لکھتاہے ''ایساکوئی شخص نہ تھاکہ جو اس کی خوبیوں کو یاد کرکے اشکبار نہ ہواہو۔''اکبر بادشاہ کو بھی نظام الدین احمد کی موت کاسخت رنج ہوا۔ابوالفضل لکھتاہے ''اس کی موت پر صرف دوست وساتھی ہی نہیں بلکہ اجنبی بھی روئے۔''صاحب مآثرالامراء شاہنواز خان لکھتاہے ''خواجہ نظام الدین احمد راستی ودرستی میں بے مثل اور کار گزاری ومعاملہ فہمی میں اپنے ہم عصروں میں ممتاز تھا۔''اور یہی غیر جانبدارانہ انداز جو نظام الدین احمد بخشی کی زندگی کاحصہ تھااس کی تحریر کابھی جزوبن گیا۔

ملّاعبدالقادر بدایونی اور خواجہ نظام الدین بخشی کے درمیان خصوصی تعلقات تھے۔شیخ عبدالحق محدث دہلوی جب حج بیت اللہ کے لیے گئے تھے تواس وقت نظام الدین احمد گجرات کابخشی تھا۔اس نے شیخ عبدالحق محدث کی کافی خاطر مدارات کی اور سفر کے لیے جہاز کابھی انتظام کیاتھا۔محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ ''نظام الدین احمد راستی ودرستی اور معاملہ فہمی وکاردانی میں رشتہ اعلیٰ رکھتے تھے اور رفاقت پرستی اور صفائی وآشنائی میں یگانۂ روزگار تھے۔''

واقعتاًخواجہ نظام الدین احمد بخشی ایک خاندانی اور باحوصلہ امیر تھا۔وہ اعلیٰ اخلاق وکردار کامالک، علم دوست، احباب نواز، روادار اور راسخ العقیدہ مسلمان تھا۔اس کی رواداری نے اسے اکبر کے دربار میں جاری مذہبی مناظروں سے دوری بنائے رکھنے میں مدد کی۔

13.4 مورخ کے ذرائع معلومات (Historian's Sources of Information)

نظام الدین احمد بخشی اپنے ذرائع معلومات وماخذات کی اہمیت سے اچھی طرح واقف تھااسی لیے طبقات اکبری میں اس نے بڑے قابل اعتماد ماخذوں کی بنیادپر حالات وواقعات قلمبند کیے ہیں اور اپنے بیانات کی تائید میں اکثر حوالے بھی درج کیے ہیں۔خواجہ نظام الدین احمد نے مندرجہ ذیل 28کتابیں بطور ماخذ درج کی ہیں: (1)تاریخ یمینی از ابو نصر محمد عتبی (2)تاریخ زین الاخبار از ابو سعید عبدالحئ گردیزی (3)روضتہ الصفاز محمد بن خوند شاہ (4)تاج المآثر از حسن بن احمد نظامی (5)طبقات ناصری از منہاج السراج (6)خزائن الفتوح از امیر خسرو (7)تغلق نامہ از امیر خسرو (8)فتوحات فیروز شاہی از فیروز شاہ تغلق (9)تاریخ فیروز شاہی از ضیاءالدین برنی (10)تاریخ مبارک شاہی از یحیٰ بن احمد سرہندی (11)فتوح السلاطین از عصامی (12)تاریخ محمود شاہی: منڈوی (13)تاریخ محمود شاہی از خورد منڈوی (14)تاریخ محمود شاہی گجراتی (15)مآثر محمود شاہی گجراتی (16)تاریخ محمدی (17)تاریخ بہادر شاہی (18)تاریخ بہمنی (19)تاریخ ناصری (20)تاریخ مظفر شاہی (21)تاریخ رشیدی از مرزا حیدر دوغلت (22)تاریخ کشمیر (23)تاریخ سندھ (چچ نامہ) علی بن حامد کوفی

(24)تاریخ بابری (25)واقعات بابری (تزک بابری) (26)تاریخ ابراہیم شاہی (27)واقعات مشتاقی از رزق اللہ مشتاقی (28)واقعات ہمایونی (تذکرۃ الواقعات) از جوہر آفتابچی۔

نظام الدین احمد نے طبقات اکبری لکھتے وقت ان کے علاوہ دیگر کتب سے بھی مدد لی تھی۔ کیونکہ طبقات اکبری میں ہمیں 'اکبر نامہ' مولف ابوالفضل، 'سراج التواریخ' مولف خواجہ محمد لاری، 'ملفوظ' خواجہ قطب الدین بختیار اور 'قران السعدین' مولف امیر خسرو کے نام بھی ملتے ہیں۔ مذکوہ فہرست میں زیادہ تر ان مصنفین کی کتابوں کا ذکر ہے جو درباری مورخ کہتے جاتے ہیں، ممکن ہے ایک درباری تاریخ لکھنے کے لیے اس نے یہ ذرائع معلومات وماخذ اپنے محدود مقصد کی تکمیل کے لیے مناسب سمجھے ہوں۔ دراصل طبقات اکبری کے ذریعہ نظام الدین احمد بخشی ہمیں یہ بتانا چاہتا ہے کہ ہندوستان کی تمام مملکتیں اکبر کے تحت آکر ایک ہو گئیں یعنی اکبر کی سلطنت میں ضم ہونے کے بعد اب عدل و انصاف سے فیض یاب ہوں گی۔ ہربنس مکھیا لکھتے ہیں کہ ''اس نے کئی اہم تاریخی ماخذوں کا ذکر نہیں کیا جن میں عفیف کی 'تاریخ فیروز شاہی'، امیر خسرو کی 'مفتاح الفتوح' اور برنی کی 'فتاویٰ جہانداری' اہم ہیں۔ غالباً برنی کی فتاویٰ جہانداری کی جانکاری عہد اکبر کے مورخین کو نہیں تھی۔''

خلیق احمد نظامی رقمطراز ہیں ''نظام الدین کے ماخذ میں بہت سی ایسی تاریخیں شامل ہیں جو اب نادر و نایاب ہیں۔ بعض ایسی ہیں جو حال ہی میں دستیاب ہوئی ہیں۔ 'فتوحات فیروز شاہی'، 'فتوح السلاطین' اور 'تاریخ محمدی' وغیرہ کو اس سے پہلے کسی مورخ نے استعمال نہیں کیا تھا۔ فتوحات فیروز شاہی کی اصل نوعیت کے متعلق تو سب سے پہلے اطلاع خواجہ نظام الدین احمد سے ہی ملتی ہے۔''

نظام الدین احمد نے بنیادی طور پر ایک سیاسی تاریخ لکھی ہے۔ اس نے جن ماخذات کی فہرست فراہم کی ہے وہ سب کتابیں دربار یا درباری سیاست سے ہی متعلق ہیں جو اس کی اپنی تاریخ رقم کرنے کے لیے نہایت موزوں اور فائدہ مند تھیں۔ اس کا خود کا خاندان بھی طبقہ امراء سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے والد خواجہ مقیم ہروی بادشاہ بابر کے ساتھ ہندوستان آئے تھے جنہوں نے بابر سے لے کر عہد اکبری تک مختلف منصب پر رہتے ہوئے خدمات انجام دیں تھیں لہٰذا بہت سی اہم جانکاریاں و معلومات اس کو اپنے والد اور ان کے رفقاء کے ذریعہ بھی اس کو حاصل تھیں۔ اسی کے ساتھ اس نے اپنے ذاتی مشاہدات، تجربات و معلومات کا استعمال طبقات اکبری لکھتے وقت کیا۔ گجرات میں ایک طویل عرصہ تک قیام کی وجہ سے اسے گجرات و مالوہ کے ضمن میں خاص معلومات حاصل تھیں نیز کشمیر اور پنجاب میں بھی وہ کچھ عرصہ رہا تھا لہٰذا ان علاقوں کے متعلق اس نے ذاتی معلومات و مشاہدات کی بنیاد پر لکھا۔ محمد حسین آزاد لکھتے ہیں ''کہ طبقات اکبری عمدہ تاریخ ہے جس میں 1594ء تک اکبر کا حال لکھا ہے۔ اگرچہ مفصل بھی نہیں مگر مختصر بھی نہیں، عبارت صاف، بے تکلف، بے مبالغہ، حالات کی تحقیق، احوال کی تنقیح، اخبار کے فراہم کرنے میں بڑی کوشش اور تکالیف اٹھانی پڑیں۔ یہی پہلی تاریخ ہے جو بادشاہ مختلف ممالک ہند میں ہوئے ہیں، ابتداء سے عہد تصنیف تک سب کا حال ان پر حاوی ہے۔ محمد قاسم فرشتہ اور ان کے بعد جو مورخ آئے اور اس سے زیادہ لکھ گئے، اصل سب کی یہی ہے۔'' طبقات اکبری میں واقعات کو اخذ کرتے وقت نظام الدین بخشی نے اپنے ان ماخذات کو تنقید کی کسوٹی پر نہیں پرکھا، صرف واقعات کو نقل کر دیا۔

13.5 نظام الدین احمد بخشی کا فلسفۂ تاریخ (Nizamuddin Bakhshi's Philosophy of History)

ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ نویسی کی روایت میں ایک اہم تبدیلی خواجہ نظام الدین احمد بخشی کی 'طبقات اکبری' کی شکل میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس نے ہندوستان کی غیر جانبدارانہ تاریخ لکھی جو عہد اکبری کے غیر جانبدارانہ ور وادارانہ ماحول کی عکاسی کرتی ہے۔ نظام الدین احمد بنیادی طور پر ایک سپاہی، منتظم، محتاط و دیانت دار اور اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص تھا اور انتظامی امور کے معاملے میں اپنے ہم عصروں سے کہیں بہتر تھا۔ طبقات اکبری لکھتے وقت میر معصوم بھکری مولف 'ذخیرۃ الخوانین' اس کا شریک کار بن گیا تھا جو خود مورخ اور عالم و فاضل شخص تھا۔ نظام الدین احمد ان سات مصنفین میں سے ایک تھا جن کو اکبر نے 'تاریخ الفی' مرتب کرنے کا حکم دیا تھا۔

نظام الدین بخشی کو بچپن ہی سے علم تاریخ سے خصوصی دلچسپی تھی اور تاریخی کتب اس کے مطالعہ میں رہتی تھیں۔ اس لیے وہ اپنے دور میں وقوع پذیر واقعات کو بھی ایک مورخ کی نظر سے دیکھتا رہا۔ جب وہ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوا تو اسے اپنے فطری شوق کو پروان چڑھانے کا موقع ملا۔ اس نے اپنے مطالعہ تاریخ اور ذاتی مشاہدات و تجربات کو طبقات اکبری کی شکل میں قلمبند کرنے کا فیصلہ کیا۔ نظام الدین بخشی کے نزدیک تاریخ ''ارباب استعداد کے لیے ہوش افزاء اور اہل بصیرت کے لیے عبرت بخش'' ہے کیونکہ ''زندگی کے منزل کے مسافروں کے حالات سے جو حقیقت میں سیر معنوی ہے، سے انشراح طبع حاصل ہوتا ہے۔'' اور ''سوانح غیبی سے ارباب دانش کو مزید آگاہی'' ملتی ہے۔

نظام الدین احمد کا مقصد تاریخ میں گزرے واقعات کی روداد بیان کرنا تھا نہ کہ ان کا تجزیہ و تنقیح کرنا۔ اس کے نزدیک تاریخ عبرت حاصل کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ ماضی کا یہ مطالعہ ارباب دانش کے لیے ضروری ہے۔ اس کے مطابق حقائق کی یہ آگاہی قاری کی اپنی سمجھ و دانش کے مطابق ہو گی اور حقائق کی تعبیر و تشریح کے لیے قاری پوری طرح آزاد ہے۔ کیونکہ نظام الدین احمد نے تو صرف واقعات و حقائق کو بیان کرنے کو ہی مورخ کا اہم فریضہ سمجھا تھا۔ وہ ماضی کے انسانی تجربات کو تو اہم مانتا ہے۔ مگر ان تجربات کے فوائد حاصل کرنا قاری کی اپنی 'انشراح طبع' پر چھوڑ دیتا ہے۔ نظام الدین احمد کے نزدیک 'اہل بصیرت' حضرات اپنی استعداد کی بنیاد پر تاریخ کے مطالعہ سے عبرت حاصل کر سکتے ہیں تاکہ اپنے حال کو بہتر اور موجود مسائل کو حل کر سکیں۔ وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ حال کے مسائل کی جڑیں ماضی میں پیوست ہیں اس لیے اہل دانش کے لیے تاریخ اور ارباب حل و عقد کی سوانح کا مطالعہ فائدہ مند ہے۔ اسی لیے وہ اپنی تاریخ میں حقائق و واقعات بڑی ایمانداری کے ساتھ پیش کرتا ہے مگر اسباب و نتائج میں کوئی رشتہ قائم کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ نظام الدین احمد طبقات اکبری کی جلد دوم کے خاتمہ پر وضاحت کے ساتھ لکھتا ہے کہ تاریخ اس کے لیے ''عظیم واقعات کا انتخاب ہے۔'' لہٰذا پھر ان انتخاب شدہ وقوع پذیر واقعات کے اسباب و علل تعبیر و تشریح اور تجزیہ کی ضرورت و گنجائش ہی نہیں رہتی صرف واقعات کا بیان کرنا ہی مورخ کا اہم اور بنیادی فریضہ رہ جاتا ہے۔

خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ ''خواجہ نظام الدین بخشی کا نظریۂ تاریخ اپنے دو مشہور معاصرین شیخ ابوالفضل اور عبدالقادر بدایونی سے بالکل مختلف تھا۔ وہ تاریخی واقعات کے تجزیہ میں ذاتی تاثرات شامل کرنا اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ انہوں نے نہ تو ابوالفضل کی طرح اکبر کی مدح سرائی میں مبالغہ کیا ہے۔ نہ بدایونی کی طرح اس کو ہدف ملامت بنانے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے واقعات کو تاریخی ترتیب کے ساتھ بیان کر

دیا ہے، کوئی نقطۂ نظر پیش نہیں کیا۔ اس طرح ان کے بیانات کی صداقت تو مسلم ہو گئی لیکن انداز بیان بالکل سادہ اور بے جان ہو گیا۔''

نظام الدین احمد کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اکبر کے دربار میں جاری بہت سے متنازع فیہ مسائل میں نہیں الجھا اور ایک غیر جانبدار شخص کی طرح دربار سے وابستگی بنائے رکھی۔ وہ اپنی ذاتی زندگی میں مذہبی رہا مگر یہ مذہبیت اس کی درباری زندگی میں یا طبقات اکبری میں ہمیں دیکھنے کو نہیں ملتی ہے۔

13.6 حقائق کی تعبیر (Interpretation of Facts)

نظام الدین احمد بخشی طبقات اکبری میں ہر حکمراں کا تذکرہ اس کی تخت نشینی سے شروع کر کے، حکمران کی موت تک کے واقعات قلمبند کرتا ہے۔ اس نے التتمش اور شیر شاہ کو چھوڑ کر کسی بھی حکمراں کی سیرت و سوانح حیات (دورۂ زندگی) تحریر نہیں کیے ہیں۔ التتمش کی سوانح اس نے کیوں لکھی؟ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ البار ی خاندان کا بانی تھا اور دہلی سلطنت کا پہلا صاحب اقتدار و آزاد سلطان تھا۔ شیر شاہ کی زندگی کے تعلق سے ممکن ہے اس لیے لکھا کہ وہ ایک عام شخص سے اٹھ کر اپنی ذاتی صلاحیتوں کی بنیاد پر ترقی کرتا ہوا سلطان بنا تھا۔ دیگر سلاطین کی طرح شیر شاہ کو سلطنت وراثت میں نہیں ملی تھی۔ نظام الدین احمد کی نظر میں اس کی پانچ سالہ حکومت کا بیان بے معنی اور تشنہ ہی رہتا۔ اس لیے بحیثیت سلطان اس کی زندگی کا رخ متعین کرنے والے اہم واقعات و حادثات کا تذکرہ کرنا اس کے لیے ضروری تھا۔

ان دو غیر معمولی واقعات کو چھوڑ کر اس نے طبقات اکبری کو اپنے معین ڈھانچے کے تحت ہی لکھا۔ یہاں تک کہ اس نے بابر کی زندگی کے تعلق سے وسط ایشیا کے واقعات کو لکھنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ وہ لکھتا ہے کہ ''چونکہ یہ کتاب ہندوستان کے واقعات کے لیے مخصوص ہے اس لیے آنحضرت (بابر بادشاہ) کے وہ واقعات جو ولایت ماوراء النہر و خراسان یا دوسرے مقامات پر ظہور پذیر ہوئے ہیں، نظر انداز کر دئے گئے ہیں۔ ان کا بیان تاریخ اکبر نامہ میں جس کو افاضل پناہ، حقیقت آگاہ، مقرب الحضرت الخاقانیہ السلطانیہ شیخ ابوالفضل نے تالیف کیا ہے، نیز واقعات بابری اور دوسری تاریخوں میں بھی ہے۔''

کبھی کبھی نظام الدین احمد سنی سنائی اور غیر ضروری باتوں کو بھی اپنی تاریخ میں جگہ دے دیتا ہے۔ جیسے کہ کس طرح ایک یوگی نے کشمیر کے سلطان زین العابدین کے مردہ جسم میں اپنی روح (آتما) داخل کرنے کی پیشکش کی۔ یا مہدی خواجہ کے ذریعہ بابر کی موت کے بعد ہمایوں کو تخت سے محروم رکھنے کی سازش کا ذکر، جس کی اطلاع اسے اپنے باپ سے ملی تھی۔ نظام الدین احمد اس طرح کی ملی اطلاعات کی صداقت پر سوالیہ نشان نہیں لگاتا۔ اور یہ مقام حیرت ہے کیونکہ ایک مورخ کا یہ ایک اہم فریضہ ہے کہ وہ حاصل اطلاعات کی صداقت کی تحقیق و تنقید کرے اور اس پر تبصرہ کرے۔ لیکن نظام الدین کے یہاں ہمیں یہ دیکھنے کو نہیں ملتا۔ اسی لیے اس کی تاریخ واقعات کا بیان اور تذکرہ بن کر رہ جاتی ہے۔

نظام الدین بخشی نے طبقات اکبری میں بلبن کی تاجپوشی تک کے واقعات کا 'طبقات ناصری' سے اختصار پیش کیا ہے۔ اور ان واقعات کو بیان کرتے وقت اس نے منہاج السراج کی زبان و اسلوب کو بھی اسی شکل میں قبول کر لیا ہے جس میں اس نے قلمبند کیا تھا۔ سلطان بلبن

کے دور حکومت کے واقعات کو رقم کرتے ہوئے نظام الدین احمد کے طرز بیان میں تبدیلی محسوس کی جاسکتی ہے۔ جو کہ ضیاءالدین برنی کے اسلوب سے میل کھاتی ہے۔ اس تذکرہ میں انتظام حکومت کے تعلق سے بلبن کے جاری کردہ ضوابط و قوانین اور بلبن کے ذریعہ اپنے بیٹوں کو دئے گئے پند و نصائح کو بیان کیا ہے۔ شہزادہ محمد کی موت کا ذکر بڑے جذباتی انداز میں کیا ہے۔

علاءالدین خلجی کے عہد حکومت کے ضمن میں بازار کنٹرول پالیسی اور حکومت کے خلاف بغاوتی رجحانات کو دبانے کے لیے اٹھائے گئے اقدامات کا تذکرہ کرتا ہے۔ ان تمام واقعات کو وہ نہ صرف برنی کی 'تاریخ فیروز شاہی' سے اخذ کرتا ہے بلکہ اس کے انداز بیان و طرز کو بھی اپنا لیتا ہے۔

کبھی کبھی نظام الدین احمد نے باہمی متضاد بیان دو الگ الگ ماخذوں سے نقل کیے ہیں۔ دہلی سلطنت کے طبقہ کے تحت سکندر لودی کی چندیری فتح کا جو بیان لکھا ہے وہ مالوہ کے سلاطین کے تحت لکھے گئے طبقہ سے کسی بھی طرح میل نہیں کھاتا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس نے اس طرح ایک ہی واقعہ کے دو ہم عصر بیان قلمبند کیے ہیں لیکن ان کا تجزیہ کرنے سے گریز کیا ہے۔ اور ان دو بیانات کو اپنے قاری کے سامنے پیش کر کے ایک مورخ کی ذمہ داری سے بری الذمہ ہونے کی کوشش کی اور سچائی کی تلاش کی ذمہ داری کے لیے قاری کو آزاد چھوڑ دیا۔

طبقات اکبری میں نظام الدین احمد واقعات کا تذکرہ تاریخی ترتیب سے کرتا ہے اور واقعات کی تہہ تک جانے یا ان پر تبصرہ کرنے کی کوئی کاوش اس کی طرف سے دیکھنے کو نہیں ملتی۔ مثلاً نظام الدین بخشی کے مطابق اکبر نے ماہم انگہ، ادھم خان اور شہاب الدین کی باتوں میں آکر بیرم خان کو دغا باز سمجھا تھا۔ جس سے دلبرداشتہ ہو کر بیرم خان نے مکہ زیارت کے لیے جانے کی اجازت لی تھی۔ جب کہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ دراصل اکبر اب جوان ہو چکا تھا اور اقتدار پر اپنا مکمل تسلط قائم کرنا چاہتا تھا اس خواہش کی تکمیل میں بیرم خان کی طاقت و اثر اس کی راہ میں رکاوٹ تھا۔ اس بنیاد پر دونوں کے مابین اختلافات پیدا ہوتے چلے گئے اور نتیجہ بیرم خان کی معزولی کی شکل میں سامنے آیا تھا۔ یہاں نظام الدین نے واقعات تو بیان کر دئے مگر حقیقت کی تلاش یا تجزیہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ شاید تجزیہ کرتے وقت اسے اکبر کا ہر طرح کی بندشوں سے آزاد ایک مکمل خود مختار حکمراں بننے کی خواہش اور دربار کے اس ماحول کو جو بیرم خان کے خلاف تھا، ذکر کرنا پڑتا۔ یہ بات ایک درباری کی حیثیت سے نظام الدین بخشی کے لیے مشکل تھی لہٰذا ایسے مواقع پر اس کا غیر جانبدار بنا رہنا ضروری تھا۔ حقیقت یہ بھی تھی کہ اس میں کڑپن یا جانبداری اور اس قسم کی دیگر خامیاں جو اس کے ہم عصروں یا اس سے قبل کے مورخوں میں پائی جاتی تھیں، بہت کم تھیں۔

نظام الدین احمد ہر طبقہ کا خاتمہ بڑے خشک انداز میں کرتا ہے۔ عموماً ہر حکمراں کا دورۂ حکومت کا معین وقت سال، مہینے اور دن میں تحریر کرتا ہے۔ بھولے بھٹکے ہی وہ کسی حکمراں کے ذاتی اوصاف اور خوبیوں کو بیان کرتا ہے۔ بابر کی موت کا ذکر کرتے وقت نظام الدین بخشی کافی افسردہ نظر آتا ہے۔ بابر کی ادب و فنون سے دلچسپی اور اس کی سیرت و کردار کا ذکر کرتے ہوئے اس نے تعزیت میں چند جذباتی اشعار بھی درج کیے ہیں۔ بابر کی سیرت و علمی اوصاف کے متعلق لکھتے ہوئے رقمطراز ہے ''اس بادشاہ جہاں پناہ کے کچھ عجیب و غریب حالات ہیں۔ ان میں سے ایک یہ کہ موزہ دو پاشنہ کے ساتھ قلعہ کے کنگروں پر آہستہ آہستہ دوڑتا تھا اور کبھی کبھی دو آدمیوں کو بغل میں دبا کر ایک کنگرے سے

دوسرے کنگرے پر جست لگاتا تھا۔ اس نے ایک خط (طرز تحریر) ایجاد کیا تھا جس کو 'خط بابری' کہتے ہیں اور اسی خط میں قرآن شریف کتابت کر کے مکہ معظمہ بھیجا۔ بابر بادشاہ فارسی و ترکی میں شعر خوب کہتا تھا۔ علماء و فضلاء کی بہت پرورش کرتا تھا۔ اس نے حنفی فقہ و کلام کی ایک کتاب ترکی زبان میں نظم کی جس کا نام 'مبین' ہے اور اس کے رسائل عروض مشہور ہیں۔ اس نے اپنے واقعات (تزک بابری) ترکی زبان میں تحریر کیے ہیں اور خوب داد فصاحت دی ہے۔'' نظام الدین احمد سلطان محمود گجراتی کی تعریف کرتے ہوئے اس کی تعمیر کردہ عمارات کا ذکر کرتا ہے اور اس کے دور میں جاری غیر اخلاقی رواج جیسے حرام کاری، عورتوں کا مزارات پر جانا وغیرہ کو بیان کرتا ہے جس کو محمود گجراتی نے روکنے کی کوشش کی تھی۔

نظام الدین بخشی نے طبقات اکبری میں موضع چکور کے تعلق سے ایک بڑی ہی غیر اخلاقی حکایت نقل کی ہے۔ اس حکایت سے ہم کو اس زمانے میں سماج میں موجود اخلاقی برائیوں کا علم ہوتا ہے، وہ لکھتا ہے ''اس موضع میں ایک ہندو نے اپنی خاص بیٹی کو اپنی بیوی بنالیا اور اس لڑکی سے اس کم بخت کے چند بچے بھی ہوئے۔ بادشاہ نے اس ہندو اور اس لڑکی کو حاضر ہونے کا حکم دیا۔ ان دونوں کے حاضر ہونے کے بعد اکبر بادشاہ اس قضیۂ نامرضیہ کی طرف متوجہ ہوا۔ اس ملعون نے بے تامل اس مکروہ فعل کا اقرار کیا اور کہا کہ اس لڑکی کا شوہر چند سال ہوئے ولایت گڑھ کی جنگ میں مارا گیا۔ لیکن اس کے سیاق کلام سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ لڑکی کے شوہر کو بھی اس نے قتل کیا ہوگا۔'' اکبر نے اس جرم کی سزا کے طور پر پہلے اس کا عضو مخصوص جڑ سے کٹوایا اور اگلے روز اسے قتل کی سزا دی۔ اس فیصلے سے ہمیں اکبر کے غیر اخلاقی معاملات میں سخت رخ کا اندازہ ہوتا ہے۔

نظام الدین بخشی نے اکبر کے عہد کی 40 سالہ تاریخ کو قلمبند کیا ہے۔ اس نے طبقات اکبری میں سال بہ سال کے واقعات کو تاریخی ترتیب سے تحریر کیا ہے۔ جو واقعہ ایک سال کے بعد تک جاری رہا تو اسے وہ اگلے سال کے بیان میں اس کے مقام پر جوڑ دیتا ہے۔ اس طرح وہ بڑی احتیاط کے ساتھ واقعات کی ترتیب زمانی بنائے رکھتا ہے۔ لیکن اس نے گجرات کے اپنے سات سالہ قیام کے دوران وقوع پذیر واقعات کو ایک ساتھ قلمبند کیا ہے جو ایک استثناء ہے۔

قدرتی آفات مثلاً زلزلہ وغیرہ کا آنا یا احمد آباد شہر کے منصوبہ کا ذکر جیسے غیر سیاسی واقعات بھی ہمیں طبقات میں خال خال پڑھنے کو مل جاتے ہیں۔ وہ ایک جگہ ایک بڑی اہم جانکاری اپنے قارئین کو فراہم کراتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ایک لاکھ اکبر شاہی روپیہ عراق کے اس وقت رائج سکہ نومان کے دو ہزار پانچ سو کے برابر تھا۔ ساتھ ہی لکھتا ہے کہ ایسی بات کسی بادشاہ کے ذکر میں تاریخ میں مذکور نہیں ہے۔ بادشاہ اکبر کے عہد حکومت کے پچیسویں سال جلوس کا ایک اہم اور متنازع فیہ واقعہ ''اکبر کے حق اجتہاد کے لیے علماء کا محضر'' تھا۔ نظام الدین بخشی لکھتا ہے ''ایک روز عالموں و فاضلوں کے حضور میں مختلف فیہ مسائل زیر بحث آئے اور اس بحث میں گفتگو نے طول کھینچا، خوب قیل و قال ہوئی اور گفتگو یہ تھی کہ لفظ اجتہاد اور مجتہد کا اطلاق کسی شخص پر کیا جاسکتا ہے اور کس کو مجتہد کہہ سکتے ہیں۔'' اس کے مطابق اس محضر پر شیخ مبارک، مولانا عبداللہ مخدوم الملک سلطان پوری، شیخ عبدالنبی، قاضی خان بدخشی، قاضی جلال الدین ملتانی اور صدر جہاں مفتی نے دستخط کیے اور اپنی مہریں ثبت کیں۔ نظام الدین بخشی اس محضر نامہ کے طریق عمل کا تو ذکر کرتا ہے مگر ان 'مختلف فیہ مسائل' اور اس 'قیل و قال' کا خلاصہ پیش

نہیں کرتا اور نہ ہی لفظ اجتہاد اور مجتہد کا اطلاق کس شخص پر کیا جا سکتا ہے، کی وضاحت کرتا ہے۔ نہ ہی اس سیاق و سباق کو بیان کرتا ہے جس کے تحت یہ مسئلہ پیدا ہوا تھا۔

اس ضمن میں ملّا عبد القادر بدایونی زیادہ صراحت کے ساتھ لکھتا ہے کہ ''اکبر کے حق اجتہاد کے لیے علماء کا محضر بادشاہ کی ''دینی سیادت'' کو تسلیم کرانے کے لیے تیار کیا گیا تھا جس میں مجتہد شرع پر 'سلطان عادل'، کی فضیلت ثابت کی گئی تھی۔'' بدایونی کے مطابق اس محضر کے ذریعہ اکبر بادشاہ کو سلطان عادل ثابت کرنا اور اعلان کرنا تھا۔ جو امور سلطنت میں مصلحت وقت کے لحاظ سے اختلافی مسائل میں اپنا فیصلہ نافذ کرے اور یہ فیصلہ تمام علماء و فضلاء کو تسلیم ہو۔ بالفاظ دیگر اب اکبر کے سیاسی و دینی قائد ہونے کا اعتراف کرنا تھا اس پر خوب بحث و تمحیص ہوئی ''لیکن عملاً یہی ہوا کہ اس محضر نامہ پر بعض نے خوشی سے اور بعض نے جبراً مہریں لگا کر اس کی تصدیق کر دی۔'' بدایونی محضر نامہ کا پورا پس منظر رقم کرتا ہے مگر نظام الدین بخشی اس واقعہ کو اطلاعاً اپنے قارئین کے لیے تحریر کرتا ہے اور ان تمام حالات سے قطع نظر اس کے نزدیک محضر نامہ کی واحد اہمیت یہ تھی کہ اس دستاویز پر سب علماء کے دستخط ہو گئے۔ اسی لیے اس نے طبقات میں اس واقعہ کا ذکر کرنا مناسب سمجھا ساتھ ہی محضر نامہ کی نقل بھی شامل کتاب کر دی۔

عہد اکبری کا ایک اور اہم واقعہ 1575ء میں عبادت خانے کی تعمیر اور اس میں منعقد مجالس ہیں، جہاں مذہبی و علمی مباحث و مذاکرے ہوا کرتے تھے۔ ان مجالس میں بحث و مباحثہ کے دوران جو ہنگامہ خیزی اور زبانی معرکہ آرائیاں ہوئیں ان باتوں کا تذکرہ نہ کر کے نظام الدین صرف عبادت خانے کی تعمیر اور بادشاہ کے دینی و روحانی اور علمی تجسس و دلچسپی کا ذکر کرتا ہے۔ اور یہاں ہوئے تنازع اور ہنگامہ خیز واقعات و حالات کو بیان کرنے سے گریز کر جاتا ہے۔ اس کے نزدیک عبادت خانے کی تعمیر کا مقصد اکبر بادشاہ کا ''ارباب فضل و کمال کی محبت، اصحاب وجد و حال کی مجالست اور جمعہ و متبرک راتوں میں اہل اللہ کی محبت میں شب گزاری تھا۔'' یہاں صرف سادات، علماء اور مشائخ کو ہی حاضر مجلس رہنے کی اجازت تھی۔ ملّا عبد القادر بدایونی صراحت کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ ''مذکورہ عبادت خانہ میں ہر جمعہ کی رات کو محفل منعقد ہوتی تھی جس میں سادات، مشائخ، علماء اور امراء سبھی حاضر رہتے۔ بادشاہ کے قریب نشستیں لینے کے لیے اکثر تقدیم و تاخیر کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوتا تھا اور لوگ آپس میں بڑی بد تہذیبی کا مظاہرہ کرنے لگتے تھے۔ اس لیے اکبر نے باقاعدہ نشستوں کا تعین کر دیا۔'' بدایونی عبادت خانہ کی ہنگامہ خیزی، چیخ چیخ کر بحث و مباحثہ، ناشائستہ گفتگو، لعن طعن، شور غل، ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش وغیرہ جیسے واقعات کو تفصیل سے بیان کرتا ہے۔ نظام الدین بخشی نے ان تمام وقوع پذیر متنازع فیہ معاملات و واقعات کو رقم کرنے سے اجتناب کیا ہے۔

نظام الدین بخشی اسی طرح 1589ء میں اکبر بادشاہ کے ذریعہ فتح پور سیکری کی جامع مسجد میں جمعہ کا خطبہ دینے کا ذکر اتباع رسول و خلفائے راشدین کے حوالے سے کرتا ہے جہاں اکبر نے خطبہ کے بطور، فیضی کے تین شعر پڑھے اور ممبر سے اتر کر حافظ محمد امین کو امامت کرنے کا حکم دیا تھا۔ نظام الدین بخشی اکبر کے اس فعل کی کوئی تاویل پیش نہیں کرتا کہ اچانک اکبر نے ایسا کیوں کیا لیکن عبد القادر بدایونی اس واقعہ کے حوالے سے لکھتا ہے کہ ''اس زمانے میں اکبر پر دنیاوی اقتدار کے ساتھ دینی سیادت پر بھی قبضہ جمانے کی دھن سوار ہو گئی تھی اور اس فعل سے اپنے حق اجتہاد کو مضبوط کرنا چاہتا تھا۔'' بدایونی اکبر کے اس فعل کو اکبر کے بزعم خود سیاسی و مذہبی قائد سمجھنے کی کوشش کے طور پر

دیکھتا ہے جبکہ نظام الدین بخشی اس کو رسول اللہ و خلفائے راشدین کی تقلید کے ضمن تحریر کرتا ہے۔ کیونکہ واقعہ اہم اور جاری روایت سے الگ وانوکھا تھا اس لیے اس کا تذکرہ کرنا نظام الدین بخشی کے لیے ضروری تھا۔ وہ واقعات کو بیان کرنے میں تذبذب کا شکار نہیں ہوتا اور ترتیب زمانی کے ساتھ واقعات کو قلمبند کرتا چلا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کا مقصد ''اکبر بادشاہ کی تمام فتوحات، واقعات اور واردات مختصراً عرض کرنا'' تھا۔

طبقات اکبری اگرچہ تاریخی اغلاط سے خالی نہیں ہے بالخصوص سنین کی غلطیاں کثرت سے موجود ہیں لیکن ان خامیوں کے باوجود بھی یہ ہندوستان کی عمومی تاریخ میں ایک خاص وقعت اور اہمیت کی حامل ہے۔ واقعتا یہ سب سے پہلی تاریخ ہے جو اس موضوع پر تصنیف ہوئی ہے۔ اس کا طرز ترتیب اس درجہ پسندیدہ تھا کہ اس کے بعد آنے والے مورخین نے اسی کا اتباع کیا۔ محمد قاسم فرشتہ نے اپنی مشہور تاریخ بالکل اسی کے نمونے پر لکھی اور اکثر جگہوں پر اس کا حوالہ بھی دیا ہے۔ یہی کتاب ملّا عبدالقادر بدایونی کی 'منتخب التواریخ' کا اہم ماخذ ہے۔ عبدالباقی نہاوندی مصنف 'مآثر رحیمی' نے اس کے تاریخی اقتباسات کثرت سے اپنی تاریخ میں اسی سے اخذ کیے ہیں۔ نعمت اللہ ہروی مصنف 'مخزن افغانی' نے ہمایوں بادشاہ کے زمانے کے تمام واقعات و حالات طبقات اکبری سے ہی اخذ کیے ہیں۔ یہی حال 'مختصر التواریخ، خلاصۃ التواریخ، لب التواریخ' اور بہت سی دوسری تاریخوں کا بھی ہے۔

13.7 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

نظام الدین بخشی کی غیر جانبداری کی وجہ سے طبقات اکبری فارسی کی معتبر ترین تاریخوں میں شمار ہوتی ہے، جو ہمارے معلومات کا ایک قابل قدر ذریعہ ہے۔ اسی لیے سید اطہر عباس رضوی لکھتے ہیں کہ ''نظام الدین احمد میں کڑپن، جانبداری یا اسی طرح کی دیگر خامیاں جو اس کے بہت سے ہم عصروں میں اور اس سے پہلے کے مورخین میں تھیں، بہت کم پائی جاتی ہیں۔''

طبقات اکبری کی زبان سادہ رواں اور آسان ہے۔ اپنی تحریر کو خوبصورت بنانے کے لیے موزوں اشعار سے پیوند کاری بھی جگہ جگہ دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ کیونکہ نظام الدین احمد نے طبقات اکبری کو علاقائی شاہی خاندان کی ساخت پر جسے وہ طبقہ کہتا ہے، تحریر کیا ہے اس لیے ہر طبقہ کا خاتمہ بڑے خشک اور غیر دلچسپ انداز میں ہوا ہے۔ نظام الدین احمد نے سولہویں صدی میں علاقائی تاریخ کو ایک مقام پر تحریر کرنے کے طریقے کو اپنا کر ہندوستان میں تاریخ نویسی کو ایک نیا موڑ فراہم کیا ہے۔ اس کو اس نہج پر لکھی کوئی کتاب نہیں ملی تھی اور طبقات کو لکھنے کا ایک مقصد اس خالی جگہ کو بھرنا اور پورے ہندوستان کی تاریخ کو ایک ساتھ لکھنا بھی تھا۔ اس کا طرز بیانیہ ہے جس میں مصنف کی ذاتی رائے، تنقید، تجزیہ و تبصرہ کا فقدان ہے۔ بنیادی طور پر نظام الدین بخشی مغل انتظامیہ سے تعلق رکھتا تھا اس لیے اس نے اکبر کے عہد اور عہد وسطیٰ کی سیاسی تاریخ کو ہی قلمبند کیا جو اس کے مزاج کے مطابق تھی۔ اسی لیے سیاسی تاریخ لکھنے کے لیے طبقات اکبری ایک ابتدائی نمونہ ہے۔

نظام الدین احمد کی طبقات اکبری عہد وسطیٰ اور اکبر کے عہد کی تاریخ کے لیے ایک قابل اعتماد ماخذ ہے۔ آج کے اصولوں اور پیمانوں کے مطابق نظام الدین احمد کا واقعات کا بیان کرنا بہ نسبت ان کے تجزیہ و تبصرہ کے، قابل اعتراض مانا جا سکتا ہے مگر اس کی زندگی میں یہی

معروضیت کی پہچان تھی۔یعنی بلا کم و کاست واقعات و حالات کو ایمانداری کے ساتھ تحریر کرنااور تجزیہ و تنقیح کے لیے قاری کوآزاد چھوڑنا ہی عمدہ تالیف کی پہچان تھی۔

13.8 کلیدی الفاظ (Keywords)

تزک تزک	:	بادشاہ کا خود نوشت واقعہ، تربیت، قانون، شان
پاشنہ	:	ایڑی
عمومی تاریخ	:	عام تاریخ، عموم کی تاریخ
طبقہ	:	منزل، درجہ
بخشی	:	تنخواہ بانٹنے والا افسر
بیگی	:	سردار، زمانۂ سرداری
تپ محرقہ	:	ایک سخت بخار، ٹائیفائڈ فیور
خاقانیہ	:	بادشاہ وقت
محضر نامہ	:	حاضر ہونے والوں کی فہرست، درخواست، شاہی حاضری، باریابی
اجتہاد	:	کوشش کرنا، ٹھیک راہ تلاش کرنا، فقہ کی اصطلاح میں مقرر اصولوں کے مطابق شرعی احکام کو حل کرنا
مجتہد	:	اجتہاد کرنے والا

13.9 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

13.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. نظام الدین کو کس سال گجرات کا بخشی مقرر کیا گیا؟
2. طبقات اکبری کا سال تالیف کیا ہے؟
3. طبقات اکبری کتنی جلدوں پر محیط ہے؟
4. امیر تیمور نے ہندوستان پر کب حملہ کیا تھا؟
5. نظام الدین احمد کے اجداد کا تعلق کہاں سے تھا؟
6. منتخب التواریخ کے مصنف کا کیا نام ہے؟
7. قران السعدین کس نے تحریر کی ہے؟
8. فتاویٰ جہانداری کے مصنف کا نام بتایئے۔

9. عبادت خانہ کس سن میں تعمیر کیا گیا؟

10. تزک کس زبان کا لفظ ہے؟

13.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. طبقات اکبری کو اور کن دیگر ناموں سے یاد کیا جاتا ہے؟
2. نظام الدین احمد کے والد کن کن بادشاہوں کے دربار سے وابستہ رہے تھے؟
3. نظام الدین احمد کے طبقات اکبری تحریر کرتے وقت معاونین کون کون تھے؟
4. نظام الدین احمد کس کتاب کے مولفین کے پینل کا ایک ممبر تھا؟
5. نظام الدین احمد کی اکبر کے دربار میں ترقی پر ایک نوٹ لکھیے۔

13.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. نظام الدین احمد کے نظریہ تاریخ پر تفصیل سے روشنی ڈالیے۔
2. بحیثیت مورخ نظام الدین احمد کا تعین و تشخیص کیجیے۔
3. کیا طبقات اکبری کو سرکاری تاریخ کے زمرے میں رکھا جاسکتا ہے؟

13.10 مزید مطالعہ کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. Ahmad, Nizamuddin, *Tabaqat-i-Akbari*, Ed. and Trans. vol. 3, Calcutta.
2. Sarkar, Jagdish Narayan, *History of History Writing in Medieval India*, Calcutta,1977.
3. Mukhia, Harbans, *Historians and Historiography during the Reign of Akbar*, New Delhi, 1976.
4. Nizami, K. A., *On History and Historians of Medieval India*, Delhi, 1983.

5. محب الحسن، ہندوستانی دور وسطی کے مورخین، اردو ترجمہ مسرور ہاشمی، دہلی، 1988ء۔
6. بنی احمد سندیلوی، تذکرۂ مورخین، کراچی، 1988ء۔
7. اقتدار حسین صدیقی، اردو میں تاریخ نویسی کی ابتداء، رام پور، 2008ء۔
8. نظام الدین احمد: طبقات اکبری، 3 جلد اردو ترجمہ محمد ایوب قادری، کراچی 91-1990ء۔

اکائی 14۔ عبدالقادر بدایونی

(Abdul Qadir Badauni)

اکائی کے اجزا

14.0 تمہید

14.1 مقاصد

14.2 عبدالقادر بدایونی

14.2.1 ابتدائی تعلیم

14.2.2 دربار میں رسائی

14.2.3 تصنیفات

14.3 منتخب التواریخ بحیثیت تاریخی مآخذ

14.3.1 منتخب التواریخ کی تدوین اور مقاصد

14.3.2 مآخذ

14.4 منتخب التواریخ جدید مورخین کی نظر میں

14.5 عبدالقادر بدایونی کا تاریخی شعور اور طرزِ تاریخ نویسی

14.6 اکتسابی نتائج

14.7 کلیدی الفاظ

14.8 نمونہ امتحانی سوالات

14.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

14.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

14.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

14.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

14.0 تمہید (Introduction)

مغل بادشاہ اکبر کے دور میں فارسی تاریخ نویسی میں زبردست ترقی ہوئی۔ جہاں ایک طرف مغل امراءاور شاہی خاندان کے افراد نے اپنی اپنی یادداشتیں قلم بند کیں، وہیں ابوالفضل نے "اکبر نامہ" لکھ کر مغل ریاست اور اکبر کو دائمی شہرت بخش دی۔ اس کے علاوہ نظام الدین احمد کی "طبقات اکبری" بھی 4-1593ء میں مکمل ہو چکی تھی۔ اس طرح ایک بڑا تاریخی سرمایہ وجود میں آگیا جس سے عہد اکبری کے مختلف پہلوؤں پر صاف روشنی پڑتی ہے۔ ساتھ ہی اس سے اکبر کی علم نوازی اور علم تاریخ میں اہل قلم کی دلچسپی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ مگر واضح رہے کہ اس عہد کی زیادہ تر تاریخیں یا تو بادشاہ کے حکم سے لکھی گئیں یا دربار کی سرپرستی میں۔ چنانچہ، جدید مورخین کے نزدیک، اس تاریخی سرمایہ سے استفادہ کے لیے ناقدانہ نظر اور بڑی توجہ درکار ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ اکبر کے عہد میں ایک اور کتاب لکھی گئی جس کے بغیر اکبر کے دور کو سمجھنا ممکن نہیں۔ اس کا نام ''منتخب التواریخ'' ہے جو ملا عبدالقادر بدایونی نے 6-1595ء میں مکمل کی۔ عبدالقادر بدایونی نے یہ کتاب لوگوں سے چھپا کر لکھی اور اس میں اکبر کو بالخصوص اس کی مذہبی و سماجی پالیسی کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس یونٹ میں ''منتخب التواریخ'' سے بحث ہو گی اور اس بات کا جائزہ لیا جائے گا کہ عبدالقادر بدایونی نے کیوں اور کس طرح مغل دور کی تاریخ مرتب کی۔

14.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- عبدالقادر بدایوانی کے حالات زندگی بالخصوص اس کے علمی اور فکری سفر کو جان سکیں گے۔
- منتخب التواریخ کی تدوین و ترتیب اور اس کے مقاصد سمجھ سکیں گے۔
- 16ویں صدی عیسوی کے سیاسی اور مذہبی حالات کا ایک مختصر جائزہ لے سکیں گے۔
- بدایوانی نے منتخب التواریخ میں تاریخ نویسی کے جن مبادیات کا لحاظ رکھا، انہیں سمجھ سکیں گے۔
- اس کی کتاب کی تاریخی خصوصیات کا جائزہ لے سکیں گے۔

14.2 عبدالقادر بدایوانی (Abdul Qadir Badauni)

عبدالقادر بدایونی، جو ملا عبدالقادر بدایونی بن ملوک شاہ کے نام سے مشہور ہیں، کی پیدائش 1540ء میں بمقام ٹوڈہ میں ہوئی جو راجستھان میں واقع ہے۔ غالباً 1564ء میں بدایوں منتقل ہو گئے اور بقیہ ایام یہیں گزارے اور اسی وجہ سے ''بدایونی'' کہلائے۔ خاندان کے بارے میں زیادہ تفصیلات نہیں ہیں البتہ قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا تعلق ایک خوشحال خاندان سے تھا۔ بدایوانی کے دادا مخدوم اشرف اسلام شاہ سور کے عہد میں ایک فوجی عہدے پر فائض تھے، وہیں ان کے والد ملوک شاہ نے اکبر کے شروعاتی زمانہ میں ایک موقع پر سفارتی ذمہ داری نبھائی تھی۔ لیکن تعجب ہے کہ اس کے باوجود دربار اکبری میں بدایونی کی رسائی ذرا دیر سے ہوئی، جس سے پتہ چلتا ہے کہ خاندان کے

سیاسی تعلقات کا بدایونی کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہونچا۔ یہ صرف بدایونی کی قابلیت اور علمی ذہانت تھی جس نے اس کو اکبر کے دربار میں ایک الگ پہچان عطا کی۔

14.2.1 ابتدائی تعلیم (Early Education)

بدایونی نے عربی قواعد اور اسلامی علوم کی ابتدائی تعلیم اپنے دادا مخدوم اشرف سے حاصل کی۔ 1552ء میں وہ اپنے والد کے ساتھ سنبھل آگئے جہاں انہوں نے مشہور عالم دین اور صوفی شیخ حاتم سنبھلی سے ظاہری اور باطنی علوم میں تربیت لی۔ بدایونی کی تعلیمی زندگی میں ایک اہم موڑ اس وقت آیا جب 1559ء میں وہ آگرہ پہونچے۔ یہاں بدایونی نے شیخ مبارک ناگوری کی شاگردی اختیار کی، جو اس عہد کے ممتاز عالم اور دانشور اور ابوالفضل و فیضی کے والد بزرگوار تھے۔ حالانکہ بدایونی کو آئندہ برسوں میں شیخ مبارک کے مذہبی خیالات سے اختلاف رہا اور اس نے شیخ کی شدید تنقید بھی کی، لیکن شیخ مبارک کی علمی لیاقت اور دانشورانہ بصیرت کی بدایونی نے ہمیشہ تعریف کی۔ بدایونی کا خیال تھا کہ دنیا کی چاہ اور دربار اکبری میں مقام پانے کی طلب نے شیخ مبارک کے خیالات و نظریات میں تبدیلی پیدا کردی تھی۔ آگرہ میں قیام کے دوران (1559-1562) عبدالقادر بدایونی نے صوفیاء سے بھی کسبِ فیض کیا اور ظاہری علوم کے ساتھ ساتھ باطنی اور روحانی علوم میں بھی دست رس حاصل کی۔ عہد اکبری کے صوفیاء سے علم تصوف کی اہم کتابیں جیسے عرائس البیان، عوارف المعارف، فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم وغیرہ پڑھیں۔ اس طرح بدایونی نے شریعت و طریقت دونوں سے واقفیت بہم پہونچائی اور علم تفسیر، نحو و بلاغت، فقہ و اصول فقہ اور سیرت و کلام کے ساتھ ساتھ تصوف کی اہم اور مروج کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اس ضمن میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ بعض جدید مورخین نے بدایونی پر صوفیا مخالف ہونے کا الزام لگایا ہے، جو ایک صریح غلطی ہے۔ بدایونی کی تحریروں میں صوفیاء کے تئیں عقیدت اور طریقت و سلوک کی افضلیت صاف نظر آتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جہاں اس نے علماء سوء کو بے نقاب کیا ہے وہیں دنیا پرست اور ریاکار زاہدوں پر بھی طنز کیے ہیں۔

1562-63 میں دادا اور والد کے انتقال کے بعد خاندان کی مالی ضروریات کے سبب عبدالقادر بدایونی نے تعلیم ترک کر کے ملازمت اختیار کرلی۔ حسین خان، جو 3000 کے مغل منصب دار اور پٹیالی کے جاگیر دار تھے، نے بدایونی کو صدارت کے عہدے پر مامور کیا۔ بحیثیت صدر بدایونی کا فریضہ تھا کہ علماء، صوفیاء اور اہل علم کو دی جانے والی زمینی عطیات کا انتظام سنبھالیں اور غرباء کا خیال رکھیں۔ 1574ء تک بدایونی حسین خان کی ملازمت میں رہے اور پھر سب چھوڑ کر اکبر کے دربار میں پہونچے۔ بدایونی نے ملازمت ترک کرنے کے اسباب کا ذکر نہیں کیا ہے البتہ حسین خان کی نیک نیتی، خوش اخلاقی اور جذبہ جہاد کی کھل کر تعریف کی ہے۔

14.2.2 دربار میں رسائی (Access to Imperial Court)

جمال خان قورچی اور حکیم عین الملک کی وساطت سے عبدالقادر بدایونی 1574ء میں اکبر کے دربار میں پہونچے اور بہت جلد اکبر کی نظر میں آگئے۔ اولاً بدایونی اپنی خوش الحانی اور قرأت کے سات طریقوں سے واقفیت کے سبب شاہی امام مقرر ہوئے اور کی ذمہ داری بدھ کے دن نمازوں کی امامت کرنا تھا۔ لیکن بدایونی کے اصلی جوہر دربار کے مذہبی مباحثوں میں کھلے۔ اکبر بدایونی کی علمی ذہانت، جوانی کے جوش اور

دوران بحث اس کی تیزی اور تیور سے بہت متاثر ہوا۔ چنانچہ اکبر نے بدایونی کو دربار میں ہونے والی فقہی اور علمی بحث میں نہ صرف شامل کیا بلکہ خوب حوصلہ افزائی کی۔ (بدایونی نے لکھا ہے کہ اس کو دربار اکبری میں عزت و مقام اس لیے حاصل ہوا کیوں کہ ان دنوں علم کی قدر تھی)۔ 1575ء میں جب عبادت خانہ قائم ہوا، بدایونی نے بڑی مستعدی اور جوش کے ساتھ شرکت کی اور بقول اس کے ''اس نے خود فریب علماء کو جو صرف اپنی جھوٹی علمیت کا ڈھونگ کرتے تھے، بحث میں چت کر دیا اور ان کا کھوکلا پن واضح کر دیا۔''

دربار میں ملازمت کے بعد ابوالفضل کی طرح بدایونی کو بھی شروع میں 20 کا منصب دیا گیا اور اس کے عوض بطور تنخواہ جاگیر بھی عطا کی گئی۔ مغل دستور تھا کہ ہر عہدیدار کو ایک منصب دیا جاتا تھا (منصب نظام کی شروعات اکبر نے کی تھی) جس کے تحت اسے متعینہ مقدار میں گھوڑ سوار فوجی اپنی دیکھ ریکھ میں رکھنے ہوتے تھے۔ لیکن عبدالقادر بدایونی اس فوجی اور مالی الجھن میں نہیں پڑنا چاہتا تھا چنانچہ اس کی درخواست پر اسے 1000 بیگھا زمین بطور مدد معاش عطا کر دی گئی (صاحب مدد معاش پر فوجیوں کی دیکھ ریکھ کی کوئی ذمہ داری نہیں تھی)۔ حالانکہ بعد میں بدایونی کو اس بات کا بہت افسوس ہوا کیوں کہ عمر بھر اس کے عہدہ اور آمدنی میں کوئی اضافہ نہیں ہوا بلکہ بعض موقعوں پر اس کی مدد معاش میں کمی بھی ہوئی اور اپنی مالی تنگدستی کی اس کو تاعمر شکایت رہی۔ اس کے برعکس بدایونی کے جیتے جی ابوالفضل 20 کے منصب سے ترقی کر کے 2000 کے منصب تک پہونچ چکا تھا جس کے نتیجہ میں اس کے وقار اور آمدنی میں بھی اضافہ ہوا تھا۔

جب اکبر نے دربار میں سنسکرت مذہبی اور غیر مذہبی کتابوں کا ترجمہ فارسی میں کروانا شروع کیا، عبدالقادر بدایونی اس علمی کام میں پیش پیش رہا۔ یہ ایک علمی کوشش تھی جس کے پیچھے سیاسی جذبہ کارفرما تھا۔ ایک طرف تو اکبر کا مقصد یہ تھا کہ ترجمہ کے ذریعہ زبان و مذہب کی تفریق سے اوپر اٹھ کر قدیم علم و فلسفہ سے واقفیت حاصل کی جائے جس کے نتیجہ میں مسلمانوں اور ہندؤں کے درمیان ہم آہنگی کے مزید مواقع پیدا ہو سکے۔ وہیں دوسری طرف اکبر قدیم ہندو مذہبی کتابوں میں موجود بادشاہت اور حکمرانی کے تصورات کو اپنے لیے موزوں بنانا چاہتا تھا تاکہ اس کی حکمرانی کا دعویٰ اور اقتدار کا جواز وسیع بنیادوں پر قائم ہوں جس میں اسلامی اور ہندو دونوں عناصر شامل ہوں۔ اکبر کے حکم پر عبدالقادر بدایونی نے سنگھاسن بتیسی، راماین اور مہابھارت کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ (بدایونی کو سنسکرت زبان کا علم نہیں تھا۔ یہ ترجمہ برہمن پنڈتوں کے تعاون سے کیا گیا)۔ اس کے علاوہ تاریخ الفی، جس کی تصنیف اکبر کے حکم سے 1582ء میں شروع ہوئی، کی ترتیب میں بھی بدایونی کا تعاون رہا۔ تاریخ کشمیر، غالباً کلہن کی راج ترنگی جس کا فارسی ترجمہ ملا شاہ محمد کے ذریعہ کیا جا چکا تھا، کو قدیم اور نامانوس فارسی سے آسان فارسی میں منتقل کیا۔ ساتھ ہی عربی زبان کی ضخیم کتابیں، جامع رشیدی اور معجم البلدان، کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ یہ دلچسپ ہے کہ اکبر اور بدایونی کے درمیان مذہب کے تئیں نظریاتی اختلافات کے باوجود (اکبر نے ایک موقع پر بدایونی کو متعصب اور کٹر مذہبی تک کہا) بدایونی کی علمیت، زبان دانی اور ذہانت پر اکبر کو بھی آخری دور تک اعتماد تھا اور شاید یہی وجہ ہے کہ تاعمر بدایونی اکبر کے دربار سے وابستہ بھی رہا اور علمی سرگرمیوں میں مصروف بھی۔

14.2.3 تصنیفات (Writings)

بدایونی کی سب سے پہلی تصنیف ''کتاب الاحادیث'' تھی جو اس نے 1578ء میں اکبر کے حضور پیش کی۔ اس کتاب میں جہاد کی فضیلت اور فن تیر اندازی سے متعلق چالیس احادیث اور ان کی تشریح دی گئی تھی۔ یہ کتاب اب نامعلوم ہے۔ بدایونی کی دو کتابیں ہم تک پہونچی ہیں، ایک "نجات الرشید" اور دوسرے "منتخب التواریخ۔'' نجات الرشید، جو 92-1591 میں لکھی گئی، ایک اخلاقی کتاب ہے جس میں بنیادی طور پر صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے بحث کی گئی ہے، حالانکہ ضمناً اس میں تصوف اور فلسفہ کے مضامین بھی زیر بحث آئے ہیں۔ اس کتاب کی تصنیف کا محرک یہ تھا کہ مسلمان اپنی مذہبی اور سماجی زندگی میں گناہوں سے اجتناب کریں تاکہ ایک مثالی اسلامی معاشرہ (جیسا کہ بدایونی چاہتا تھا) کی تشکیل ہو سکے۔ دلچسپ یہ ہے کہ عبدالقادر بدایونی اس کتاب کے اصلی خالق نہیں ہیں۔ نجات الرشید لکھنے کا خیال سب سے پہلے نظام الدین احمد کو آیا جنہوں نے ''طبقات اکبری'' کے نام اکبر کے عہد کی تاریخ لکھی ہے۔ لیکن چونکہ نظام الدین احمد یہ کام مکمل نہ کر سکے، انہوں نے اپنا جمع کیا مواد بدایونی کے حوالے کر دیا اس درخواست کے ساتھ کہ بدایونی اس کام کو انجام تک پہونچائیں۔ نجات الرشید کی اہمیت دو پہلوؤں سے زیادہ ہے۔ اول یہ کہ حالانکہ اس میں اکبر کے دور کے تاریخی حالات کا ذکر نہیں ہے، لیکن اس دور کی مذہبی صورت حال کو سمجھنے کے لیے بہت مفید ہے۔ دوسرے یہ کہ کتاب میں مختلف مذہبی اور سماجی موضوعات پر بدایونی کے ذاتی خیالات اور نظریات موجود ہیں ،اس طرح یہ کتاب بدایونی کے ذہن، اس کے علمی ذوق اور مذہبی سوچ کا بہترین آئینہ ہے۔

14.3 منتخب التواریخ بحیثیت تاریخی مآخذ (Muntakhab-al-Tawarikh as a Historical Source)

منتخب التواریخ بدایونی کی سب سے مشہور اور یقیناً اکبر کے دور کی اہم ترین تاریخوں میں سے ایک ہے۔ یہ کتاب 1596ء میں مکمل ہوئی اور تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد میں غزنوی حکومت سے ہمایوں کے عہد تک کی تاریخ درج ہے، جبکہ دوسری جلد میں مکمل طور پر اکبر کے دور کا تذکرہ ہے جس میں اکبر بادشاہ کے چالیس سالہ دور حکومت کا احاطہ کیا گیا ہے۔ تیسری جلد میں 16 ویں صدی عیسوی کے علماء، صوفیاء، شعراء اور حکماء کا ذکر ہے۔ یہ ایک تذکرہ ہے جس میں اکثر ان ہم عصر اکابرین کا ذکر ہے جن سے یا تو بدایونی کی ملاقات ہوئی تھی یا بدایونی نے ان کی بابت سن رکھا تھا۔

14.3.1 منتخب التواریخ کی تدوین اور مقاصد

(Compilation and Objectives of Muntakhab-al-Tawarikh)

1591ء میں تاریخ کشمیر کے ترجمے سے فراغت کے بعد بدایونی کے دل میں منتخب التواریخ کی تصنیف کا خیال از سر نو پیدا ہوا۔ علم تاریخ سے گہری انسیت کے باعث ہندوستان کی تاریخ لکھنے کا ارادہ بدایونی کو ایک زمانے سے تھا اور وہ چاہتا تھا کہ ابتدائے اسلام سے اس کے عہد تک کے حالات اختصار کے ساتھ تحریر میں آجائیں تاکہ ایک ایسا تاریخی مجموعہ تیار ہو جائے جس میں ہر بادشاہ کا اجمالاً تذکرہ ہو اور جو صاحبان علم کے لیے ہدایت کا سامان ہو۔ لیکن یہ ارادہ سالوں تک ٹلتا رہا۔ بدایونی کے مطابق اس تاخیر کی وجہ اس کی مالی مشکلات، ذریعہ معاش کی غیر یقینی

صورت حال اور رشتہ داروں اور دوستوں کی جدائی تھی۔ 1590ء کی دہائی میں جب اسے ذرا سکون و یکسوئی حاصل ہوئی، تو اس نے اپنی دیرینہ خواہش کو عملی جامہ پہنایا۔

منتخب التواریخ کی تصنیف کا بنیادی مقصد، جس کا ذکر بدایونی نے جابجا اپنی تحریروں میں کیا ہے (، کہیں پوشیدہ طور پر اور کہیں واضح انداز میں)، یہ ہے کہ اکبر کے عہد کے تاریخی حقائق اور اصلی و سچی صورت حال سے لوگوں کو آگاہ کیا جائے۔ بدایونی کی نظر میں یہ تاریخ نویسی کا بھی تقاضہ تھا اور دین کی حمایت اور طرفداری بھی، کیوں کہ عہد اکبری میں دین اسلام کو خطرہ لاحق تھا۔ ان مقاصد کو بدایونی نے مندرجہ ذیل الفاظ میں یوں بیان کیا ہے:

> میں کسی طمع اور توقع کے بغیر اپنے بعد آنے والوں کے لیے ایک ہدیہ چھوڑنا چاہتا ہوں تاکہ وہ لوگ جو ہمارے زمانہ کے حالات و حقائق کے طالب ہوں اس سے استفادہ کر سکیں۔ اس انتخاب کی ترتیب کا اصلی سبب بھی یہی ہے کہ اس زمانہ میں احکام دین میں جس طرح تبدیلی کی جارہی ہے، اس کی ان ہزار سالوں میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ چنانچہ ہر وہ شخص جو دو لفظ جوڑ لینے کی استطاعت رکھتا ہے، صاحبان اقتدار کی خوشامد یا دین سے ناواقفیت یا اصل حالات سے لاعلمی کی بنا پر یا دوسرے فاسد اغراض کی خاطر حق پوشی سے کام لینے لگا ہے۔ اس لیے میں نے، جو ان معاملات سے بخوبی واقف ہے بلکہ اس گور کو پھندے میں مبتلا رہا ہے، ضروری سمجھا کہ اپنے مشاہدات اور روایات کو جو آنکھوں دیکھے حقائق ہیں، ظن و تخمین کا نتیجہ نہیں، قلم بند کر دوں۔

شاید بدایونی کو اس حقیقت نگاری کا انجام پتہ تھا۔ چنانہ اس نے منتخب التواریخ چھپ کر لکھی۔ اس کا علم نہ تو اکبر کو تھا اور نہ ہی بدایونی کے اہل خانہ کو۔ مرآۃ العالم کے مصنف بختاور خان کے مطابق منتخب التواریخ جہانگیر کے عہد میں پہلی بار منظر عام پر آئی اور بازاروں میں خوب فروخت ہو رہی تھی۔ جہانگیر کو جب اس کتاب کا علم ہوا، تو اس نے بدایونی کے بیٹوں کو دربار میں بلایا اور اس کے بارے میں تفتیش کی۔ بدایونی کے بیٹوں نے قسم کھا کر اپنی لاعلمی کا اظہار کیا اور بادشاہ کو بتایا کہ انہیں بھی اس کتاب کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ جہانگیر نے منتخب التواریخ کی خرید و فروخت پر پابندی لگادی اور تمام نسخے ضبط کر لیے کیوں کہ اس میں اکبر کے خلاف سخت تنقید کی گئی تھی۔ لیکن قسمت یہ کہ جہانگیر کی تمام کوششوں کے باوجود منتخب التواریخ کے چند نسخے محفوظ رہ گئے۔

14.3.2 مآخذ (Sources)

عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ کے شروع میں یہ وضاحت کی ہے کہ منتخب التواریخ کی تالیف میں اس نے دو مآخذ سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ ایک نظام الدین احمد کی "طبقات اکبری" اور دوسرے یحیٰ احمد سرہندی کی تاریخ مبارک شاہی۔ 93-1592ء میں مکمل ہوئی "طبقات اکبری" عہد وسطیٰ کے ترک حکمرانوں کی عمومی تاریخ ہے جس میں محمود غزنوی سے اکبر تک کے حالات کا بیان ہے۔ "تاریخ مبارک" شاہی حالانکہ عہد وسطیٰ کی عمومی تاریخوں میں سے ایک ہے لیکن اس کی اہمیت اس وجہ سے زیادہ ہے کیوں کہ یہ عہد وسطیٰ کے سید

خاندان کی واحد ہم عصر تاریخ ہے جو تغلق خاندان کے آخری عہد اور سید خاندان کے سلطانوں کے حالات پر مشتمل ہے۔ بدایونی نے اعتراف کیا ہے کہ جلد اول میں دہلی سلاطین کی تاریخ کا ایک بڑا حصہ ان دو مآخذ پر مبنی ہے، بلکہ ان کا ''خلاصہ'' ہے۔ البتہ بعض مقامات پر بدایونی نے حذف واضافہ سے بھی کام لیا ہے۔ کیا یہ "حذف واضافہ" صرف برائے نام ہے اور محض اختصار کی غرض سے کیا گیا ہے یا اس کی وجہ سے دہلی سلاطین کے تاریخی بیانیہ پر بھی کوئی معنی خیز اثر پڑا ہے؟ یہ ایک اہم سوال ہے جس کا جائزہ آئندہ صفحات میں لیا جائے گا۔ وہیں دوسری طرف اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ان دو مآخذ کے علاوہ بدایونی نے بعض دوسرے مآخذ سے بھی مواد لیا ہے، گرچہ منتخب التواریخ میں صراحتہً ان کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ضیاءالدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی سے بدایونی کی واقفیت ثابت ہے اور بعض واقعات کی تفصیل میں تاریخ فیروز شاہی کا اثر صاف نظر آتا ہے۔ علاءالدین خلجی کی مارکیٹ پالیسی ہو یا اس کا نظریہ حکمرانی، غیر اشرافیہ طبقہ کے بارے میں بلبن کا رویہ ہو یا سلطان محمد تغلق کی حقیقت پسندی اور فلسفہ نوازی، یہ مضامین بدایونی نے یقینی طور پر تاریخ فیروز شاہی سے اخذ کیے ہیں۔ اس کے علاوہ امیر خسرو اور امیر حسن سجزی کی مثنویاں بھی جابجا نقل ہوئی ہیں۔

جہاں تک اکبر کے دور کا ذکر ہے، بدایونی لکھتا ہے کہ اکبر کے دور کی تاریخ نظام الدین احمد کی طبقات اکبری سے ماخوذ ہے اور اس نے صرف دو سالوں کی تاریخ رقم کی ہے، یعنی 94-1593 سے 96-1595 تک کیوں کہ نظام الدین احمد کی وفات 1594ء میں ہو چکی تھی اور طبقات اکبری میں صرف 94-1593ء تک کے حالات کا احاطہ کیا گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ بدایونی نے یہاں انکساری اور کسر نفسی سے کام لیا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ بدایونی نے اکبر کے عہد کی تاریخ مرتب کرنے میں نظام الدین احمد سے استفادہ کیا ہے جیسا کہ بعض مقامات پر طبقات اکبری کے حوالے سے پتہ چلتا ہے اور ممکن ہے کہ بالخصوص ابتدائی مغل عہد کی تاریخ اور اکبر کے ابتدائی برسوں کے حالات کے سلسلے میں بدایونی کا انحصار طبقات اکبری پر زیادہ ہو۔ لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اکبر کے دربار میں پہونچنے کے بعد سے بدایونی کی تاریخ کا اہم ماخذ خود اس کا مشاہدہ اور تجربہ ہے۔ خاص طور سے اکبری دور کے مذہبی، سماجی اور تہذیبی پہلوؤں پر جو تفصیلات پیش کی گئی ہیں، ان کا سرچشمہ بدایونی کا ذاتی مشاہدہ ہے۔ اکبری دربار کے ایک اہم ممبر ہونے کی حیثیت سے اور فوجی مہموں اور سیر وسیاحت میں درباری قافلہ کے ہمراہ ہونے کے سبب بدایونی کو یہ سہولت اور موقع میسر تھا کہ وہ عینی مشاہدات کو بیان کر سکے۔ طبقات اکبری کے علاوہ بدایونی کو ابوالفضل کی "اکبر نامہ" کے مندرجات سے بھی واقفیت تھی جیسا کہ بعض مقامات پر اکبر نامہ کے حوالے سے پتہ چلتا ہے۔ (یہ بات ذہن میں رہے کہ بدایونی کی زندگی میں اکبر نامہ کی تالیف مکمل نہیں ہوئی تھی البتہ جیسے جیسے اس کے حصے مکمل ہوتے جاتے تھے، امراء اور دربار کے روساء میں تقسیم کر دیے جاتے تھے تاکہ ان کی رائے لی جا سکے۔ اکبر نامہ بالآخر 1596ء میں اکبر کو پیش کی گئی جس میں 1602ء تک بدستور اضافہ کیا جاتا رہا۔) قرین قیاس یہ ہے کہ بدایونی کے پاس کوئی بیاض تھی جس میں وہ واقعات وحالات کا اندراج رکھتا ہوگا۔ یہ امکان اس لیے بھی قوی ہے کیوں کہ بعض جگہوں پر بدایونی نے واقعات کی تاریخ (سن اور مہینہ) کے حوالے سے نظام الدین احمد کی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے اور اس کی وجہ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ مزید برآں خود بدایونی کو تاریخ لکھنے کا ارادہ پہلے سے تھا جو اس کی مصروفیت اور پریشانیوں کی وجہ سے ادھورا رہ گیا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شاید بدایونی کے پاس بطور یادداشت کوئی ڈائری تھی جس میں وہ واقعات کو قلم بند کرتا تھا

اور جب بالآخر اسے فرصت ملی تو اس نے اپنے اندراجات اور مشاہدات سے ضرور فائدہ اٹھایا ہوگا۔

تیسری جلد میں جن علماء، مشائخ اور حکماء کا ذکر ہوا ہے، ان کے سوانحی حالات بیشتر بدایونی کے اپنے تجربے اور تجزیے پر مبنی ہیں۔ البتہ شعراء کے بیان میں عبدالقادر بدایونی نے "نفائس المآثر" سے قدرے استفادہ کیا ہے۔ نفائس الماثر شعراء کا ایک تذکرہ ہے جسے میر علاؤالدولہ قزوینی نے مرتب کیا تھا اور اکبر کو پیش کیا تھا۔ میر علاؤالدولہ قزوینی کا تعلق قزوین کے علمی خاندان سے تھا جو شاہ طہماسپ کے عہد میں مسلکی تعصب کے سبب ایران سے ہجرت کر کے مغل دربار میں پہونچے تھے۔ بدایونی نے منتخب التواریخ میں امراء طبقہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ نظام الدین احمد عہد اکبری کے امراء کا تذکرہ طبقات اکبری میں کر چکے تھے اور دوسری یہ کہ بدایونی کی نظر میں عہد اکبری کے امراء بھی مغل دربار کی مذہبی اور اسلام مخالف سرگرمیوں میں برابر کے شریک تھے چنانچہ وہ کسی سوانحی تذکرے کے لائق نہیں تھے۔

14.4 منتخب التواریخ جدید مورخین کی نظر میں

(Muntakhab-al-Tawarikh in the View of Modern Historians)

مغل عہد کی تاریخ لکھنے والے جدید اسکالرس نے عبدالقادر بدایونی کی ایک انتہائی منفی تصویر پیش کی ہے۔ جدید تاریخ نویسی میں بدایونی کو عام طور پر ایک ''کٹر مذہبی''، ''متعصب''، ''جانبدار'' اور ''عدم رواداری ملا'' کے کردار میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ چونکہ بدایونی نے اکبر کے مذہبی اور سماجی نظریات اور پالیسیوں پر سخت نکتہ چینی کی ہے اور چونکہ جدید تاریخ نویسی میں اکبر کے ''لبرل'' خیالات واقدامات کو سراہا گیا ہے، اس لیے جدید مورخین کے لیے بدایونی کے بارے میں اس طرح کا منفی رویہ رکھنا فطری تھا۔ ویسے یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ ابوالفضل اور اکبر کے مقابلے میں عبدالقادر بدایونی ایک مذہبی اور قدامت پسند عالم کے طور پر ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بدایونی کے مذہبی، سماجی اور سیاسی نظریات پر روایتی مذہب کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ لیکن حالیہ تحقیقات نے بدایونی کے حوالے سے اس طرح کی منفی تصویر کشی (negative representation) اور جانبدارانہ رائے زنی (judgmental evaluation) پر سوال اٹھائے ہیں۔ حالیہ مورخین کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ ابوالفضل اور عبدالقادر بدایونی کو دو متضاد اور متصادم خاکے (binary framework) میں پیش کرنا تاریخی طور پر درست نہیں، جس میں اول کو ''لبرل'' اور دوم کو ''مذہبی کٹر'' تصور کیا جائے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ اصطلاحات اور تصورات جدید دور کی پیداوار ہیں اور کسی بھی حال میں ان کا استعمال مغل عہد کے تناظر میں نہیں کیا جاسکتا۔ مزید برآں اس متضاد اور متصادم نقطہ نظر کے سبب بدایونی کے نظریات کا تنقیدی مطالعہ بھی نہیں ہو پایا۔ مورخین کی نظر میں بدایونی کی حیثیت صرف ایک مذہبی تعصب پرست مؤرخ کی بن کر رہ گئی اور اس طرح اس کے مذہبی، سماجی اور سیاسی نظریات تحقیق و تنقید کے دائرے سے باہر رہ گئے۔

بدایونی کی شخصیت اور افکار کتنے پیچیدہ ہیں، اس کا اندازہ برٹش مؤرخ ہنری بلا کمن کے 1869ء میں لکھے ہوئے ایک مضمون سے

ہوتا ہے جس میں اس نے بدایونی کو عہد وسطیٰ کے مشکل ترین مورخین میں سے ایک مانا ہے۔ 1968ء میں محمد مجیب نے اپنے ایک مقالہ میں بدایونی کی تاریخی اہمیت اور اس کے افکار کی جدت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''بدایونی کو صرف اس بنیاد پر مذہبی تشدد پسند، غیر احسان مند اور کم ظرف نہیں سمجھنا چاہئے کہ اس نے اکبر اور اس کے حامیوں کی تنقید کی تھی۔'' بدقسمتی سے بدایونی پر جدید عہد میں زیادہ تحقیق نہیں ہوئی۔ 1970ء کی دہائی میں ہندوستانی مورخین نے بدایونی کے افکار اور تاریخ نویسی پر سنجیدگی سے غور کرنا شروع کیا۔ مشہور مؤرخ ہربنس مکھیا نے 1976ء میں چھپی اپنی کتاب Historians and Historiography during the Reign of Akbar میں بدایونی پر ایک باب لکھا جس میں بالتفصیل پہلی بار بدایونی کے طرز تاریخ نویسی اور مبادیات پر بحث کی۔ حالانکہ ہربنس مکھیا نے بدایونی کے سیاسی اور مذہبی خیالات کا جائزہ نہیں لیا، تاہم ان کی تحقیق نے بدایونی کو پھر سے موضوع بحث بنادیا۔ 1987ء میں بدایونی پر پہلی خصوصی کتاب فوزیہ زرین عباس نے لکھی جس میں بدایونی کی سوانح اور افکار پر روشنی ڈالی۔ فوزیہ عباس کی کتاب بہت حد تک ہربنس مکھیا کے تاریخی مفروضات سے متاثر تھی۔ چنانچہ ہربنس مکھیا کی تحقیق کی کمیاں فوزیہ عباس کی کتاب میں بھی در آئیں۔

گزشتہ دو دہائیوں میں بدایونی کے کردار اور منتخب التواریخ کی نوعیت اور تاریخی افادیت میں از سر نو دلچسپی پیدا ہوئی ہے۔ ان مورخین میں اشتیاق احمد ظلی، اظفر معین اور علی انوشہر قابل ذکر ہیں جنہوں نے بدایونی سے متعلق نئے رجحانات کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اس دلچسپی کی ایک وجہ تاریخ نویسی کے رجحان میں ہونے والی تبدیلی بھی ہے۔ حالیہ دنوں میں مورخین کی دلچسپی فکری Intellectual History تاریخ میں بڑھی ہے جس کے تحت ماضی میں پیش کیے گئے نظریات وافکار کو نئے زاویہ سے دیکھنے کی کوشش ہو رہی ہے۔

14.5 عبدالقادر بدایونی کا تاریخی شعور اور طرز تاریخ نویسی

(Abdul Qadir Badauni's Perception of History and Historiography)

منتخب التواریخ میں بدایونی نے اپنی تصنیف کے مقصد پر روشنی ڈالتے ہوئے واضح طور پر بیان کیا ہے کہ اس کا مقصد عہد اکبری کی حقیقت کو دنیا اور بعد میں آنے والی نسلوں کے سامنے لانا ہے کیوں کہ دوسرے ہم عصر مورخین نے تاریخ کے ساتھ بے انصافی کی ہے۔ ظاہر ہے کہ بدایونی کا اشارہ اکبر کے دور میں ہونے والی مذہبی اور ثقافتی تبدیلیوں کی طرف ہے جس کی وجہ سے، اس کی نظر میں، مذہب اور اسلامی تعلیمات کو شدید نقصان پہونچا تھا۔ چنانچہ بدایونی نے منتخب التواریخ میں اکبر کے ان اقدامات کی تنقید کی جو اس کے نزدیک غیر اسلامی اور روایتی مذہبی اقدار کے مخالف تھے۔ یہاں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ کیا فی الحقیقت اکبر کی اصلاحات غیر اسلامی تھیں۔ لیکن تاریخ نویسی کے طریق کار اور مبادیات پر بحث کے تناظر میں یہ سوال بر محل نہیں ہے۔ اہم یہ ہے کہ بدایونی نے اپنے اس تاثر اور تجزیہ کو تاریخ اور بیانیہ کا قالب کیسے پہنایا اور ماضی کے حالات بیان کرتے ہوئے ان تاثرات نے بدایونی کی تاریخ نویسی میں کیا تبدیلیاں پیدا کیں۔ اس حصہ میں اسی اہم پہلو پر بحث ہوگی۔

بدایونی کا تاریخی شعور ماضی کے واقعات کی معنویت میں پوشیدہ ہے یعنی وہ ماضی اور حال میں معنی اور مفہوم تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے نزدیک تاریخ محض واقعات کی ترتیب کا نام نہیں ہے بلکہ ان میں چھپے ہوئے معانی کی تفہیم کا نام ہے۔ چنانچہ جہاں دوسرے مورخین، جیسے نظام الدین احمد، صرف بالترتیب واقعات کو بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں، بدایونی حالات کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ ان پر تبصرہ بھی کرتا جاتا ہے۔ گویا واقعات پر بدایونی کے مشاہدات خود بیانیہ کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اس طرح قاری کے ذہن میں صرف ماضی کے واقعات کا نقش نہیں ابھرتا بلکہ ان کی تاریخی اہمیت اور نفسیاتی اطلاق بھی مرتب ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر جب اکبر نے لگان وصول کرنے کے طریقوں میں اصلاح کی غرض سے کروڑیوں کا تقرر کیا تاکہ ریاست کی قابل کاشت زمینوں کی از سر نو پیائش اور پیداوار کا صحیح تخمینہ لگایا جاسکے۔ بدایونی نے اس امر کی تفصیلات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی ناکامی پر بھی سخت تبصرہ کیا ہے۔ چنانچہ اس نے کروڑیوں کے کرپشن، زیادتی اور ظلم و جبر کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور اس اصلاح کے سبب کسانوں اور زمینداروں کو پیش آنے والی مشکلات پر بھی توجہ دلائی ہے۔

ماضی کے واقعات میں معنویت ڈھونڈنے یا پیدا کرنے کی سب سے عمدہ مثال اور نمونہ منتخب التواریخ کی پہلی جلد ہے۔ یہ ذکر کیا جاچکا ہے کہ پہلی جلد میں دہلی سلاطین کی تاریخ "طبقات اکبری" اور "تاریخ مبارک شاہی" سے ماخوذ ہے بلکہ ان کی تلخیص ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید مورخین کے ایک طبقہ نے منتخب التواریخ کی پہلی جلد کا مطالعہ اور تجزیہ فضول سمجھا کہ اس سے بدایونی کے تصورات یا طرز تاریخ نویسی کی بابت کوئی نئی بات نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ بدایونی نے دہلی سلاطین کی تاریخ لکھنے کی ضرورت ہی کیوں محسوس کی جبکہ اس عہد کی مفصل تاریخیں پہلے سے موجود تھیں۔ اس کا جواب خود بدایونی کے بیان میں چھپا ہوا ہے جب وہ کہتا ہے کہ اس نے اپنی طرف سے حذف و اضافہ سے بھی کام لیا ہے۔ مطلب یہ کہ طبقات اکبری اور تاریخ مبارک شاہی سے مواد لیتے ہوئے حذف و اضافہ کے ذریعہ بدایونی نے دہلی سلطنت کی تاریخ میں تبدیلی کی ہے اور اس طرح ایک مختلف مگر معنی خیز ماضی کی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو اس کے نظریات اور تصورات کے مطابق ہو۔ مثال کے طور پر علاؤالدین خلجی اور علاؤالملک کے درمیان کا وہ مکالمہ بہت مشہور ہے جس میں سلطان ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالنے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ نظام الدین احمد نے طبقات اکبری میں، جو کہ بدایونی کا ماخذ ہے، اس مکالمے کا ذکر کرتے ہوئے صرف اتنا لکھا ہے کہ علاؤالملک نے اپنی ذہانت سے سلطان کو ایسا قدم اٹھانے سے باز رکھا۔ دوسری طرف بدایونی نے جب اس گفتگو کا ذکر کیا تو علاؤالملک کے ذریعہ دیے گئے دلائل کا تفصیل سے ذکر کیا۔ بدایونی لکھتا ہے کہ علاؤالملک نے کہا کہ "دین کسی بندے کے ایجاد کرنے سے نہیں بنتا۔ یہ تو صرف اللہ ہی کی طرف سے نازل ہوتا ہے۔ پھر اس کے ساتھ معجزوں کا ہونا بھی ضروری ہے۔ بغیر اس کے صرف دولت اور قوت کے زور سے دین کو بدل دینا ممکن نہیں۔" سوال یہ ہے کہ بدایونی نے اپنے بیانیہ میں علاؤالملک کے مشورے کا اضافہ کیوں کیا جو طبقات اکبری میں موجود نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بدایونی کی نظر میں 16 ویں صدی میں اکبر بھی اپنے مذہبی نظریات کی مدد سے اسلام کی تعلیمات اور عقائد میں چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ اس طرح علاؤالملک کا مشورہ صرف سلطان علاؤالدین خلجی کے مناسب حال نہیں تھا بلکہ یہ اکبر کے مذہبی اقدامات کے عدم جواز کی بھی دلیل بن گیا۔ اس مثال سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ کس طرح بدایونی نے حذف و اضافہ کے ذریعہ ماضی کے

واقعات میں ایک نیا مفہوم پیدا کر دیا جو عین اس کے خیالات کے مطابق تھا۔

بحیثیت مؤرخ بدایونی کو واقعات کی ترتیب (chronology) کا خیال تو ضرور ہے اور چند مقامات پر اس نے نظام الدین احمد کی غلطیوں کی نشاندہی بھی ہے، لیکن بدایونی ترتیب واقعات کا سخت پابند نہیں ہے۔ بعض اوقات وہ ترتیب کا بالکل لحاظ نہیں رکھتا۔ چونکہ منتخب التواریخ لکھنے کے پیچھے بدایونی کا مقصد لوگوں کو عہد اکبری کی سچائی سے آگاہ کرنا اور حقیقت کو بے نقاب کرنا ہے، اس لیے اگر اس سلسلہ میں کبھی کبھی ترتیب کی پابندی سے انحراف بھی کرنا پڑے تو وہ قابل قبول ہے۔ گویا بدایونی کی نظر میں مواد (content) کی تفہیم زیادہ اہم ہے نہ کہ اس کی ساخت (form)۔ اس کی سب سے عمدہ مثال عبادت خانہ کے مباحثے اور دربار اکبری میں ہونے والی مذہبی تبدیلیاں ہیں جن کو بدایونی نے یکجا اس طرح لکھا ہے کہ اس سے مذہبی ماحول کا پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے، حالانکہ یہ واقعات مختلف اوقات میں پیش آئے تھے۔

منتخب التواریخ میں، بالخصوص دوسری جلد میں، بدایونی کا انداز منفی ہے۔ دوسرے لفظوں میں بدایونی اکبر کے دور کا معروضی (Objective) جائزہ نہیں لیتا بلکہ اس کا بیانیہ (Narrative) انتہائی ذاتی (Personal) جذباتی (Emotional) اور تاثراتی (Impressionistic) ہے۔ اور غالباً یہی بدایونی کے طرز تاریخ نویسی کی سب سے اہم اور نمایاں خصوصیت بھی ہے۔ چونکہ بدایونی کی تاریخ میں شخصی تاثرات اور ترجیحات کا غلبہ ہے، اس لیے ہر اس شخص کے تئیں اس کا رویہ منفی ہے جس سے اس کو اختلاف ہے۔ بدایونی اپنی تعریف اور تنقید دونوں میں بے باک ہے۔ چنانچہ وہ ابوالفضل، فیضی اور شیخ مبارک پر صرف فقرے کسنے پر اکتفا نہیں کرتا کہ انہوں نے اکبر کے نظریات کو ایک فکری اساس فراہم کی، بلکہ وہ ذاتی طور پر ان کے کردار اور فطرت پر بھی حملہ کرتا ہے۔ اسی طرح وہ شیخ عبدالنبی اور عبداللہ سلطانپوری کی صرف اس لیے مذمت نہیں کرتا کہ ان کی علمی بدیانتی نے اکبر کی گمراہی کے لیے راستہ ہموار کیا بلکہ وہ ان کے کردار کے دہرے پن کی بھی تنقید کرتا ہے جس میں لالچ، دولت سے محبت اور مذہبی ریاکاری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ تاریخی کرداروں کا تجزیہ بدایونی کی تاریخ میں کثرت سے موجود ہے۔ اس سے منتخب کو ایک سوانحی رنگ ملتا ہے اور اس عہد کے ثقافتی پہلو بھی اجاگر ہوتے ہیں۔

عبدالقادر بدایونی کی نظر میں ''علم تاریخ ایک علم شریف اور فن لطیف ہے جس سے اہل خبر کو عبرت اور اہل عقل کو تجربہ حاصل ہوتا ہے۔'' ظاہر ہے عہد وسطیٰ کے دوسرے مورخین کی طرح بدایونی بھی تاریخ کو سبق آموزی کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ وہ علم تاریخ کی فضیلت کا قائل ہے اور منکرین تاریخ پر افسوس جتاتا ہے کیوں کہ اسلامی تہذیب میں ماضی کے واقعات کو قلم بند کرنے کی بڑی پرانی روایت موجود ہے۔ ابوالفضل کے ایک سوال کے جواب میں بدایونی کہتا ہے کہ اسلام میں ''قصص الانبیاء'' کے نام سے قدیم انبیاء کے حالات بھی محفوظ کیے گئے ہیں البتہ قابل اعتماد معلومات کی کمی کی وجہ سے ان کے حالات زیادہ تفصیل سے نہیں لکھے جا سکے۔ لیکن عبدالقادر بدایونی، ضیاء الدین برنی کی طرح علم تاریخ اور علم حدیث کو توام نہیں سمجھتا یعنی علم تاریخ کے ساتھ وہی تقدس اور قطعیت نہیں جوڑتا جو علم دین کے ساتھ منسوب کی جاتی ہے۔ اس کی نظر میں علم تاریخ کی فضیلت اس طور پر ہے کہ یہ عقیدہ و ایمان میں پختگی پیدا کرتا ہے اور اس کے مطالعہ سے مسلمان صحیح راستے سے نہیں بھٹکتا۔ اس کے برعکس تاریخ کے مطالعہ سے وہ لوگ متنفر ہوتے ہیں جن کو فطری طور پر دین حق سے کوئی لگاؤ نہیں ہوتا۔ غالباً علم

تاریخ کے تئیں یہی نقطہ نظر ہے جس کے تحت بدایونی نہ صرف لوگوں کو ماضی کے واقعات کی مدد سے سبق دینا چاہتا ہے بلکہ مسلمانوں کی صحیح راستے کی طرف رہنمائی بھی کرنا چاہتا ہے۔ گویا علم تاریخ اور اسلام میں رشتہ تو ہے لیکن یہ رشتہ تقدس کا نہیں بلکہ افادیت کا ہے۔

بدایونی کی تاریخ نویسی کی ایک اہم خصوصیت تاریخ اور سوانح کا امتزاج ہے۔ یہ صفت اس کی کتاب کو منفرد اور دلچسپ بناتی ہے حالانکہ منتخب التواریخ کی تیسری جلد علماء، صوفیاء اور شعراء کے حالات سے پر ہے، دوسری جلد میں بھی تاریخی واقعات کے ضمن میں بدایونی نے شخصیات کے بارے میں اہم معلومات فراہم کی ہیں جو دوسرے مآخذ میں نہیں ملتی۔ یہ جذبہ اس کے یہاں اتنا شدید ہے کہ سوانحی حالات بیان کرنے کے لیے وہ اکثر واقعات کے تسلسل کو توڑ دیتا ہے۔ مثلاً نگر کوٹ پر قبضہ کے واقعہ کو بیان کرتے ہوئے وہ بیربر کے بارے میں مختصراً ذکر کرتا ہے جس کو قلعہ کا ذمہ دار بنایا گیا تھا۔ اسی طرح ایرانی دانشور شریف آملی کے مغل دربار میں پہونچنے کے موقع پر ان کی زندگی اور نظریات پر بحث چھیڑ دیتا ہے۔ ممکن ہے کہ جدید قاری کو اس سلسلہ واقعات کے ٹوٹنے سے تاریخی بیانیہ کے کمزور ہونے کا شبہ ہو اور یہ درست بھی ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ طریق کار دانستہ طور پر اختیار کیا گیا تھا۔ چونکہ بدایونی کے نزدیک عہد اکبری میں اسلامی تعلیمات اور عقائد کے کمزور ہونے میں جتنا رول بادشاہ کا تھا اتنا ہی اس کے حامیوں اور علماء سوء کا بھی تھا جنہوں نے اپنے من گھڑت افسانوں سے بادشاہ کو گمراہ کیا تھا۔ لہٰذا اس طرح بدایونی تاریخ کے مختلف کرداروں کے کردار کو بھی اجاگر کرتا ہے اور ان کے محرکات کو ایک تاریخی سیاق (historical context) میں بھی رکھتا ہے۔

14.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

ملا عبدالقادر بدایونی اکبری عہد کے ممتاز مورخین میں سے ایک ہے جس کی کتاب "منتخب التواریخ" 16ویں صدی کے ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور مذہبی حالات کے مطالعہ کے لیے اہم ماخذ ہے۔ تین جلدوں پر مشتمل اس تاریخ میں غزنوی خاندان سے اکبر کے چالیس سالہ دور حکومت تک کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ بدایونی نے یہ کتاب آزادانہ طور پر سب سے چھپا کر لکھی اور یہ اس کتاب کا ایک خاص پہلو ہے۔ منتخب التواریخ کی اہمیت اور افادیت تاریخی طور پر اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کیونکہ ابوالفضل کی اکبر نامہ کے برعکس، اس کتاب میں اکبر کے اقدامات بالخصوص مذہبی افکار و نظریات پر ناقدانہ بحث کرتے ہوئے ایک متبادل تاریخ پیش کی گئی ہے۔ چنانچہ مورخین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ اکبر کے دور کی مکمل اور معروضی صورتحال کے ادراک کے لیے اکبر نامہ کے ساتھ ساتھ منتخب تواریخ کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔

عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ 96-1595ء میں مکمل کی اور اس کی ترتیب میں متعدد مآخذ سے استفادہ کیا۔ اپنے مآخذ کے تئیں بدایونی کا رویہ ناقدانہ ہے یعنی وہ اپنے مآخذ کے مندرجات کو بھی انہیں قبول نہیں کرتا، بلکہ بعض اوقات ان پر سوال بھی اٹھاتا ہے اور کبھی کبھی حذف و اضافہ سے بھی کام لیتا ہے۔ طرزِ تاریخ نویسی کے حوالے سے بدایونی کی خاص صفت یہ ہے کہ وہ ماضی کے واقعات میں حذف و اضافہ کے ذریعہ اسطرح تبدیلی کرتا ہے کہ واقعات کے بیانیہ میں معنی خیز تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اکبر کے عہد کی تاریخ لکھتے وقت بدایونی کا انداز منفی ہے بلکہ بہت حد تک جارحانہ ہے جس کے نتیجہ میں تاریخ کی معروضیت مجروح ہوتی ہے، حالانکہ خود بدایونی کا دعویٰ

ہے کہ وہ حقیقت پر مبنی ایک تاریخ لکھنا چاہتا ہے، جو اس کے بعض ہم عصر مورخین نے قصداً مسخ کر دی تھی۔ یہ بات قابل غور ہے کہ بدایونی واقعات میں ترتیب کی سخت پابندی و رعایت نہیں کرتا اور غالباً یہ اس کے مقصد کے عین مطابق تھا، کیونکہ وہ ماضی اور حال کا ایک حقیقی تصور پیش کرنا چاہتا تھا جس کے سبب اس کا پورا زور واقعات کی تفہیم اور اثر انگیزی پر تھا، نہ کہ اس کی ترتیب پر۔ بہر حال ان چند کمیوں کے باوجود منتخب التواریخ عہد اکبری کی تاریخ کا اہم مآخذ ہے۔

14.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

عبادت خانہ : 1575ء میں اکبر کے حکم سے ایک عمارت تعمیر کی گئی جس میں مختلف مذاہب کے دانشوروں کو مذہبی اور دینی موضوعات پر بحث کے لیے بلایا جاتا تھا۔

منصب : اکبر کے عہد میں مغل امراء وافسران کو دیا گیا عہدہ جس کے تحت ہر امیر وافسر کو ایک خاص نمبر دیا جاتا تھا جس سے اس کا سوار عہدہ اور ذاتی عہدہ طے ہوتا تھا۔

Chronology: واقعات میں ترتیب کی پابندی و رعایت۔

مدد معاش : مغل عہد میں دی جانے والی زمینی عطیات جو بالخصوص علماء، دانشوروں اور شعراء واہل قلم کو دی جاتی تھی تاہم وہ کسی ذمہ داری کے پابند نہیں ہوتے تھے۔

معروضی تاریخ : ایسی تاریخ جس میں واقعیت کو بغیر کسی جانبدارانہ رویہ کے بیان کیا جائے۔

14.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

14.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. بدایونی نے کن کتابوں کو سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا۔
2. بدایونی کی کتاب "نجات الرشید" کا بنیادی موضوع کیا ہے۔
3. منتخب التواریخ کی پہلی جلد میں کس عہد کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔
4. طبقاتِ اکبری اور تاریخِ مبارک شاہی کے مصنفین کا نام بتایئے۔
5. بدایونی اکبر کے دربار میں کس عہدے پر مقرر کیے گئے۔
6. اکبر نامہ کی کس کی تصنیف ہے۔
7. منتخب التواریخ کس مغل بادشاہ کے عہد میں سب سے پہلے منظر عام پر آئے۔
8. منتخب التواریخ کی تیسری جلد میں کس موضوع کا ذکر ہے۔
9. مشہور جدید مورخہ ہربنس مکھیا کی کتاب کا نام بتایئے۔

10. بدایونی نے منتخب التواریخ کب مکمل کی۔

14.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. بدایونی کی ابتدائی تعلیم پر ایک نوٹ لکھیئے۔
2. منتخب التواریخ کی تصنیف اور مقاصد پر مختصراً روشنی ڈالیے۔
3. منتخب التواریخ کے مآخذ پر ایک نوٹ لکھیے۔
4. اکبر کے دربار میں بدایونی کی علمی اور فکری سرگرمیوں کا ذکر کیجیے۔
5. علم تاریخ پر بدایونی کی رائے کیا ہے۔ وضاحت کیجیے۔

14.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. جدید مورخین کی نظر میں بحیثیت مورخ بدایونی کے کردار کا جائزہ لیجیے۔
2. بدایونی کی طرزِ تاریخ نویسی کا تنقیدی تجزیہ کیجیے۔
3. عہدے اکبری کے مکمل اور معروضی مطالعہ کے لیے منتخب تواریخ ایک اہم مآخذ ہے مثال دے کر سمجھایئے۔

14.9 مزید مطالعہ کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. Abbas, Fauzia Zareen, *Abdul Qadir Badauni: As a Man and Historiographer*, Idara-i-Adabiyat-i-Delhi, Delhi, 2009.
2. Ahmad, Aziz, *An Intellectual History of Islam in India*, Edinburgh University Press, Edinburgh, 1969.
3. Ali, M. Athar, 'Translations of Sanskrit Works at Akbar's Court', *Social Scientist*, Vol. 20, No. 9/10, 1992.
4. Anooshahr, Ali, 'Mughal Historians and the Memory of the Islamic Conquest of India', *Indian Economic Social History Review*, Vol. 43, No. 3, 2006.
5. Blochmann, H., 'Badaoni and His Works', *The Journal of Asiatic Society of Bengal*, Vol. 38, 1869.
6. Irfan Habib, 'Abdul Qadir Badauni- A Life', in *Muntakhabu't Tawarikh*, vol. 1., ed. Maulvi Ahmad Ali, Publications Division, Centre for Advanced Study, Department of History, Aligarh Muslim University, Aligarh, 2018.

7. Habibullah, A.B.M., 'The Najat-al Rashid of Abd al-Qadir Badayuni', in *Muhammad Shahidullah Felicitation Volume*, ed. Muhammad Enamul Haq, The Asiatic Society of Pakistan, Dacca, 1962.
8. Haider, Najaf, 'Translating Texts and Straddling Worlds: Intellectual Communication in Mughal India', in *The Varied Facets of History: Essays in Honour of Aniruddha Ray*, eds., Ishrat Alam and Syed Ejaz Hussain, Primus, Delhi, 2011.
9. Hardy, Peter, 'Badauni, Abd al-Kadir', *Encyclopaedia of Islam*, eds., H.A.R. Gibb, J.H. Kramers, E. Levi-Provencal, J. Schacht, Vol. I, E.J. Brill, Leiden, 1986.
10. Moin, A. Azfar, 'Challenging the Mughal Emperor: The Islamic Millennium according to 'Abd al Qadir Badayuni', in *Islam in South Asia in Practice*, ed., Barbara D. Metcalf, Princeton University Press, Princeton, 2009.
11. Mujeeb, Muhammad, 'Badauni' in *Historians of Medieval India*, ed., Muhibbul Hasan, Meenakshi Prakashan, Meerut, 1968.
12. Mukhia, Harbans, *Historians and Historiography during the Reign of Akbar*, Vikas Publishing House, New Delhi, 1976.
13. Nizami, K.A., *On History and Historians of Medieval India*, Mushiram Manoharlal, New Delhi, 1983.
14. Rizvi, S.A.A., *Religious and Intellectual History of the Muslims in Akbar's Reign with special reference to Abul Fazl*, Munshiram Manoharlal Publishers, New Delhi, 1975.
15. سید صباح الدین عبدالرحمن، بزمِ تیموریہ، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، 1946
16. محمد حسین آزاد، دربارِ اکبری، آزاد بک ڈپوٹ، لاہور، 1921
17. شیخ محمد اکرام، رودِ کوثر، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، 2013

اکائی 15۔ شاہی خود نوشت سوانح جات

(Royal Autobiographies)

اکائی کے اجزا

15.0 تمہید

15.1 مقاصد

15.2 پس منظر

15.3 بابر

15.3.1 تزک بابری

15.3.2 بابر اور ہندوستان

15.4 گلبدن بیگم

15.4.1 ہمایوں نامہ

15.5 جہانگیر

15.5.1 تزک جہانگیری

15.6 اکتسابی نتائج

15.7 کلیدی الفاظ

15.8 نمونہ امتحانی سوالات

15.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

15.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

15.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

15.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

15.0 تمہید (Introduction)

مغل عہد میں تاریخ نویسی کی سب سے نمایاں خصوصیت اورنگ زیب کے عہد تک تقریباً تمام مغل بادشاہوں کے ذریعہ مامور کردہ سرکاری وقائع نویسیوں کی روایت ہے۔ یہ وقائع نویس بادشاہوں کے ذریعہ متعین کیے جاتے اور اس مقصد کے لیے انھیں تمام سرکاری رکارڈس مہیا کرائے جاتے تھے۔ اس عہد کی دوسری خصوصیت بادشاہوں کی خود نوشت سوانح ہے۔ بابر کی تزک بابری (ترکی میں فارسی میں نہیں) اور جہانگیر بادشاہ کی تزک جہانگیری (فارسی میں) گلبدن بیگم کی ہمایوں نامہ (فارسی میں) اس صنف کی اہم کتابیں ہیں۔ سرکاری کتب جن کی کچھ خاص بندشیں تھیں، کے علاوہ بہت سی آزاد مصنفین کے ذریعہ غیر سرکاری کتابیں ہیں جو اس عہد کی پالیسیوں اور واقعات کا تنقیدی تجزیہ پیش کرتی ہیں۔

اس اکائی میں ہم مغلیہ عہد کے بادشاہوں کی خود نوشت سوانح کا جایزہ لین گے۔ کس طرح مغلیہ بادشاہوں کی خود نوشت سوانح حاصل ہوئیں تھیں؟ ان کے مصنفین کون تھے؟ سماج میں ان کی تحریروں کی کیا حیثیت تھی؟ مغل بادشاہوں کی خود نوشت سوانح کا ہندوستانی سماج میں کیا کردار تھا؟۔ ان تمام باتوں کو ہم اس اکائی کے زریعہ جاننے کی کوشش کرین گے۔ ساتھ ہی اہم سماجی تبدیلیوں کی نشان دہی کر سکیں گے۔ مغلیہ بادشاہوں کی تحریروں سے تاریخ نویسی کا عمل کس طرح متاثر ہوا؟ ملکی و غیر ملکی تاریخ نویسی کے ہندوستان پر کیا اثرات مرتب ہوئے؟ اس کا اندازہ لگا سکیں گے۔

15.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ

- مغلیہ بادشاہوں کی خود نوشت سوانح کو سمجھ سکیں گے۔
- تزک بابری سے واقف ہو سکیں گے۔
- سماج میں تزک بابری کی حیثیت کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- گلبدن بیگم کی ہمایوں نامہ کی شناخت کر سکیں گے۔
- ہمایوں نامہ کی اہمیت سے واقف ہو سکیں گے۔
- سماج میں تزک جہانگیری کے کردار کی وضاحت کر سکیں گے۔
- تزک جہانگیری کے بارے میں بتا سکیں گے۔

15.2 پس منظر (Background)

پروفیسر جگدیش نرائن سرکار کہتے ہیں کہ مغل زمانے کے تاریخی ادب کا مطالعہ کیا جائے تو تاریخ کی قسم اور مصنفین کے رتبے میں

کافی فرق نظر آتا ہے۔اپنی سوانح عمری لکھنے والے بادشاہ(تیمور، بابر، جہانگیر) تزک نگار(مرزا حیدر دوغلت، گلبدن، جواہر اور دوسرے لوگ)سرکاری تاریخ نویسی (ابوالفضل، عبدالحمید لاہوری، محمد کاظم اور محمد ساقی مستعد خاں)غیر سرکاری مئورخین(نظام الدین، عبدالقادر بدایونی، خفی خاں ، مرزا محمد حسن اور دوسرے)دور سلطنت کے مصنفین سے سماجی رتبے، نظرئے، زبان اور طرز نظر کے اعتبار سے مختلف تھے۔ذاتی فائدے کا عنصر، انعام کا حصول، یا قرض احسان کی ادائیگی، ئی سب باتیں یا تو پس منظر میں چلی گئی تھیں یا اتنی اہم رہی تھیں جتنی سابقہ دور میں تھیں سب سے اہم تبدیلی یہ ہوئی کہ مغل زمانے میں تاریخ نے غیر مذھبی انداز اختیار کر لیا تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ مغل دور کی تاریخ میں مرضی خدا کا رویہ نظر آتا ہے، لیکن ترک افغان دور کے مقابلے۔ مغل دور میں تاریخ کا انسانی پہلو زیادہ نمایاں اور اسباب روحانی کم نمایاں لگتے ہیں۔ تیسرا اہم پوائنٹ یہ ہے کہ مغل دور میں تاریخ سے ناصحانہ عنصر کم ہونے لگتا ہے اور مئورخین سیاسی، انتظامی یا فوجی واقعات، افعال اور اقدامات پر اور عام اخلاقی اصولوں یا مبہم انداز کی تنبیہوں کے مقابلے میں علت واسباب پر زیادہ توجہ صرف کرتے ہیں۔

15.3 بابر (Babur)

ظہیر الدین محمد بابر جس نے ہندوستان پر حملہ کیا اور لودی حکومت کو ۱۵۲۶ء میں اپنی حکومت کے ذریعے بے دخل کیا، بھی ایک اخلاقی مصنف تھا۔اس نے اپنی مادری زبان ترکی اور فارسی میں بھی لکھا۔اس کی خود نوشت سوانح بزبان ترکی تزک بابری ایک ادبی شاہکار ہے جس میں مرکزی ایشیاء میں تیموری اقتدار کے زوال کی تاریخ، اس کے ذاتی سوانح، ہندوستان میں حیات وثقافت کی تصریح اور ان واقعات کا بیان شامل ہے جو مشرقی ہندوستان میں اپنے مخالفین کے خلاف حملے میں پیش آئے تھے۔ بابر کا مرکزی ایشیاء اور خراسان کا ذکر معروجیت کے باعث پہچانا جاتا ہے لیکن ہندوستان کے اعلی حکمراں طبقے کے ساتھ اس کے روابط کے ذکر میں معروضیت کی کمی ہے۔ جن کے خلاف وہ جنگ چھیڑے ہوئے تھا۔ان کی طرف جارحیت کے باعث یہ ایک حقیقت ہے کہ بابر نے غصے میں ہندوستانی حکمرانوں کے خلاف لکھا۔وہ ہندوستانی امراء کو ناقابل بھروسہ سمجھتا تھا۔ گرچہ اس نے خود ان کو دھوکہ دیا تھا۔افغانوں نے اپنے سلطان ابراہیم لودی کے خلاف جنگ میں اس کو مدد کے لیے یہ سوچ کر بلایا تھا کہ وہ خزانہ لے کر واپس چلا جائے گا لیکن بابر ان کی سوچ کے بر خلاف نکلا اور اس نے خاندان مغلیہ کی بنیاد ڈالی جو دو سو سالوں تک پوری شان وشوکت کے ساتھ ہندوستان میں قائم رہی اس لیے بابر کو ایک عظیم حکومت کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔

15.3.1 تزک بابری (Tuzuk-i-Babari)

بابر نے ۱۵۲۷ء میں لکھا تھا کہ گیارہ برس کی عمر سے آج تک میں نے دو عید رمضاں ایک جگہ نہیں گزاریں۔ پچھلے سال عید پر آگرہ میں تھا۔اس دستور کو قایم رکھنے کے خیال سے میں تیس تاریخ کی شب، سیکری کے لیے روانہ ہو گیا تا کہ عید کی ضیافت وہاں ہو، یہ وہ شخص تھا جس نے کبھی مورخ ہونے کا دعوی نہیں کیا، اور پھر بھی نہ صرف مئورخ ماننے کے لیے اس کی تزک خاصہ بڑا چبوت سمجھی گئی، جیسا کہ لین پول کہتا ہے، بلکہ بعد کے سارے مئورخین خواہ وہ ہمعصر ہوں یا جدید ہوں، بابر نامہ سے اس طرح استفادہ کرتے رہے ہیں جیسے بحیثیت ماخذ وہ بہت

ضروری ہے۔ بابر کی تزک میں جو کمیاں نظر آتی ہیں ان پر مرزا حیدر دوغلت کی تاریخ رشیدی اور گلبدن بیگم کے ہمایوں نامہ سے کچھ روشنی جرور پڑتی ہے۔ لیکن اس نے خود جو لکھا ہے وہ چند ایک مستثنیات کے علاوہ سارے کا سارا وقت اور تنقید کی کسوٹی پر پورا اترا ہے۔ بیورج نے کہا ہے: اس کی خود نوشت سوانح کا شمار ان انمول تحریروں میں ہوتا ہے جن کی ہر زمانے میں قدر ہوتی ہے، اور اگر اسے سنیت اگسٹائن اور روسو کے اعترافات نیز گبن اور نیوٹن کی تزکوں کی صف میں جگہ دی جائے تو موزوں رہے گی۔ ایشیا میں اس کی مثال شاید نہ مل سکے۔ بابر خوب جانتا تھا کی اس کا کیا رتبہ ہے۔ وہ جانتا تھا کہ آنے والی نسلیں اس کی تحریروں کی جانچ پڑتال کریں گی۔ وہ لکھتا ہے؛ میں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا یہ مقصد ہر گز نہیں ہے کہ کسی کی رسوائی ہو، میں نے جو کچھ کہا ہے وہ محض سیدھی سچی حقیقت ہے۔ باتیں جس طرح رونما ہوئی ہیں میں نے جوں کے توں بتادی ہیں۔ میں نے آج اس لمحے تک جو کشھ یحریر کیا ہے اس میں نہایت محتاط رہا ہوں تاکہ ہر لفظ سے حق بیانی ہو۔ میں نے واقعات ٹھیک اس طرح بیان کر دئے جس طرح وہ حقیقتا رونما ہوئے، لہذا میں نے ہر اچھا برا فعل، خواہ وہ فعل میرے والد کا ہو یا میرے بڑے بھائی کا، ٹھیک اس طرح بیان کر دیا ہے جس طرح وہ واقع ہوا ہے۔ اور ہر شخص کی خواہ وہ شناسا کی ہو یا اجنبی کی، اچھائی یا برائی مکمل غیر جانبداری کے ساتھ واضح کر دی ہے۔ اس لیے قاری مجھے معاف کر دیں اور سامعین بہت زیادہ سختی سے فیصلہ نہ دیں۔

بابر کو اپنے شاہانہ ورثے پر فخر تھا۔ اس کی آرزو تھی کہ وہ تیمور کی طرح فوجی کارنامے انجام دے۔ اور ایک تزک تالیف کرے۔ اگر وہ نا یک طرف یہ چاہتا تھا کہ واقعتا بادشاہ بنے تو دوسری طرف چاہتا تھا کہ جو کام وہ انجام دے تحریری شکل میں آجائے۔ حقیقت یہ ہے کہ سارے تیموری شہزادوں سین عام طور پر یہ توقع رکھی جاتی تھی کہ وہ تلوار اور قلم دونوں کو یکساں مہارت کے ساتھ استعمال کریں گے۔ اور ان سب کو ایک ہی معیار سے ناپا جاتا تھا۔ بابر اپنے ایک چچا سلطان حسین بیقرا کے بارے میں لکھتا ہے؛ نیچے کے استعمال میں تیمور بیگ کی نسل کا کوئی دوسرا شخص سلطان حسین مرزا کا کبھی مقابلہ نہ کر سکا۔ بابر کی طبیعت کا جھکاو شاعری کی طرف تھا اور اس نے ایک دیوان مرتب کیا تھا۔ وہ ترکی زبان لکھتا تھا۔ اس کا شاعرانہ نام حسینی تھا۔ اس نے بہت سے شعر اچھے خاصے ہیں۔ لیکن اس پورا دیوان ایک ہی بحر میں ہے۔ مرزا حیدر نے بابر کی بابت لکھا ہے کہ ؛ترکی زبان کی شاعری میں امیر علی شیر کے بعد اسی کا مقام تھا؛ اس نے ترکی زبان میں شاعری کی اور ایک نئی صنف نظم ایجاد کی جس کو موبے یان کہتے ہیں۔

لگتا ہے کہ بابر کی عادت تھی کہ سارے واقعات قلم بند کر لیتا تھا لیکن یہ نہیں معلوم کہ اس نے اپنی تزک کب لکھنا شروع کی۔ اس کے پہلے حصے کو اس نے ایک نفیس ادبی اسلوب اور لطیف نثر کا جامہ پہنایا جس میں جگہ جگہ ترکی اور فارسی کے شعر تھے، لیکن بعد کا حصہ اپنی اصل صورت یعنی بیاض کی شکل میں ہی رہ گیا۔ ایسا شاید اس بنا پر ہوا کہ اسے اس حصے کو دوبارہ لکھنے کا موقعہ نہ ملا۔ ایسا شاید اس لیے ہوا کہا سے اس حصے کو دوبارہ لکھنے کا موقعہ نہ ملا۔ ہم نے یہ نتیجہ اس کے ایک اشارے کی بنا پر نکالا ہے، اور وہ اشارہ یہ ہے کہ ۱۵۲۹ء میں مشرقی صوبوں سے واپس ہوتے وقت سفر میں ایک شدید طوفان اس کے اندراجات اور کاغذات اڑالے گیا تھا۔ اسی رات نماز تراویح کے بعد۔ موسم برسات کے بادل ٹوٹ پڑے اور دفعتا بادوباراں کا طوفان آگیا، اور اتنے زور کی ہوا چلی کہ بیشتر خیمہ اکھڑ گئے۔ میں اپنے خیموں کے وسطی شر نشین مین بیٹھا لکھ رہا تھا۔ طوفان اس قدر سرعت سے آیا کہ اس سے پہلے کہ میں اپنے لکھے ہوئے اوراق اور کاغذات سمیٹ پائوں خیمہ اور اس کے چاروں طرف

لگی قنات میرے اوپر گر پڑے۔ کتابیں اور اوراق پانی میں شرابور ہو گئے، بڑی مشکل سے انھیں اکٹھا کیا گیا اور سرخ رنگ کے اونی بستر پوش میں لپیٹ کر تخت شاہی پر رکھ دیا گیا، جس پر قالین پڑے ہوئے تھے۔ طوفان دو گھڑی میں اتر گیا۔ ہم نے۔ بڑی مشکل سے آگ جلائی اور صبح تک جاگتے رہے۔ کیونکہ ساری رات اوراق اور کاغذات کو سکھاتے رہے، بابر نے اپنی تزک میں جو تاریخی حقائق بیان کیے ہیں ان میں اس کی رائے، اس کے جذبات، اس کے فیصلے اور اس کا فلسفۂ حیات اس قدر شامل ہے کہ دونوں کا علاحدہ کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ اس کے مشاہدات پر اس کے رجحانات کا رنگ چڑھا ہوا ہے، اور جب ہم اس کی تزک پڑھتے ہیں تو لگتا ہے کہ ہم اس کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ اس کے ساتھ سوچ رہے ہیں اسی ہیجانی رفتار سے حرکت کر رہے ہیں جو اس کا خاصہ تھی اور اسی کی طرح ارد گرد کے حالات پر غور کرنے کے لیے ٹھہر جاتے ہیں۔ بابر نے تاریخ میں جغرافیہ کا علم بھی شامل کر دیا ہے۔ اس علم کا تاریخی واقعات پر بڑا گہرا اثر ہوتا ہے۔ اور اسی کی مدد اسے مخصوص مقامات پر رہنے کے مطابق، فرغانہ آب وہوا کے لحاظ سے پانچویں خطے میں واقع ہے۔ فرغانہ ایک ایسا ملک ہے جس کا رتبہ بہت کم ہے لیکن اناج اور پھل کثرت سے ہوتے ہیں۔ یہی معاملہ سمرقند کا تھا۔ یہ خوش گوار مقام ۳۹، ۳۷ اور ۹۰، ۱۶ طول البلد پر پانچویں خطہ اب وہوا میں واقع تھا۔ لیکن بابر نے اتنی معلومات پر اکتفا نہیں کیا، کیونکہ اس کا ذہن ریاضی دان کا سا تھا اور وہ پیمائش کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتا تھا؛ میں نے ہدایت دی ہے کہ شہر پناہ کے چاروں طرف چل کر دیوار کو قدموں سے ناپا جائے اور یہ معلوم ہوا کہ اس کا محیط دس ہزار چھ سو قدم تھا، اس کے بعد وہاں کے لوگوں کے بارے میں لکھتا ہے؛ وہاں کے سارے باشندے راسخ العقیدہ سنی، پابند شریعت اور مذہبی ہیں۔ اور اس کے بعد ماوراء النھر کے ممتاز علمائے دین کا حال بیان کرتا ہے۔ پھر وہ اس کی حدود دریائوں، پھلوں، سرکاری عمارتوں، بازاروں، نانبائیوں اور خانسامائوں پر آتا ہے۔ اور آخر میں کہتا ہے کہ، سمرقند میں دنیا کا بہترین کاغذ تیار ہوتا ہے۔ سمرقند میں ایک اور چیز کرمیزی (قرمزی مخمل) تیار کی جاتی ہے۔ جو ہر جگہ برآمد کی جاتی ہے۔ مرغزاروں کو نظرانداز نہیں کیا گیا ہے۔ اسے آرزو رہتی تھی، گھوڑے سے اتر کر کسی مرغزار میں بہتے ہوئے چشمے کے کنارے ذرا دیر آرام کرے۔ یوریت خاں ایسا یہ ایک مرغزار تھا؛ یوریت خاں کے چاروں طرف دریا اس انداز سے گھومتا ہے کہ درمیان میں اتنی بڑی جگہ بچ جاتی ہے جس میں ایک پوری فوج خیمہ زن ہو سکتی ہے۔ ایسا عمدہ مقام نظر آیا تو محاصرے کے دوران کچھ عرصے کے لیے میں یہیں خیمہ زن ہو گیا۔ وہ صوبوں اور تومانوں کی تفصیلات دے کر اپنے اس ناظری بیان کو مکمل کر دیتا ہے۔

15.3.2 بابر اور ہندوستان (Babur and India)

بابر جب ہندوستان کی طرف بڑھا۔ اس کی حیثیت کا شخص کابل کی بادشاہت پر قناعت نہیں کر سکتا تھا۔ بادشاہت اس لقب بادشاہ کو بھی حق بہ جانب ثابت نہ کر سکتی تھی، جس کے حصول کیلیے وہ اپنی زندگی، اپنا یقین اور اپنا عقیدہ دائوں پر لگاتا رہا تھا۔ اس کا نصب العین ایک طرف تو بادشاہوں کا بادشاہ بننا تھا اور دوسری طرف اپنے خاندانی ورثے کا محافظ بننا تھا۔ بدخشاں اس کی فیاضی کا نظر ہو گیا تھا۔ تاریخ کے علم نے ضرور اس کی توجہ ہندوستان کے ان میدانی علاقوں کی طرف مبذول کرائی ہو گی، جن کو کبھی تیمور نے فتح کیا تھا اور شاہ نامہ کا یہ طالب علم اس ملک میں داخل ہونے کے لیے، جو اس کے اقتصادی اور سیاسی خوابوں کی تعبیر بن سکتا تھا، اب ان افغانوں کی روکاوٹیں پار کر چکا تھا جن کے بارے میں وہ یہ کہتا ہے کہ؛ اشتعال انگیز حد تک غیر مہذب اور احمق ہیں۔ وہ اپنی تزک میں یوں غور کرتا نظر آتا ہے؛ سلطان محمود نے جب

ہندوستان فتح کیا تو وہ خراسان کے تخت پر متمکن تھا اور سلاطین خوارزم نیز اطراف و جوانب کے سردار آ (ماوراءالنہر) مکمل طور پر اس کے زیر اثر اور اس کے قبضے میں تھے۔ سمرقند کا بادشاہ اس کا مطیع تھا۔ جب بابر بادشاہ بنا تو وہ واقعی خوشی سے پھول گیا۔ میں نہیں کہتا کہ اس کامیابی کا سبب خود میری قوت ہے، اور نہ یہ خوش قسمتی میری کوششوں کا نتیجہ ہے اس کا سرچشمہ تو خدا ہے جو رحمان اور رحیم ہے۔

پانی پت فتح کرنے کے بعد اس نے ہندوستان کی اندرونی کمزوریوں پر غور کیا۔ اس دور میں پورا ہندوستان کسی ایک شہنشاہ کے تابع نہ تھا۔ اپنی چھوٹی سی عملداری میں ہر راجہ بزعم خود بادشاہ بن بیٹھا تھا۔ وہ مسلم اور غیر مسلم ہر طرح کی معمولی سلطنتوں پر غور و کوض کرنے کے بعد پھر اپنے مرغوب موضوع یعنی ملک کے جغرافیہ پر آجاتا ہے۔ ہندوستان آب و ہوا کے لحاظ سے پہلے، دوسرے اور تیسرے خطے میں واقع ہے۔ اس کے پہاڑ اور دریا، اس کے جنگلات اور میدان، اس کے حیوانات اور نباتات، اس کے باشندے اور زبانیں اس کے باد و باراں سب ہی مختلف انداز کے ہیں۔

ہندوستان کے میدانی علاقے بابر کے اس زوق جمال کی تسکین نہ کر سکے جس کی جڑیں اس کی شخصیت میں گہری جا چکی تھیں۔ اس نے ہمیشہ قدرت کی وہ پاکیزہ مسرتیں حاصل کرنے کی کوشش کی، جنہوں نے ذہنی پریشانی کے عالم میں ہمیشہ اسے سکون بخشا۔ دریائے گنگا کا وسیع میدانی خچہ اسے کوئی مسرت نہ دے سکا۔ اس نے اس دائمی مسئلے کا ذکر کیا ہے کہ یہاں کے لوگ ٹیکس ادا کرنے کے لیے کبھی خود سے آمادہ نہ رہتے تھے، اور موقع ملنے پر بغاوت کر دیتے تھے۔ شہروں کی بابت اس کا یہ مشاہدہ کہ ایک یا ڈیڑھ دن میں سارا شہر خالی ہو جاتا تھا، لوگوں کے معیار زندگی کا پتہ دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ عوام کے پاس باندھ کر چل دینے کے لیے کچھ زیادہ سامان نہیں ہوتا تھا وہ جسم ڈھانکنے کے لیے زیادہ کپڑے استعمال نہیں کرتے تھے۔

بابر وہ عظیم مغل نہ ہندعستان کو کبھی اپنا وطن سمجھ سکتا تھا اور نہ ہندوستانیوں کو اپنے لوگ سمرقند، اس کا گلستان محل، محل کے مینار جن کا عکس نہر کے پانی پر پڑ رہا ہے یہ اس کا وہ خواب تھا جو ہندوستان میں شرمندہ تعبیر نہ ہو سکتا تھا۔ جب اس نے آگرہ میں ایک محل اور ایک باغ بنانا چاہا تو اسے لگا کہ یہ ساری جگہ بدنما اور قابل نفرت ہے؛ بہر حال، وہ جو کچھ بنانا چاہتا تھا اسے پورا کر دیا، حالانکہ اسے جس طریقے سے بنایا گیا وہ اس کے معیار پر پورا نہ اترا، اس صورت سے ہندو انداز میں قرینے اور نفاست کا خیال رکھے بغیر میں نے بہر صورت باغات اور عمارتیں تیار کروائیں جو خاصی شیڈول تھیں۔ میں نے ہر باغ میں گلاب اور نرگس ترتیب سے لگوائے اور یہ پودے ایسی کیاریوں میں اگوائے جو ایک دوسرے کے برابر تھے۔ وہ آخری دم تک واپسی کا خواہش مند رہا اس نے گیارہ فروری ۱۵۲۹ء کو خواجہ کلاں کو لکھا؛ جیسے ہی یہ معاملات اس حالت پر پہنچے (یعنی پورے طور سے طے ہوئے) تو انشاءاللہ ایک لمحہ وقت ضائع کیے بغیر تمہاری طرف روانہ ہو جاؤں گا۔ اس سرزمین کی مسرتیں کیا کبھی اس دل سے مٹ سکتی ہیں؟ ابھی چند دن پہلے وہ میرے لیے ایک مشکیں خربوزہ لائے۔ اسے کاٹتے وقت میرے اندر شدید تنہائی اور اپنے اصلی وطن سے جلاوطن ہونے کا احساس جاگ اٹھا اور اسے کھاتے وقت میں اپنے آنسو نہ روک سکا؛ ہندوستان کا کوئی پھل مشکیں خربوزے کے معیار تک نہ پہنچ سکتا تھا۔ اس نے لکھا؛ بہت سے لوگ آم کی اتنی زیادہ تعریف کرتے ہیں گویا اسے مشکیں خربوزے کے علاوہ ہر قسم کے ہھلوں

پر فوقیت حاصل ہو۔ لیکن مجھے لگتا ہے کہ اتنی زیادہ تعریف بجا نہیں ہے، لیکن بابر کے پڑپوتے جہانگیر نے جو ہمیشہ ہندوستان سے ہی وابستہ رہا تھا، کابل میں یہ مشاہدہ کیا تھا کہ کابل کے پھل لاکھ خوش ذائقہ صحیح، لیکن مجھے ایک بھی پھل آم جیسا خوش ذائقہ نہ معلوم ہوا، بابر کے جانشینوں نے جہانگیر کے دور سے بہت پہلے ہی ہندوستان کو اپنا وطن سمجھ لیا تھا اور انھیں اپنی آبائی سرزمین میں دوبارہ جا بسنے کا خیال بھی نہ آتا تھا، پھر بھی ہر شہزادے اور ہر بادشاہ وقت کے لیے بابر ایک مثال بنا رہا اور ان کی شدید خواہش رہی کہ قولا اور فعلا اس کی تقلید کریں۔

15.4 گلبدن بیگم (Gulbadan Begum)

گلبدن بیگم ۱۵۲۳ء میں کابل میں پیدا ہوئیں، گلبدن بیگم بابر کی بڑی بیٹی اور ہندال کی سگی بہن تھیں۔آپ کی پیدائش کے وقت بابر بادشاہ کو کابل پر حکمرانی کرتے ہوئے تقریبا انیس سال کا عرصہ گزر چکا تھا، بابر ان دنوں ہندوستان پر فوج کشی کا ارادہ کر رہے تھے۔ بچپن کا زمانہ گلبدن بیگم نے اپنے والد کے سایہ عاطفت میں کابل اور ہندوستان میں بسر کیا جب پہلی مرتبہ آپ ہندعستان آئیں تو آپ کی عمر تقریبا پانچ سال کی تھی، یہاں آنے کے دو ڈھائی سال بعد آپ کے والد کا انتقال ہو گیا یعنی جب گلبدن بیگم آٹھ برس کی تھیں تو بابر فوت ہو گیا تھا۔ ہمایوں نے ۱۵۳۰ء کے بعد ان سے بڑا اچھا سلوک کیا۔ ظہیر الدین محمد بابر کی اولاد میں ایک گلبدن بیگم ہی ایسی تھیں کہ جنھیں اپنے باکمال باپ کی خوبئ تحریر اور ذوق شاعری گویا ورثہ میں ملی تھی۔ ہمایوں گلبدن بیگم سے بڑی شفقت سے پیش آتے تھے سولہ سال کی عمر میں آپ کی شادی ہو گئی، آپ کے خاوند خضر خواجہ خاں تھے جو ایمن خواجہ کے بیٹے اور اپنی والدہ کی جانب سے حیدر مرزا دوغلات کی نسل سے تھے یعنی اعلی نسب چغتائی مغل تھے، اپنی شادی کا ذکر گلبدن بیگم نے ایک جگہ اشارہ کیا ہے جب ہمایوں بادشاہ بنگال کی مہم سے واپس آئے تو آپ نے گلبدن بیگم کو لچک قصابہ پہنے دیکھ کر پہلی نظر میں پہچانا ہی نہیں۔ لچک قصابہ ایک خاص وضع کا رومال ہوتا تھا جو لڑکیاں شادی کے بعد پہنتی تھیں۔ اپنی شادی سے متعلق صرف یہی ایک اشارہ گلبدن بیگم کی کتاب میں پایا جاتا ہے، اور اپنے خاوند کا ذکر کرنے میں آپ بہت حجاب برتتی ہیں، انھیں اپنے ہاتھ سے لکھنا بھی معیوب سمجھتی تھیں۔ بابر کی اولاد میں ایک گلبدن بیگم ہی ایسی تھیں کہ جنھیں اپنے باکمال والد کی خوبئ تحریر اور ذوق شاعری گویا ورثہ میں ملی تھی۔ گلبدن بیگم کو ترکی اور فارسی دونوں زبانوں پر عبور حاصل تھا، آپ کو دونوں زبانوں میں اپنے مافی الضمیر ادا کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔

15.4.1 ہمایوں نامہ (Humayun Nama)

گلبدن بیگم نے ہمایوں نامہ اپنے بھتیجے اکبر بادشاہ کی فرمائش سے لکھا تھا، اس وقت اگرچہ آپ کا بڑھاپا تھا مگر گزشتہ واقعات کے متعلق آپ کی یادداشت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ بوڑھے آدمی نسبتا قریب کے زمانہ کی باتیں تو بھول جاتے ہیں مگر اوائل عمر کی پرانی باتیں زیادہ اچھی طرح ان کے ذہن میں محفوظ رہتی ہیں، کتاب کا آغاز بابر بادشاہ کے ذکر سے ہوتا ہے یعنی گلبدن بیگم شروع کتاب میں تبرکا اپنے والد (بادشاہ بابا) کا ذکر خیر کرتی ہیں، بابر بادشاہ کے انتقال کے وقت آپ بہت کمسن تھیں اس لیے اس زمانے کی زیادہ باتیں آپ کو یاد نہیں اور اس زمانہ کے بہت سے واقعات کا تذکرہ واقعہ نامہ یعنی تزک بابری سے ماخوذ ہے۔ شروع میں ماوراءالنہر کے علاقے میں بابر

بادشاہ کی اپنے دشمنوں سے کش مکش کا ذکر ہے، تین مرتبہ سمرقند فتح کر کے کھو دینے کے بعد بابر بادشاہ کی اپنے آبائی ملک کو خیر آباد کہتے ہیں اور اور بے سروسامانی کی حالت میں کابل چلے آتے ہیں، ہندوستان پر بابر کی فوج کشی سلطان ابراہیم لودی سے جنگ اور رانا سانگا کی شکست کا مفصل ذکر ہمایوں مانہ میں موجود ہے، آگرہ میں بابر مختلف عمارات تعمیر کراتے ہیں اور خواجہ کلاں کے ہاتھ بیگمات کے لیے ہندوستان کے تحائف کابل بھجواتے ہیں، رانا سانگا کی شکست کے بعد ماہم بیگم کابل سے ہندوستان تشریف لاتی ہیں اور ان کی ہمراہی میں گلبدن بیگم پانچ سال کی عمر میں پہلی مرتبہ ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھتی ہیں، یہاں آگرہ دھول پور اور بعض اور مقامات کی سیر کا ذکر ہے اور ہمایوں بادشاہ کی بیماری اور بابر بادشاہ کے انتقال کا تذکرہ ہے، یہ سب باتیں گلبدن بیگم کو کچھ تو خود یاد ہیں اور کچھ اور لوگوں سے سن کر لکھی ہیں، توی طلسم اور مرزا ہندال کی شادی کا جشن بہت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، ہمایوں بادشاہ اور شیر خاں کی جنگ کا ذکر بھی مفصل طور پر موجود ہے، جب ۱۵۴۰ء میں ہمایوں بادشاہ ہندوستان کو خیر اباد کہ کر سندھ اور ایران کا رخ کرتے ہیں تو گلبدن بیگم مجبوراً مرزا کامران کی ہمراہی میں کابل چلی جاتی ہیں اور اس طرح چند سال تک ہمایوں بادشاہ سے جدا رہتی ہیں، سندھ کے علاقہ میں ہمایوں بادشاہ کی بادیہ پیمائی اور حمیدہ بانو بیگم سے شادی کا ذکر بھت دلچسپ ہے، یہ باتیں اگرچہ آپ نے خود نہیں دیکھیں مگر بعض اور بیگمات اور خود حمیدہ بانو بیگم کی زبانی سنی ہو گی، ۱۵۴۵ء میں ہمایوں بادشاہ ایران سے واپس آتے ہیں اور کابل پر دوبارہ قابض ہوتے ہیں، مرزا کامران کی غداری سے مرزا ہندال شہید ہو جاتے ہین۔ ۱۵۵۱ء میں اپنے عزیز بھائی کی شہادت گلبدن بیگم کے لیے ایک بھت بڑا صدمہ تھا اور اس واقعہ کا ذکر آپ نے بہت دردناک پیرایہ میں کیا ہے، کتاب کے آخری حصے میں مرزا کامران کی گرفتاری اور امراء کا متفق ہو کر ان کے قتل کا مطالبہ کرنے کا بیان ہے اور یہاں پہنچ کر تحریر دفعتاً ختم ہو جاتی ہے اور کتاب کے باقی اوراق غائب ہیں۔

ہمایوں نامہ کی تاریخی حیثیت واہمیت ایک خاص رنگ رکھتی ہے۔ اس کتاب کی تحریر اس کی مصنفہ کی شخصیت کے ساتھ کے ساتھ وابستہ ہے، اس کے لکھنے والی ایک ایسی خاتون ہے جو ان عظیم ہستیوں کے ساتھ جن کے کارناموں سے صفحات تاریخ درخشاں ہیں اس کا دائرہ علم باہر کے واقعات تک ہی محدود نہیں بلکہ وہ صرف باہر کی سٹیج پر نظر نہیں رکھتی بلکہ پس پردہ بھی دیکھ سکتی ہے، جنگ اور فتح شکست کے حالات بہت سی تواریخ میں موجود ہیں، ہمایوں نامہ کی خوبی ان واقعات کے بیان سے نہیں بلکہ اس کے قابل قدر وہ حصے ہیں جو ہمیں ان عضیم ہستیوں کے گویا قریب لا کر کھڑا کر دیتے ہیں اور ہمیں ان کی ژخصیت، ان کی عادات اور ان کے احساسات کی ایسی جھلک دکھاتے ہیں کہ جس سے ان کی جیتی جاگتی تصویریں ہماری نظر کے سامنے آجاتی ہیں۔ گلبدن بیگم کی کتاب میں ہمایوں بادشاہ اور بابر بادشاہ اور ان کے متعلقین کی بابت بہت سی چھوٹی چھوٹی سین روزمرہ کی باتیں ہیں جو خاص طور پر ہماری ہماری دلچسپی کا باعث ہیں اور جن کی وجہ سے ہم ان پر اوصاف ہستیوں کو زیادہ اچھی طرح سمجھنے کے قابل ہو جاتے ہیں، اس قسم کی چھوٹی چھوٹی باتیں ہمایوں نامہ میں پائی جاتی ہیں جو ہمارے لیے خاص طور پر دل چسپی کا باعث ہیں اور ہمارے دل میں ان اشخاص کی جانب جو اس کتاب میں مذکور ہیں ایک قسم کا انس پیدا کر دیتی ہیں، مثال کے طور پر بیگہ بیگم کا ہمایوں بادشاہ کو صبح کی نماز کے لیے بیدار کرنا اور بے محل شکایتوں کا دفتر کھولنا، ہمایوں بادشاہ کا بیگمات سے خفا ہو جانا، بیگمات کا سیر کو جانا، مرزا ہندال کا جشن شادی اور جہیز کی تفصیل، کھانے پر مرزا سلیمان کی ناشائستہ حرکات، مرزا کامران کی سادہ لوحی اور حرم بیگم کے نام خط وغیرہ۔

گلبدن بیگم نے اپنی کتاب میں ہندوستان اور اس کیباشندوں کا خاص ذکر نہیں نہیں کیا اور یہاں کی خصوصیات اور رسم ورواج کے متعلق کوئی رائے ظاہر نہیں کی، تاہم اس بناپر ہم یہ فرض نہیں کر سکتے کہ گلبدن بیگم کو خواجی کلاں کی طرح ہندوستان سے کوئی وابستگی نہ تھی، ہمایوں نامہ ایک خاص مقصد سے لکھا گیا تھا یعنی اس کا دائرہ ہمایوں بادشاہ اور اس کے متعلقین اور رفقا کے ذکر تک محدود ہے، ہندوستان کی چیز وض کے بیان کا کوئی خاص موقع و محل نہ تھا، تاہم آپ اپنی تحریر میں کئی جگہ ہندی الفاظ استعمال کرتی ہیں مثلا چھپر کھٹ، ترپا اور گنوار وغیرہ۔

گلبدن بیگم حسن سیرت کے ساتھ حسن صورت سے بھی مزین تھی، ذہن، ذکاوت اور علمیت کے لحاظ سے اپنے زمانہ کی عورتوں پر نمایاں فوقیت رکھتی تھیں، بچپن سے ہی گلبدن بیگم کی ہونہاری نے سب کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا، بابر بادشاہ اور ماہم بیگم نے آپ کی بڑے لاڈ پیار سے پرورش کی تھی اور آپ کے سب بھائی بہن آپ کی بہت قدر ومنزلت کی نظر سے دیکھتے تھے، معلام ہوتا ہے کہ تیمادار ی میں بھی آپ کو بڑا خاص ملکہ حاصل تھا، چنانچہ ایک دفعہ غصہ ہو کر مرزا کامران نے جب بیگمات کو قید کر دیا تھا مگر گلبدن بیگم ان کے عتاب سے مامون رہیں اور خضر خواجہ کو خط لکھنے سے صاف انکار کرنے کے باوجود مرزا کامران نے آپ پر کوئی سختی نہیں کی، اس وقعہ کا دل چسپ ذکر ہمایوں نامہ میں موجود ہے۔

گلبدن بیگم کی آخری عمر امن چین سے اکبر بادشاہ کے عہد میں بسر ہوئی، پچاس سال کی عمر میں گلبدن بیگم کو طراف بیت اللہ کا شوق دامن گیر ہوا اور ۱۵۷۵ء میں خشکی اور سمندر کا دور دراز اور پر خطر سفر طے کر کے آپ ملک عرب میں پہنچیں جہاں آپ نے ساڑھے تین سال بسر کیے اور اس اثناء میں چار مرتبہ طواف کیا، فروری ۱۶۰۳ء میں بمقام آگرہ آپ اس جہان فانی سے رخصت ہوئیں اس وقت آپ کی عمر اسی سال کے قریب تھی۔

15.5 جہانگیر (Jahangir)

جہانگیر کے بچپن کا نام سلیم تھا۔ جہانگیر کی پیدائش ۳۰ اگست، ۱۵۶۹ء کو فتح پور سیکری میں حضرت شیخ سلیم چشتی کی کٹیا میں ہوا۔ اکبر بادشاہ سلیم کو پیار سے شیخو بابا کہتے تھے۔ جہانگیر کی ماں ہر کھا بائی (مریم الزمانی) آمیر کے راجا بھر مل کی لڑکی تھی۔ جہانگیر کی پہلی شادی ۱۵۸۵ء میں مان بائی سے ہوئی جو آمیر کے راجہ بھگوان داس کی لڑکی اور مان سنگھ کی بہن تھی۔ مان بائی سے خسرو کا جنم ہوا، جسے بعد میں جہانگیر نے اندھا کروادیا تھا۔ مان بائی کو شاہ بیگم کا لقب حاصل تھا، لیکن بعد میں اس نے سلیم کی عادتوں سے ناراض ہو کر افیم کھا کر خودکشی کر لی تھی۔ جہانگیر کی دوسری شادی مارواڑ کے راجہ اودے سنگھ کی لڑکی جگت گوسائی سے ہوئی تھی۔ خرم جگت گوسائی سے تھا۔ جگت گوسائی کو ملکہ جہاں کا لقب حاصل تھا۔ ۳ نومبر، ۱۶۰۵ء کے دن آگرہ کے قلعہ میں سلیم کی تاجپوشی ہوئی تھی۔ جہانگیر نے حکمراں بننے کے بعد اپنے نام میں نورالدین لفظ جوڑ دیا تھا۔ جہانگیر نے آگرہ قلعہ کے شاہ برج میں ۳۰ گز لمبی انصاف کی زنجیر یعنی زنجیر عدل لگوائی، جس میں ساٹھ گھنٹیاں لگی ہوئی تھی۔ جہانگیر کا پہلا اور اہم استاد عبدالرحیم خانخاں تھا جن سے انہوں نے ترکی زبان سیکھی، بعد میں انہوں نے عبدالنبی سے بھی تعلیم حاصل کی

تھی۔ جہانگیر نے حکمراں بنتے ہی بارہ فرمان جاری کیے جنکو آئین جہانگیری کہا جاتا ہے۔ بعد میں ان بارہ اعلانات کو واقعات جہانگیری میں دستورالعمل بھی کہا گیا۔

۲۸ اکتوبر ۱۶۲۷ء کو جہانگیر کی لاہور میں وفات ہوگئی۔ جہانگیر دمہ کا مریض تھا اسے لاہور میں شاہدرہ نامی جگہ پر راوی ندی کے کنارے دفنایا گیا۔ جہانگیر ترکی اور فارسی زبانوں کا اچھا جانکار تھا۔ اس نے اپنی سوانح تزک جہانگیری فارسی زبان میں لکھا۔ جہانگیر پھلوں کے راجہ آم کا بڑا شوقین تھا۔ جہانگیر پہلا بادشاہ تھا جس نے سکوں پر اپنی تصویر کھدوائی تھی۔ جہانگیر کے دور میں ہندوستانی مسلمانوں کو بھی منصبداروں کا عہدہ ملنے لگا تھا۔

15.5.1 تزک جہانگیری (Tuzuk-i-Jahangiri)

جہانگیر نے اپنی تزک میں سولہ سال کی تاریخ لکھا ہے۔ اس کے بعد تین سالوں کی تاریخ معتمد خان نے پورا کیا ہے۔ آخر میں تزک جہانگیری کو محمد ہادی نے پورا کیا ہے۔ جہانگیر کی خودنوشت سوانح عمری پر نہ صرف اس کے کردار، علم و فضل اور اس کی زندگی کے نشیب و فراز کی چھاپ پڑی ہوئی ہے، بلکہ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ کوئی معمولی لیاقت کا آدمی نہیں تھا۔ وہ اپنی کمزوریاں تحریر کرتا ہے، بڑی صاف دلی سے غلطیوں کا اعتراف کرتا ہے، اور اگر محض اس کی کتاب پڑھ لی جائے تو اس کی صلاحیتوں اور دونوں کی بابت بڑا اچھا اثر پڑتا ہے۔ اپنے باپ کی طرح وہ بھی جواہرات کا شائق تھا اور ایک سچے نقاد کی طرح ان کی قیمت کا اندازہ لگالیتا تھا۔ وہ ایک زبردست شکاری تھا اور اپنی زندگی کے آخری برسوں تک اسے اس کھیل میں مزہ ملتا رہا۔ وہ فطرت کا شیدائی تھا، خواہ وہ جاندار کی شکل میں ہو یا بے جان شکل میں اور اسے بڑی تیز اور مشتاق نظروں سے دیکھتا تھا۔ وہ بہت سے جانوروں اور پرندوں کی خصوصیات کا ذکر کرتا ہے، اور تحریر سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بڑی سرگرمی اور مستقل مزاجی سے ان کی عادتوں کو دیکھتا رہتا تھا۔ درخت، پھل اور پھول بھی اس کے مشاہدے میں رہے اور وہ اس انداز سے فن تعمیر اور باغبانی پر رائے زنی کرتا ہے جیسے اس نے ان چیزوں پر بڑا وقت صرف کیا ہو اور غور کیا ہو۔

بادشاہ جہانگیر کی تزک بابر کی تزک سے کم دلچسپ نہیں ہے۔ اگر بابر ہمیں اپنی عیاشی کی خلوتوں میں شامل کرلیتا ہے تو جہانگیر بھی بڑے پرسکون انداز میں ہمیں یہ بتادیتا ہے کہ اس نے ابوالفضل کو کس طرح قتل کروایا لیکن وہ نور جہاں سے شادی کا ذکر نہیں کرتا ہے۔ تزک جہانگیری اپنے وقت کی انتہائی مستند دستاویز ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ سے جہانگیر کی وسعت نظر عیاں ہے۔ ہر جملہ ہر لفظ اس کے مزاج کی عکاسی کرتا ہے۔

تزک جہانگیری کا اصل نسخہ دو جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد جو جلوس کے بارہ سال کے واقعات پر مشتمل ہے۔ جب اسے بادشاہ نے لکھ لیا تو اس نے اہل فن اور اپنے دربار کے خوش نویسوں کو حکم دیا کہ اس کے متعدد نسخے تیار کیے جائیں اور حکومت کے تمام شہروں میں ارباب دولت اور احباب سعادت کو بھیجے جائیں تاکہ وہ اس کو اپنا دستورالعمل بنائیں۔ جو وقعات بعد میں احاطہ تحریر میں لائے گئے وہ جلد دوم قرار پائے۔

اس کتاب کے متعدد نام رکھے گئے، مگر اس کا اصل نام جو شہنشاہ عالم پناہ نے اپنی خود نوشت تصنیف میں جگہ جگہ استعمال کیا ہے جہانگیر نامہ ہے۔ تزک جہانگیری کے مکمل نسخے کو سر سید احمد خان نے ۱۸۶۴ء میں علی گڑھ سے طبع کرایا۔ انگلش میں سب سے پہلے جیمس انڈرسن نے جلد اول کے بعض اقتسابات کا ترجمہ کیا جو کلکتہ سے ۱۷۸۶ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد راجرس نے پہلی جلد کا ترجمہ کیا جسے بیورج نے مرتب کر کے ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۴ء تک دو جلدوں میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن سے شائع کیا۔

علمی دنیا میں تزک بابر نے تزک جہانگیری کی نسبت زیادہ شہرت پائی ہے لیکن اس اعتبار سے دونوں کتابیں ایک جیسی منزلت رکھتی ہیں کہ دونوں کے مصنف اپنے وقت کے یگانہ روزگار، ادیب اور صاحب طرز انشاپرداز تھے۔ ان دونوں کتابوں میں اگر کوئی فصل وفرق ہے تو وہ صرف ااس قدر ہے کہ پہلی کتاب کا مصنف بابر، نورالدین کے خاندان کا جدامجد اور ہندوستان میں مغل بادشاہت کا بانی تھا اور اس نے زندگی کو جہانگیر کی نسبت بہت زیادہ قریب سے دیکھا تھا اور راہ گزر حیات پر چلتے وقت بے انتہا مصیبتیں اٹھائی تھیں لیکن بعض مئورخین کا یہ خیال حرف بہ حرف درست ہے کہ ہندوستان کے مغل تاجداروں میں یہ صرف نورالدین جہانگیر تھا جس کی بہت سی باتیں ظہیرالدین بابر سے بے حد مشابہ تھیں۔ خصوصیت سے، اس نے اپنی خود نوشت سوانح حیات لکھتے وقت تو اپنے بزرگ دادا ظہیرالدیں بابر کی پوری طرح پیروی کی اور دونوں کے ذاتی حالات ایک دوسرے سے مختلف تھے مگر جہانگیر نے اس بات کی پوری پوری کوشش کی کہ بزرگ دادا کے انداز تحریر اور سادگئی بیان کی رسم کو باقی رکھے۔ اور نمائش وتصنع سے کام نہ لے۔

جن علما نے تزک جہانگیری کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہے وہ ہم سے اتفاق کریں گے کہ تزک جہانگیری کا وہ حصہ جو بادشاہ جہانگیر نے خود لکھا، اس حصے سے بہت نمایاں ہے جسے جہانگیر کے حکم سے امیر معتمد خاں یا محمد شاہ بادشاہ کے ایک درباری مرزا محمد ہادی نے تحریر کیا ہے۔

حالانکہ موخر الذکر امراء اپنے وقت کے بڑے ادیب اور صاحب طرز انشاپرداز تھے۔ یہ کوئی جانب داری نہیں ہے۔ تزک جہانگیری کے وہ ابواب جنہیں جہانگیر کی زبان وقلم ملی ہے۔ تحریر وبیان کی جس بلندی کو چھورہے ہیں اس تک باقی کے ابواب نہیں پہنچ سکے ہیں۔ حالانکہ ان کے مصنف، جہانگیر سے کہیں بڑے ادیب تھے۔ بہر حال پوری کی پوری تزک جہانگیری تاریخی لحاظ سے ایک بہت ہی قیمتی پونجی کی حیثیت رکھتی ہے۔

15.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ ظہیرالدین محمد بابر ایک اخلاقی مصنف تھا۔ اس نے اپنی مادری زبان اور فارسی میں بھی لکھا۔ اس کی خود نوشت سوانح بزبان ترکی تزک بابری ایک ادبی شاہکار ہے جس میں مرکزی ایشیا میں تیموری اقتدار کے زوال کی تاریخ، اس کے ذاتی سوانح، ہندوستان میں حیات وثقافت کی توضیح اور ان واقعات کا بیان شامل ہے جو مشرقی ہندوستان میں اپنے مخالفین کے خلاف حملے میں پیش آئے تھے۔

- بابر کا مرکزی ایشیاء اور خراسان کا ذکر معروضیت کے باعث پہنچانا جاتا ہے لیکن ہندوستان کے اعلی حکمراں طبقے کے ساتھ اس کے روابط کے ذکر میں معروضیت کی کمی ہے، جن کے خلاف وہ جنگ چھیڑے ہوئے تھا۔
- بابر ہندوستانی ذخائر اور ماہر کاریگروں، فنکاروں کی دستیابی کا کافی مداح ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ کسی کام یا کسی نوکری کے لیے ایک گروہ تیار ہے جن کے آباواجداد صدیوں سے یہی نوکری اور پیشہ کرتے آئے ہیں۔
- بابر سالانہ ٹیکس دینے والی سرکاروں (علاقائی اکائی) کی فہرست بھی پیش کرتا ہے مزید شہروں اور قصبات کا ذکر، مقامی رنگ کی جغرافیائی تفصیلات و خصوصیات کے ساتھ کافی دلچسپ ہیں۔ اس کی سوانح میں جغرافیائی تفصیلات اس کی اہمیت میں اضافہ کرتی ہیں۔
- تزک بابری ایک سیاسی بیانیہ نہیں ہے بلکہ یہ علم فطرت کے ماہرین کا ایک مجلہ بھی سمجھا جاتا ہے اس کے سفر کردہ علاقوں کے حیوانات و نباتات کی تفصیلات صریح اور بصیرت افروز ہے۔
- اس اکائی کے پڑھنے کے بعد ہمیں معلوم ہوا کہ ہمایوں نامہ گلبدن بیگم کی شاہکار تصنیف ہے جو انہوں نے اکبر کی فرمائش پر تحریر کیا تھا بعد میں یہ علامہ ابوالفضل کے لیے بڑی معاون ثابت ہوئی۔
- اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ کتاب ایک شاہی گھرانے کی عورت کی تصنیف ہے۔ ان کی تحریر کردہ باتیں بڑی مستند ہیں ۔انہوں نے اس میں ان معلومات کو یکجا کیا ہے جو دوسروں کے یہاں بالکل نایاب ہے۔
- گلبدن بیگم کے ہمایوں نامہ سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ہمایوں نے کامران کو سمجھانے کے لیے خانزادہ بیگم کو بھیجا تھا۔ ہمایوں نامہ کی اکلوتی کاپی لندن کے برٹش میوزیم میں موجود ہے۔
- اس اکائی سے ہمیں معلوم ہوا کہ تزک جہانگیری میں جہانگیر نے اپنی حکمرانی کے بارہ سالوں کی تاریخ اپنے ہاتھوں سے لکھی ہے۔ بعد میں انیسویں برس تک کی تاریخ معتمد خان نے لکھا۔ محمد ہادی نے اسے آخر میں پورا کیا ہے۔
- محمد ہادی نے جہانگیر کے دور کا ذکر تتمۂ واقعات جہانگیری میں کیا ہے جو انتہائی معلومات افزا ہے۔ چونکہ بادشاہ نے اپنے ایام شہزادگی کے حالات قلم بند نہیں کیے تھے۔ اس واسطے یہ کتاب ناقص تھی۔ لہذا محمد ہادی نے ابتدا میں ایک مقدمہ تحریر کیا جس میں شہنشاہ کی ولادت سے لے کر تخت نشینی تک کے حالات درج کر کے کتاب کی تکمیل کی۔
- کتاب تزک جہانگیری کو خود شہنشاہ نورالدین محمد جہانگیر نے اپنے روزمرہ کے واقعات سے مزین کیا۔ اس لیے یہ کتاب نہایت ہی قابل قدر ہے۔ اس کتاب سے سترہویں صدی عیسوی کے متعدد تاریخی اور اہم واقعات و حالت کا علم ہوتا ہے جو برصغیر پاک و ہند میں وقوع پذیر ہوئے۔ انداز بیان سادہ، رواں، سلیس ہے۔ اس کا اردو ترجمہ مولوی سید احمد علی رامپوری نے بڑے شرح وبسط سے انجام دیا ہے۔
- تزک جہانگیری سے جہانگیر کی وسعت نظر کا پتہ چلتا ہے۔ اس کی دوراندیشی کی جھلک ہمیں دیکھائی دیتی ہے۔

15.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

تیمور	:	مشرقی ایشیا کا تیرہویں صدی کا ایک عظیم فاتح
تزک بابری	:	مغل سلطنت کے بانی بابر کی ذاتی خود نوشت
ہمایوں نامہ	:	ہمایوں کی بہن گلبدن بیگم کی ذاتی ڈائری
تزک جہانگیری	:	جہانگیر کی خود نوشت سوانح
سلیم	:	جہانگیر کا اصل نام

15.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

15.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. بابر کس جگہ کا رہنے والا تھا؟
2. تزک بابری کس زبان میں ہے؟
3. پہلی پانی کی جنگ کس سال میں لڑی گئی؟
4. بابر کا کیا تخلص تھا؟
5. گلبدن بیگم کہاں پیدا ہوئیں؟
6. گلبدن بیگم کی تصنیف کا کیا نام ہے؟
7. ہمایوں نامہ کس بادشاہ کی فرمائش پر لکھا گیا؟
8. تزک جہانگیری میں جہانگیر نے کتنے سالوں کے واقعات درج کیے؟
9. تزک جہانگیری کو کس نے مکمل کیا؟
10. تزک جہانگیری کس سن میں لکھی گئی؟

15.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. تزک جہانگیری پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔
2. بابر کے بارے میں مختصر نوٹ لکھیے؟
3. ہمایوں نامہ کی اہمیت بیان کیجیے۔
4. جہانگیر کی ذاتی زندگی کے بارے میں بتائیے۔
5. تزک بابری اور تزک جہانگیری کی لکھی ہوئی تحریروں کا موازنہ کیجیے۔

15.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. بابر بادشاہ کی تزک بابری پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. گلبدن بیگم کو مغلیہ دور کا اہم مئورخ کیوں مانا جاتا ہے۔
3. تزک جہانگیری کے انداز بیان پر روشنی ڈالیے۔

15.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. Beveridge, Annette., 'Introduction' to her translation, *The Babur-Nama in English (Memoirs of Babur)* at Internet Archive.
2. Crill, Rosemary and Jariwala, Kapil. *The Indian Portrait, 1560–1860*, National Portrait Gallery, London, 2010.
3. Losty, J. P., and Malini Roy, (eds.), *Mughal India: Art, Culture and Empire*, 2013, British Library.

اکائی 16۔ مغل عہد کے سفر نامے

(Travel Accounts of Mughal Period)

اکائی کے اجزا

16.0 تمہید

16.1 مقاصد

16.2 فادر اینٹونیو مونسریٹ

16.2 رالف فنچ

16.4 ولیم ہاکنز

16.5 ولیم فنچ

16.6 جون جورداں

16.7 نکولس ڈاؤنٹن

16.8 نکولس وتھنگٹن

16.9 تھامس کوریاٹ

16.10 سر تھامس رو

16.11 ایڈورڈ ٹیری

16.12 پیٹر اڈیلا ویلے

16.13 فرانسسکو پلسارٹ

16.14 جین بپٹسٹ ٹورنیئر

16.15 فرانسس برنیئر

16.16 پیٹر منڈی

16.17 منوچی

16.18 جین تھیوناٹ

16.19 اکتسابی نتائج
16.20 کلیدی الفاظ
16.21 نمونہ امتحانی سوالات
16.21.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
16.21.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
16.21.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
16.22 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

16.0 تمہید (Introduction)

عہدِ وسطیٰ کے درباری مورخین نے تاریخ نویسی کا ایک مخصوص نظریہ اختیار کیا تھا۔ دربار سے وابستہ اکثر مورخین تاریخ نویسی کا اصل مقصد صرف سیاسی تاریخ بیان کرنا تصور کرتے تھے۔ جب کہ تاریخ ایک ہمہ گیر مضمون ہے جس میں سیاسی، سماجی، معاشی، اقتصادی، تعلیمی، تہذیبی، ثقافتی اور انتظامی پہلو شامل ہوتے ہیں۔ درباری مورخین نے صرف تخت نشینی جنگوں، بغاوتوں، فتوحات اور بادشاہ کی دریادلی کو تفصیل سے بیان کیا۔ سماجی، معاشی اور اقتصادی حالات کو نظرانداز کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاصر مورخین کی کتابوں میں صرف سیاسی حالات ملتے ہیں جو ایک خاص رنگ وآہنگ کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں جو کسی بھی عہد کی مکمل تصویر نہیں بلکہ تاریخ کا محض ایک پہلو ہی پیش کرتے ہیں۔ جدید مورخین نے بھی سیاسی تاریخ کو بنا کسی تجزیے اور تنقید کے اختیار کیا۔ لین پول، اسمتھ، سر ولزلے ہیگ اور دیگر مورخین نے بھی تاریخ کو صرف جنگ وجدل کی صورت میں پیش کیا۔ انہوں نے ہندوستان کے سماج ومعاشرہ کے پس منظر کو نظرانداز کیا۔ ہندوستانی ذات پات کے نظام، طبقاتی اختلافات، قبیلائی تفریق، نسلی برتری اور زراعتی ڈھانچہ کی طرف دھیان نہیں دیا۔ عام لوگوں کی زندگی، ان کے تہذیب وتمدن کے مختلف پہلوؤں، اندرونی اور بیرونی اثرات ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ نویسی کے لیے ضروری ہیں۔ مغل عہد کے سماج ومعاشرہ کے مطالعہ کے لیے ہمیں یورپ کے سیاحوں کے سفرناموں سے کافی مواد فراہم ہوتا ہے۔ دراصل اس کمی کو مغل عہد میں ہندوستان آنے والے سیاحوں اور زائرین کے سفرناموں نے ہی پورا کیا ہے۔

برصغیر ہند میں عہدِ قدیم سے ہی مذہبی مبلغ، زائر اور سیاح آتے رہے ہیں۔ آج کے ترقی یافتہ دور میں تو پوری دنیا ایک عالمی گاؤں بن گئی ہے۔ چنانچہ سفارت کاروں، زائرین کا ان کی آمدورفت کا سلسلہ تاہنوز جاری ہے۔ میگس تھینیز، فاہیان، ہیون سانگ جیسے کئی سیاحوں اور زائرین نے ہندوستان کے بارے میں معلومات کا وہ بیش قیمتی ذخیرہ چھوڑا ہے جس پر ہماری تاریخی معلومات منحصر ہے۔ کچھ سیاحوں اور زائرین نے تو اپنی آپ بیتی اور سوانح عمری بھی لکھی ہے جو ہندوستان کی تاریخ کا اہم ماخذ ہیں۔ ترک فاتحین کے ساتھ بھی کئی نامور علما، امرا، دانشور،

صوفیا، سیاح، مبلغ اور زائر بھی آئے جن میں البیرونی، ابن بطوطہ اور عبدالرزاق وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مغل بادشاہوں کے دور میں بھی غیر ملکی سیاحوں اور زایرین کی آمد کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ ایران اور توران کے زائرین کے علاوہ کئی یوروپی سیاحوں نے مبلغوں، معالجوں اور تاجروں کی حیثیت سے ہندوستان کا رخ کیا۔ ان میں سے کچھ تو یہیں بس گئے اور کچھ اپنے ملک واپس لوٹ گئے۔ ان کے سفر ناموں میں ہندوستان کی تہذیب و ثقافت، صنعت و حرفت، تجارت و معیشت اور سماج و معاشرہ کے بارے میں بڑی اہم اور عمدہ معلومات ملتی ہیں۔ یہ بھی ایک مسلمہ سچائی ہے کہ ہندوستان کے لوگوں نے یہاں کے رسم و رواج کو اہمیت نہ دی۔ کیوں کہ وہ ان سے بخوبی واقف تھے لیکن یورپ کے سیاح اجنبی تھے۔ وہ یہاں کے رسم و رواج سے ناآشنا تھے۔ اس لیے انہوں نے یہاں کے رہن ہن، عادات واطوار، کھان پان وغیرہ کے بارے میں بڑی دلچسپی اور تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ ان کے سفر ناموں کا مقصد بادشاہ وقت کی تعریف و توصیف نہ تھا۔ فادر مونسریٹ، رالف فیچ، ولیم ہاکنس، ولیم فنچ، ٹیور نیر، برنیر، منوچی، ٹیری، تھامس رو، وغیرہ ایسے اہم یوروپی سیاح ہیں جنہوں نے ہندوستان کے بارے میں انتہائی اہم اور گراں قدر معلومات فراہم کی ہیں۔

16.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- مغل عہد میں ہندوستان آنے والے اہم یوروپی زائرین اور سیاحوں سے واقف ہو سکیں گے۔
- مغل ہندوستان کے بارے میں یوروپی سیاحوں کے بیانات کا جائزہ لے سکیں گے۔
- مغل دربار کی شان و شوکت کے بارے میں یوروپی سیاحوں کی آرا جان سکیں گے۔
- یوروپی سیاحوں کی نظر سے ہندوستانی سماج کا مطالعہ کر سکیں گے۔
- ہندوستان کی تجارتی سرگرمیوں کا جائزہ لے سکیں گے۔
- ہندوستان کے بارے میں یوروپی سیاحوں کے افکار و خیالات جان سکیں گے۔
- یوروپی سیاحوں کی دلچسپیوں کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- یوروپی سیاحوں کی فراہم کردہ معلومات کی اہمیت کو جان سکیں گے۔

16.2 فادر اینٹونیو مونسریٹ (Father Antonio Monserrate)

مغل عہد میں ہندوستانی دربار کی شان و شوکت اور یہاں کی صنعت و حرفت، تجارت و معیشت کی شہرت نے یورپی تاجروں، سوداگروں اور سیاحوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کی۔ چنانچہ کئی اہم سیاح، تاجر اور سوداگر ہندوستان آئے اور ہندوستان کے بارے میں اپنے ذاتی مشاہدے قلم بند کیے۔ ان سفر ناموں میں اگرچہ اس وقت کی سیاسی واقعات کی جھلک کم ملتی ہے لیکن اس وقت کے سماجی اور معاشی حالات پر کافی معلومات ملتی ہیں۔ فادر اینٹونیو مونسٹریٹ (1536-1600) ایک پرتگالی پادری اور جیسویٹ فرقے کا عیسائی مبلغ تھا۔ وہ اپنے دو

عیسائی پادری ساتھیوں فادر ایکواویوا(Father Acquaviva) اور فادر فرانسسکو ایزیکیز کے ساتھ مغل بادشاہ اکبر کے دربار میں حاضر ہوا تھا۔

مونسریٹ 17 نومبر 1579 کو گوا سے جیسوٹ مشن پر روانہ ہوا اور 4 مارچ 1580 کو مغل راجدھانی فتح پور سیکری پہنچا۔ چونکہ جیسویٹ مشنریوں کو اکبر نے مدعو کیا تھا لہٰذا شاہی دربار میں ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ فادر مونسیریٹ جلد ہی شہنشاہ کے بیٹے مراد کا اتالیق مقرر ہوا۔ 1581 وہ بادشاہ اکبر کے ساتھ کابل کی فوجی مہم پر روانہ ہوا۔ اس نے مغل فوجی دستے کے ساتھ پشاور اور جلال آباد کا بھی سفر کیا۔ مونسریٹ اپریل 1582 تک اکبر کے دربار سے وابستہ رہا اور بالآخر وہ گوا واپس لوٹ گیا۔

فادر مونسریٹ نے اپنے سفر کی پوری روداد اور تفصیلات ایک ڈائری کی شکل میں جمع کر کے بادشاہ اکبر کے حضور میں پیش کیا۔ جس میں اکبر کی شخصیت اور اس کے کردار کے بارے میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ مونسریٹ کے سفر نامہ میں اکبر بادشاہ کی شکل و صورت، لباس، ان کے مذہبی عقائد وغیرہ کی تفصیلات ملتی ہیں۔ اس نے اکبر کی ضیافت کے انتظامات، بے سہارا لوگوں کی تعلیم کے انتظامات، شہزادوں اور شہزادیوں کی تعلیم و تربیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کے مطابق شہزادوں اور شہزادیوں کی تعلیم پر بہت زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ جن شہروں، راستوں اور شاہراہوں سے مونسریٹ کا گزر ہوا ان کے بارے میں تفصیل سے لکھا۔ اس کی پیش کردہ تفصیلات مغل عہد کی تاریخ میں انتہائی اہمیت کی حامل ہیں۔ اس نے سورت، منڈو، سرونج، گوالیار، دہلی، سونی پت، سرہند، لاہور وغیرہ شہروں کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ہندوستان کے شہر دور سے دیکھنے پر بہت خوبصورت اور دیدہ زیب لگتے ہیں لیکن اندر سے دیکھیں تو تنگ اور بے ترتیب نظر آتے ہیں۔ گھروں میں کھڑکیاں نظر نہیں آتیں۔ لاہور شہر کے بارے میں وہ لکھتے ہیں ''یہ شہر اپنے رقبے، آبادی اور دولت کے لحاظ سے ایشیا یا یورپ کے کسی اچھے شہر سے کم تر نہیں ہے۔

یہاں دنیا کے ہر کونے سے تاجروں کا ہجوم ہے۔ بہت سا سامان باہر سے درآمد کیا جاتا ہے۔ شہر میں اتنے لوگ رہتے ہیں کہ یہاں سے وہاں جاتے وقت کندھے ایک دوسرے سے رگڑتے ہیں۔ قلعہ میں ایک بازار ہے، جس میں دھوپ اور پانی سے بچانے کے لیے لکڑی کی اونچی چھت ہے۔ لاہور کی ترقی یافتہ تجارت اور فن اور دستکاری کے بارے میں وہ لکھتے ہیں، "شاید ہی کوئی ایسا فن اور دستکاری ہو گا جو وہاں استعمال نہ ہو رہا ہو۔" ان کے مطابق لاہور کے لوگ اور خصوصاً کشمیری برہمن خوشحال ہیں۔

کابل مہم کے دوران مونسریٹ کو اکبر کے ساتھ جانے کا موقع ملا۔ طبیعت ناساز ہونے کی وجہ سے بادشاہ جلال آباد سے آگے نہ جا سکا اور اپنی فوج کے ساتھ واپس آ کر لاہور میں ڈیرہ ڈال لیا۔ اس طرح فادر مونسریٹ کو مغل فوج اور چھاؤنی کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملا۔ اس نے دیکھا کہ کیمپ کی ترتیب ہمیشہ ایک جیسی رہتی ہے۔ شاہی کیمپ صاف اور کھلی جگہ پر واقع ہے۔ کیمپ کے دائیں اور بائیں اس کے بڑے بیٹے اور خاندان کے دیگر افراد، امرا اور رئیس ہیں۔ دوسری سطر میں بھی شہزادوں اور امیروں کے خیمے ہیں۔ ان کے پیچھے باقی فوجیوں کے خیمے ہیں۔ تمام کیمپوں میں مختلف باورچی ہیں۔ بادشاہوں، شہزادوں، امیروں کے لیے بھی الگ الگ بازار ہیں جنہیں اردو کہا جاتا ہے۔

مونسریٹ نے بادشاہ کے فوجی لشکر کی بہت خوبصورت منظر کشی کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ رسد شہر، دیہات اور چاروں طرف سے آتی تھی۔ دشمن کے علاقے میں بھی ان چیزوں کی کمی محسوس نہیں کی گئی۔ صفائی کا کام کرنے والے اور سرنگوں کے سپاہی بھی فوج کے ساتھ جایا کرتے تھے جو زمین کو ہموار کرتے تھے۔ ان کا کام ایک الگ افسر دیکھتا تھا۔ دریا پار کرتے وقت کشتیوں کو رسیوں سے باندھ کر بیڑا بنایا جاتا تھا۔ ان پر درخت ٹہنیاں، جھاڑی، چھاڑ اور ٹارٹس بچھائے گئے تاکہ فوج آسانی سے اس پر سے گزر سکے۔ گھڑ سوار رسالے، پیدل فوجی دستے اور بار برداری کرنے والے افراد مختلف اوقات میں قطار بنا کر دریا عبور کرتے تھے۔ پلوں پر آمد و رفت کی نگرانی اور دیکھ ریکھ کے لیے الگ افسر متعین تھے۔ ہاتھیوں کو پل کے اوپر سے گزرنے کی اجازت نہیں تھی۔

مغل حکومت کے انتظامی امور سے متعلق مونسریٹ نے اہم تفصیلات اور ناقابل فراموش معلومات فراہم کی ہیں۔ مثال کے طور پر اس نے لکھا ہے کہ مغل حکومت میں عدالت کی کارروائیوں کی تفصیلات کا ریکارڈ رکھنے کا رواج تھا۔ اس کام کے لیے چار پانچ سیکرٹری متعین تھے جو شاہی خزانے میں ہونے والے ہر ایک لین دین کی مکمل تفصیلات لکھتے تھے۔ چونکہ اس زمانے میں گھوڑوں کی تجارت انتہائی اہم تھی۔ لہٰذا شاہی اجازت کے بغیر گھوڑوں کی تجارت کی اجازت نہیں تھی۔ مونسٹریٹ نے عدالتی نظام، ڈاک سسٹم، پانی کی گھڑی، گھڑیال اور نوروز کے تہوار کے بارے میں بھی کافی اہم اور عمدہ معلومات فراہم کی ہیں۔ مغل بادشاہ اور اس کے دربار کے علاوہ عام لوگوں کے کام اور روزمرہ کی زندگی کے بارے میں بھی مونسریٹ اہم اطلاعات فراہم کرتا ہے۔ اس نے جلال آباد کے باشندوں اور سورت کے پارسیوں کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ انتہائی محنتی اور جفاکش ہوتے ہیں۔ مونسریٹ نے ان کے مذہبی عقائد و توہمات کی تفصیل پیش کرتے ہوئے بالنائی فرقے کے بارے میں جو تفصیلات پیش کی ہیں وہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اکبر بادشاہ اس فرقے کے مذہبی رہنما کا عقیدت مند تھا۔ اکبر خود اس فرقہ کے بڑے مہنت سے ملنے "ننگے چہرے اور کھلے بالوں" سے ملنے گیا۔ ستی کے بارے میں مونسریٹ کا بیان ابنِ بطوطہ کے خیالات سے ملتا جلتا ہی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ پہلے بیواؤں کو بے ہوش اور بے سکون کیا جاتا تھا تاکہ انہیں جلنے کا درد محسوس نہ ہو اور پھر نیم بے ہوشی کے عالم میں انہیں مناجاتوں، دعاؤں اور آنے والی زندگی میں مکتی پانے کی یقین دہانیوں کے ساتھ چتا پر پھینک دیا جاتا تھا۔ اکثر انہیں چتا پر بیٹھنے پر مجبور کیا جاتا تھا اور اگر وہ چتا سے چھلانگ لگا کر فرار ہونے کی کوشش کرتیں تو انہیں لاٹھیوں اور بلیوں سے زدوکوب کر کے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا جاتا تھا۔ فادر مونسریٹ نے مانڈو کی رتھ سپ تمی، نرکی ہولی اور مسلمانوں کے محرم کے ماتمی رسومات کا بھی ذکر کیا ہے۔

16.2 رالف فنچ (Rolf Finch)

رالف فنچ (1585-91) ہندوستان آنے والا پہلا برطانوی سیاح تھا جو بادشاہ اکبر کے عہدِ حکومت میں ہندوستان آیا تھا۔ وہ پہلا انگریز سیاح ہے جس نے ہندوستان کے لوگوں، ان کے رہن سہن، لباس اور رسم و رواج کے بارے میں لکھا ہے۔ اس نے دور دور تک سفر کیا۔ وہ ہگلی، چٹاگانگ، پیگو اور شیام پہنچا۔ اس کے مطابق گجرات کا مرکزی شہر کھمبائٹ تھا۔ یہ ایک بڑا اور گنجان آبادی والا شہر تھا۔ یہ ایک منظم اور منصوبہ بند شہر تھا۔ جس کی آبادکاری منظم تھی اور شہر میں پرندوں، کتوں اور بلیوں کے لیے بھی کئی ہسپتال تھے۔ برہان پور میں بڑی مقدار میں

سوتی کپڑا بنا جاتا تھا۔ کپڑے چھپائی کا کام بھی بڑے پیمانے پر کیا جاتا تھا۔

رالف فیچ نے اکبر کی راجدھانی آگرہ کی بڑی تعریف کی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ آگرہ ایک بڑا شہر ہے۔ اس کے مکانات پتھروں سے تعمیر کیے گئے ہیں اور اس کی گلیاں کافی چوڑی اور کشادہ ہیں۔ فتح پور سیکری آگرہ سے بڑا ہے۔ آبادی کے لحاظ یہ دونوں شہر اس وقت لندن سے بھی بڑے اور اس سے زیادہ پر رونق تھے۔ بنارس ایک بڑا شہر ہے۔ اس کے گھر صاف ستھرے ہیں جو دریا کے کنارے پر واقع تھے۔ بنارس میں بہت سے مندر ہیں۔ بنارس سوتی کپڑوں کی صنعت کاری کا ایک بہت بڑا مرکز ہے. پٹنہ میں روئی، کا کاروبار ہوتا ہے۔ بنگال میں چینی اور افیون کا کاروبار ہوتا ہے۔ یہاں اس کے بڑے بازار ہیں۔ پٹنہ کے قریب سونے کی کانیں ہیں۔ فیچ نے گولکنڈہ کے لوگوں کے ملبوسات اور گنگا کی وادی کے باشندوں کے بارے میں بھی اہم معلومات فراہم کی ہیں۔

شادی بیاہ کی رسموں کے بارے میں رولف فیچ لکھتا ہے کہ ہندوستان میں کم سنی (بچپن) کی شادی کا بڑا رواج تھا۔ اپنے سفر نامہ میں وہ بیان کرتا ہے کہ اس نے خود برہان پور میں ایسی ہی ایک بچپن کی شادی دیکھی تھی۔ فیچ نے بنارس میں ایک شادی کی تقریب کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس نے لوگوں کے مذہبی عقائد اور توہمات کا بھی تفصیلی ذکر کیا ہے۔ اگر کوئی عورت ستی ہونے سے انکار کر دیتی تو اسے ستی پر مجبور نہیں کیا جاتا ہے۔ اس صورت میں اس کا سر مونڈ دیا جاتا ہے،۔ یہ رواج بنارس کے علاوہ ہندوستان کے کئی اور مقامات پر بھی تھا۔ فیچ نے مغل دربار اور اس وقت کے مغل بادشاہ کا سرسری طور پر ذکر کیا ہے۔

16.4 ولیم ہاکنز (Captain William Hawkins)

ولیم ہاکنز (1608-1613) ایک برطانوی تاجر، ایسٹ انڈیا کمپنی کا ملازم اور ہندوستان میں کمپنی کا سفارت کار تھا۔ جو ہندوستان میں پہلا برطانوی جہاز 'ہیکٹر' جس کا وہ کمانڈر تھے لے کر 24/اگست 1608 کو سورت کی بندرگاہ پہونچا۔ دراصل برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی سورت میں ایک فیکٹری قائم کرنا چاہتی تھی۔ جس کے لیے وہ مغل بادشاہ جہانگیر سے باقاعدہ منظوری حاصل کرنا چاہتی تھی۔ کمپنی نے ولیم ہاکنس کو مغل بادشاہ کے دربار میں بھیجا، وہ 1609 میں مغل بادشاہ جہانگیر کے دربار میں آگرہ پہونچا۔ جہانگیر نے اس سے ایک معقول فیس کا مطالبہ کیا جس کو اس نے منظور کر لیا۔ چنانچہ وہ ہندوستان میں 1608 سے 1613 تک مقیم رہا۔ وہ فارسی زبان بہت اچھی طرح جانتا تھا اور جہانگیر کی طرف سے دی جانے والی شراب کی محفلوں میں اکثر مدعو کیا جاتا تھا۔ وہ جہانگیر سے بہت متاثر ہوا۔ ہاکنز کی تفصیل کی اہمیت اس لیے ہے کہ اس نے سب کچھ بطور عینی شاہد کے دیکھا اور پھر لکھا۔ خاص طور پر جہانگیر کی شخصیت اور معمولات کے بارے میں اس کا بیان بہت معتبر ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ بادشاہ کو زیورات کا شوق تھا۔ وہ کس دن اور کتنے ہیرے اور جواہرات پہننے کا حساب سے تقسیم کیے گئے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی تسبیح (مالا) قیمتی موتیوں، یاقوت، ہیرے، زمرد اور مرجان سے بنی تھی۔ روزانہ کی نماز (نماز) کے بعد جہانگیر باہر نکلتا اور جھروکا کے درشن دیتا۔ تین بجے کے قریب وہ دربار عام منعقد کرتا۔ وہ وہاں دو گھنٹے ٹھہر کر تمام مقدمات کی سماعت کرتا تھا، پھر وہ دیوانِ خاص میں چلا جاتا، جہاں صرف وہی لوگ آ سکتے تھے جو بادشاہ کے خاص تھے۔

ولیم ہاکنز نے بادشاہ کی دولت کی تفصیلات بھی پیش کی ہیں جس میں اس نے تمام قیمتی چیزوں کو شمار کیا ہے، جیسے ہیرے جواہرات، آلاتِ حرب وضرب، ہتھیار، ہیرے جواہرات سے جڑے ہودے، کاٹھیاں، قیمتی ظروف اور برتن، جس میں سراحیاں، کٹورے، شراب کے پیالے اور رکابیاں وغیرہ شامل تھے۔ اس نے شاہی جانوروں کے بارے میں بھی تفصیل سے لکھا ہے جس میں ہاتھی اور فارسی، ترکی اور کشمیری گھوڑوں کی تفصیلات بھی شامل ہے۔ ہاکنس نے لکھا ہے کہ جہانگیر کے حرم کا روزانہ کا خرچ تقریباً تیس ہزار روپے تھا۔ عدالت جہانگیری اور عدالتی قوانین کو بھی ہاکنز نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ بادشاہ خزانے اور شیروں کے علاوہ ہر بقیہ تمام چیزوں کا ہر روز معائنہ کرتا تھا۔ جب کوئی امیر مر جاتا تو اس کی پوری جائیداد بادشاہ کا حق بن جاتی تھی۔ لیکن وہ ان کی اولاد اور وارثین کے ساتھ اچھا سلوک کرتا تھا۔ بیوہ عورتوں کی ستی پر اس کی گہری نظر تھی۔ آگرہ میں کوئی بھی عورت اس کی اجازت کے بغیر ستی نہیں ہو سکتی تھی۔

ولیم ہاکنس نے ہندوستان کی دولت و ثروت کا تذکرہ خصوصیت کے ساتھ کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ ہندوستان چاندی کے حصول کے معاملہ میں بہت متمول ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سبھی ملکوں کے تاجر اور سوداگر اپنے سکوں کے بدلے میں یہاں سے سامان خرید کر لے جاتے ہیں۔ ہر حال میں چاندی یہاں آتی ہے لیکن یہاں سے باہر نہیں جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر کے دور میں ہندوستانی صنعت و تجارت کافی ترقی پر تھی۔ دنیا بھر کے بیوپاری اور ساہوکار سامان خریدنے خود ہندوستان آتے تھے۔ ہندوستانی بیوپاریوں کو اپنا سامان بیچنے یا اس کی تشہیر کرنے کے لیے کہیں اور نہیں جانا پڑتا تھا۔ ولیم ہاکنس کے بیانات اور اس کی پیش کردہ معلومات کافی اہمیت کی حامل ہیں۔ یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہئے کہ جہانگیر سے تجارت و سوداگری کا اجازت نامہ حاصل کرنے کے بعد سے ہی برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں اپنے ناپاک عزائم کو رفتہ رفتہ مضبوط کرنا شروع کیا تھا۔

16.5 ولیم فنچ (William Finch)

ہاکنس کی طرح ولیم فنچ (1608-1612) بھی ایک برطانوی اہل کار تھا جو اگست 1608 میں ہاکنز کے ساتھ سورت پہنچا۔ اس کا سفر نامہ ''طویل ماہنامہ'' کے نام سے معروف ہے جسے پرکس نے مکمل طور پر شائع کیا ہے۔ ولیم فنچ کا یہ سفر نامہ مغل بادشاہ جہانگیر کے عہد کی سماجی تاریخ کا ایک نادر مرقع ہے۔ اس میں ولیم فنچ نے انسانوں، جانوروں، پودوں، شہروں، قلعوں، علاقوں، مذہبی عقائد وغیرہ کو ایک تجریدی لیکن زیادہ مستند انداز میں بیان کیا ہے۔ ایسی تفصیلات کسی اور سیاح کے سفر نامے میں نہیں ملتی ہیں۔ فنچ نے ہندوستان کے تین سب سے اہم اور بڑی تجارتی شاہراہوں اور اس کے گرد و نوح کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

- سورت-آگرہ تجارتی شاہراہ (برہان پور کے راستے)
- آگرہ-احمد آباد تجارتی شاہراہ
- آگرہ سے لاہور-کابل شاہراہ

ولیم فنچ نے ان تجارتی شاہراہوں اور راستوں میں آنے والے تمام اہم مقامات اور ان کی اہم خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ فنچ نے سورت،

برہان پور، منڈو گڑھ، اجین، سارنگ پور، سرونج، نارواراور گوالیار کے بارے میں تفصیلات پیش کی ہیں۔ فنچ پور سیکری کے حوالے سے انہوں نے لکھا کہ ''یہاں ایسی بہت سی عمارتیں موجود ہیں جن میں اب کوئی نہیں رہتا۔ خالی پڑی آراضیاں باغات میں تبدیل ہو چکی ہے، بہت سی بوئی ہوئی زمینوں پر نیل اور دیگر غذائی اجناس اگائے جاتے ہیں، وہاں کھڑا شخص محسوس نہیں کر سکے گا کہ وہ شہر کے بیچوں بیچ کھڑا ہے۔ اس کے مطابق فتح پور سیکری میں مغل بادشاہ اکبر کا تعمیر کروایا ہوا ''بلند دروازہ'' اس کے خیال میں غالباً پوری دنیا میں سب سے اونچا اور عظیم ترین دروازہ ہے۔

ولیم فنچ نے آگرہ کے قلعے کے بارے میں بھی نہایت عمدہ اور کارآمد تفصیلات بیان کی ہیں۔ اپنے سفر نامہ میں وہ لکھتا ہے کہ اس وقت بادشاہ آگرہ کے قلعے میں رہتا تھا۔ فنچ نے لاہور کو مشرق کا سب سے بڑا شہر سمجھا ہے۔ یہاں کے رہنے والے زیادہ تر بنیا اور کاریگر تھے۔ انہوں نے لاہور کے محل کا تفصیلی احوال پیش کیا ہے۔ سب سے اہم تفصیل محل کی دیواری تصویروں (فریسکوز) خاص طور پر جہانگیر کی آرام گاہ میں موجود فریسکوز کا پیش کیا ہے۔ ان پینٹنگز میں بادشاہ جہانگیر، ان کے شہزادے اور دیگر اہم امراء کو دکھایا گیا ہے۔ فنچ نے جہانگیر کی روزمرہ کی سرگرمیوں اور گوالیار، رنتھمبور اور روہتاس کے جیلوں کے بارے میں دلچسپ معلومات فراہم کی ہیں۔ اس کے مطابق روہتاس جیل میں عمر قید کی سزا کاٹ رہے امیر طبقے کے قیدیوں کو رکھا جاتا تھا۔ اس قید خانے سے کوئی بڑا ہی خوش قسمت قیدی زندہ باہر نکلتا تھا۔ جن قیدیوں کو دو ماہ کے اندر پھانسی کی سزا سنائی جاتی تھی انہیں رنتھمبور کی جیل میں رکھا جاتا تھا۔ ولیم فنچ ایک واحد سیاح ہے جس نے انارکلی کے افسانے کا ذکر کیا ہے۔ ولیم فنچ کا یہ سفر نامہ عہدِ جہانگیری کے حالات وواقعات کو جاننے کا ایک اہم ذریعہ اور ماخذ ہے۔

16.6 جون جورداں (John Jordan)

پرتگالی سیاح جان جورداں (1608-1617) مغل بادشاہ جہانگیر کے عہد میں 1608 میں ہندوستان آیا۔ اس نے کروڑ، دتہ، بیرا، بھدوار، یاول، بہادر پور، اکبر پور، مانڈو، سارنگ پور، سرونج، گوالیار، احمد آباد، کیمبے (کھمبات) اور آگرہ وغیرہ جیسے شہروں کا سفر کیا تھا۔ اپنے سفر نامہ میں اس نے لکھا ہے آگرہ دنیا کے بڑے شہروں میں سے ایک تھا، جہاں بہت ساری عمدہ اور اچھی سرائیں موجود ہیں۔ کوئی بھی مسافر معمولی قیمت پر ان سرائے میں ٹھہر سکتا تھا۔ جوردانے سورت-برہان پور-آگرہ تجارتی شاہراہ اور آگرہ-کھمبات تجارتی شاہراہ کا تفصیلی ذکر کیا ہے جو اس دور کے بڑے تجارتی راستوں میں سے تھے۔ جان جورداں نے برہان پور میں مغل فوجی چھاؤنی کے حفاظتی انتظامات بارے میں وہ جو معلومات پیش کی ہیں وہ انتہائی اہم اور قابل ذکر ہے: وہ لکھتا ہے کہ اس چھاؤنی میں ہم خود کو پوری طرح محفوظ محسوس کرتے ہیں۔ چھاؤنی کے انتظامات نے ہمیں زیادہ تحفظ کا احساس فراہم کیا ہے۔ اس سے بہتر اور عمدہ انتظام میں نے کہیں اور نہیں دیکھا۔ یہاں ہماری ضروریات کی ہر شے وافر مقدار میں دستیاب ہے۔ برہان پور میں قیمتی پگڑیاں، ریشم اور زری کے پٹکے، چھینٹ، بیریمی اور زربفت نامی اشیا تیار کی جاتی ہیں۔

آگرہ کے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ آگرہ ایک بڑا تجارتی مرکز ہے۔ دنیا کے کونے کونے سے تاجر یہاں آتے ہیں اور کوئی ایسی چیز نہیں

ہے جو چاہو اور وہاں دستیاب نہ ہو۔ احمد آباد کے بارے میں لکھتا ہے کہ احمد آباد کپڑے کی تجارت کا ایک بڑا مرکز تھا۔ احمد آباد بنیادی طور پر بافتہ، چھینٹ بنامی اور دیگر قسم کے کپڑوں کی تجارت ہوتی ہے۔ تجارت کے لحاظ سے کھمبات ہندوستان کا ایک بہت اچھا اور انتہائی خوبصورت شہر ہے۔ وہاں پر زیادہ تر پرتگالی تجارت کرتے ہیں۔ جان جورداں کا یہ سفر نامہ مغل عہد کے اہم شہروں اور ان کی تجارتی سرگرمیوں کی اہم تصویر پیش کرتا ہے۔

16.7 نکولس ڈاونٹن (Nicholos Doughton)

نکولس ڈاونٹن (1608-1615) مسافر ایک برطانوی بحری بیڑے کا کپتان تھا، جو مغل بادشاہ جہانگیر کے دور میں 1614 عیسوی میں ہندوستان پہنچا تھا۔ وہ مغل بادشاہ کے لیے شہنشاہ جیمز کا ایک مکتوب بھی لایا تھا۔ لیکن بد قسمتی سے وہ آگرہ نہیں جا سکا کیونکہ گجرات کے صوبیدار مقرب خان کو اس سے پرُخاش تھی۔ دراصل گجرات کا صوبیدار مقب خان یہ چاہتا تھا کہ ڈاونٹن پرتگالیوں کے خلاف مغلوں کی مدد کرے لیکن ڈاونٹن نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن بعد میں اسے پُرتگالیوں سے لڑنا پڑا۔ اس جنگ میں اسے فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی۔ اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد وہ اپنے بحری بیڑے کے ساتھ ایسٹ انڈیز چلا گیا۔ وہ ہندوستان میں بہت مختصر وقفہ کے لیے رہا اور صرف گجرات کی حدود تک ہی محدود رہا۔ اس کا سفر نامہ گجرات اور خاص طور پر سورت سے متعلق ہے۔ اس نے گجرات خاص کر سورت میں رہنے والے بنیوں اور مسلمانوں کے رہن سہن، کھان پان، عادات و اطوار، کھیل کود اور تفریح کے وسائل اور ذرائع پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس نے مسلمان مغنیہ خواتین کے گانوں کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اونچی اور تیز آواز میں گانے کے باوجود ان کی آواز بہت سریلی ہے۔ اس کے رودادِ سفر سے اہم معلامات ملتی ہیں۔

16.8 نکولس وتھنگ ٹن (Nicholos Withington)

نکولس وتھنگ ٹن، ڈاوٹن (1612-1616) کا خادم تھا جو ڈاوٹن کے ہمراہ ہندوستان آیا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دورِ اقتدار میں اسے سورت آنے کا موقع ملا۔ اس نے گجرات کے بہت سے مقامات کی سیاحت کی اور یہاں کے باشندوں کے حالات و واقعات کو جاننے کی کوشش کی۔ 1614 میں وہ اس وقت کی مغل راجدھانی آگرہ پہونچا تاکہ "نیل کی تجارت میں سرمایہ کاری کرنے اور جان مینسن ہال کی کارروائی کے بارے میں رپورٹ پیش کرے۔" چنانچہ وہ ہندوستان کے جن علاقوں اور خطوں میں گیا وہاں کے لوگوں اور ان کی سماجی، معاشی اور مذہبی حالات کو قلم بند کیا۔ ان کا یہ سفر نامہ 1735 میں لندن میں Trectate کے نام سے شائع ہوا۔ اس نے لکھا ہے کہ گجرات کا سب سے بڑا شہر احمد آباد ہے اور یہ لندن کے برابر ہے۔ ہر طرف سے تاجروں کا ہجوم رہتا ہے۔ یہاں زری، چاندی کا کپڑا اور مخمل کا کپڑا بنایا جاتا تھا۔ احمد آباد دوائیوں کی تیاری کا مرکز بھی تھا۔ سر کھیج نیل کی تجارت اور بیوپار کا اہم مرکز ہے۔ وِتھنگ ٹن کے مطابق اجمیر بہت بڑا شہر ہے اور اس کا بیان ہے کہ اس نے اتنا بڑا شہر پہلے نہیں دیکھا ہے۔ اس نے سندھ کے راجپوتوں کے لباس اور پہناوؤں کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ راجپوتوں میں ستی کا رواج تھا۔ اس نے ستی ہونے والی عورتوں کی ہمت اور بہادری کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''وہ (ستی ہونے والی) چتا کے درد کو اتنے

صبر سے برداشت کرتی ہے کہ اس کی تعریف کرنی پڑتی ہے۔''

وِنگٹن کے مطابق اس وقت بنیوں کی دس ذیلی ذاتیں اور برادریاں موجود ہیں۔آپس میں ان میں اتنا فرق تھا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ کھانا بھی نہیں کھاتے ہیں۔ان میں ستی کا رواج نہیں ہے۔بیوہ صرف بال منڈواتی ہے۔اس نے مزید لکھا ہے کہ بنیوں میں بچپن کی شادی کا رواج تھا جو صرف تین سے چار سال کی عمر میں ہوتا تھا۔اس کے سفر نامے سے اس عہد کے سماجی حالات پر روشنی پڑتی ہے۔

16.9 تھامس کوریاٹ (Thomas Coryat)

تھامس کوریاٹ(1612-1619)جہانگیر کے عہد میں ہندوستان آنے والا وہ اہم برطانوی سیاح تھا جس نے بحری سفر کے بجائے زمینی راستے سے ہندوستان کا سفر کیا۔ تھامس کوریاٹ نے اپنے سفر نامہ میں دورہ ہندوستان کی واضح تفصیل پیش کی ہے۔اس نے لکھا ہے کہ اسے مغل بادشاہ جہانگیر اور سر تھامس رو سے ملنے کا موقع ملا تھا۔اسے جہانگیر کی روزمرہ کی زندگی،درباری سرگرمیوں، شکار اور تفریح کے ذرائع کے بارے میں اپنے سفر نامے میں تفصیل سے لکھا ہے۔اس نے ''جھروکہ درشن''اور ''تول دان''کا بھی وضاحت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔اس نے لکھا ہے کہ تول دان کا تہوار بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔اس موقع پر بادشاہ سونے کے ترازو پر بیٹھتا ہے۔ بادشاہ کو سونے چاندی کے سکوں میں تولا جاتا ہے اور ان سکوں کو غربا اور مساکین میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ مینا بازار کے بارے میں لکھتا ہے کہ۔ مینا بازار ایک قسم کا میلہ ہے جس میں صرف خواتین ہی شرکت کرتی ہیں۔

16.10 سر تھامس رو (Sir Thomas Roe)

تھامس رو(1615-1619)ہندوستان آنے والا برطانیہ کا ایک اہم سفیر تھا جو 1616 میں مغل بادشاہ جہانگیر کے دربار میں آگرہ پہونچا۔ وہ جہانگیر بادشاہ کے ساتھ مانڈو،احمد آباد،اجمیر جیسے کئی مقامات پر اس کا ہم سفر رہا اور کئی موقعوں پر بادشاہ کے ساتھ شکار پر بھی گیا۔ چنانچہ اسے بادشاہ کو اور اس کی دلچسپیوں کو قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ تقریباً ایک سال آگرہ میں مقیم رہا۔1619 میں وہ بادشاہ کے اس فرمان کے ساتھ برطانیہ واپس گیا کہ مغل دربار میں انگریزوں کا اسی طرح استقبال ہوتا رہے گا۔ہندوستان میں اس کی موجودگی اور بادشاہ کے ساتھ اس کے تعلقات اور اس کے سفر نامہ کی تفصیلی روداد ہیکلویٹ سوسائٹی (Hakluyt Society) لندن نے شائع کی ہے۔ ٹامسرو کا یہ سفر نامہ جہانگیر کے عہد کا ایک اہم دستاویز ہے۔

تھامس رو نے اپنے سفر نامہ میں مغل دربار اور جہانگیر کے بارے میں تفصیل سے بات کی ہے۔اس نے جہانگیر کے مذہبی خیالات، اس کے عقائد و نظریات کے بارے میں بھی لکھا ہے۔ تھامس رو کا بیان اس لیے بھی اہم ہے کہ یہ بادشاہ کے سیکولر نقطہ نظر پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس کے مطابق بادشاہ تمام مذاہب سے مطمئن تھا اور سبھی دھرموں کا احترام کرتا تھا۔ لیکن اسے مذہب تبدیل کرنے والے اشخاص پسند نہیں تھے۔

تھامس رو نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ جے پور کے قریب ٹوڈا نامی جگہ پر جہانگیر کی ملاقات ایک سادھو سے ہوئی۔ جہانگیر نے اس سادھو سے ایسی شفقت، عاجزی اور انکساری سے بات کی جو کسی بادشاہ کا شیوا نہیں ہوا کرتا تھا۔ اس نے اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا، جب کہ کوئی صاف ستھرا شخص اسے چھونے کی ہمت نہیں کرتا۔ اس کے سینے پر تین بار ہاتھ رکھا اور اسے باپ کہا۔ تھامس رو کے ساتھ بھی کئی بار جہانگیر ایسی ہی شفقت و مروت سے پیش آچکا تھا۔

تھامس رو نے جہانگیر کے ''جھروکہ درشن'' کی بڑی دلچسپ منظر کشی کی ہے۔ اس کی فراہم کردہ تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہی حرم کی خواتین بھی درشن کے وقت بادشاہ کے ساتھ جاتی تھیں۔ وہ جالی دار کھڑکیوں کے پیچھے بیٹھا کر جھروکہ درشن کے مناظر سے لطف اندوز ہوتی تھیں۔ تھامس رو نے لکھا ہے کہ وہ بادشاہ کے ساتھ دو بار آگرہ اور مانڈو میں منائے جانے والے یوم ولادت کی تقریب میں بھی شریک ہوا۔ جس کا منظر انتہائی خوشنما اور دلفریب تھا۔ اس نے لکھا کہ بارہ ہاتھیوں کی سواری، جن پر ہیروں اور جواہرات سے جڑے جھول پڑے ہوتے، گوٹے اور کناری دار لہراتے جھنڈوں اور جھنڈیوں سے سجے سجائے، بادشاہ کے سامنے سے گزرے۔ ہاتھیوں نے بڑی خوبصورتی سے جھک کر بادشاہ کو سلامی پیش کی۔ تول دان کی رسم بھی ادا کی گئی۔ بادشاہ کو سونے، چاندی، ہیرے، جواہرات، ریشم اور زری کے کپڑوں اور مصالحوں وغیرہ سے تولا گیا۔

ٹھامس رو نے دربار میں حاضری کے آداب بھی بیان کیے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ کوئی بھی شخص دربار میں نشے کی حالت میں شاہی مشاورتی کمرے میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر کوئی شخص ایسا کرنے کی جرات کرتا تو اسے کوڑوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ کوڑا ایک زبردست ہتھیار تھا، جس کے ہینڈل کے دونوں طرف چار نوکیلی گرہیں تھیں اور ہر ضرب سے چار چار زخم آتے تھے۔ جہانگیر نے اپنے اہم امیروں کو اپنی چھوٹی سی تصویر میں بندھی چار انچ کی سونے کی لڑی پیش کرتا تھا۔ امیر طبقہ اس لڑی کو اپنی پگڑی میں لٹکا لیا کرتا تھا۔ تھامس رو نے بتایا کہ کسی بھی فوجی مہم پر جانے سے پہلے، بادشاہ کے ہتھیاروں کی سجاوٹ کی نمائش کی تقریب ہوتی اور کیمپ میں بادشاہ کی آمد کا اعلان کیا جاتا تھا۔ ٹامس رو کا یہ سفر نامہ مغل بادشاہ جہانگیر کی درباری سرگرمیوں کے علاوہ اس عہد کے سماجی اور معاشرتی حالات کو جاننے کا ایک اہم ذریعہ ہے اس سے نہ صرف جہانگیر کے روزمرہ کے معمولات کا پتہ چلتا ہے بلکہ درباری کام کاج، تیج تہواروں اور تقریبات کا بھی پتہ چلتا ہے۔

16.11 ایڈورڈ ٹیری (Edward Terry)

ایڈورڈ ٹیری (1616-1619) ایک برطانوی پادری تھا جس نے سر ٹامس رو کے ساتھ 1617 میں مانڈو اور احمد آباد کا سفر کیا تھا۔ اس کا سفر نامہ ''مشرقی ہندوستان کا بحری سفر A Voyage to East India کے نام سے کئی بار شائع ہو چکا ہے۔ اس نے مالوا اور گجرات کے بارے میں خاص طور پر لکھا ہے۔ اس کی فراہم کردہ معلومات میں دیگر شہروں کا بھی ذکر آیا ہے۔ مثال کے طور پر وہ ملتان کا ذکر کرتا ہے جہاں اچھے تیر کمان بنائے جاتے تھے۔ سینگوں سے بنی کمانوں کو اچھی طرح ایک دوسرے سے جوڑا جاتا تھا۔ تیر سرکنڈوں اور بینت سے بنائے جاتے تھے۔ دونوں کو اچھی طرح پینٹ کیا جاتا تھا۔ اتنے خوبصورت تیر کمان ہندوستان میں اور کہیں نہیں بنتے تھے۔

ایڈروڈ ٹیری کو مانڈو میں جہانگیر سے ملنے اور اس کے دیدار کا موقع ملا۔ اس نے بادشاہ کی شخصیت میں ظلم اور انکساری کا شاندار تضاد پایا۔ اس نے لکھا ہے کہ بادشاہ کبھی انصاف پسند اور رحمدل اور کبھی خوفناک حد تک ظالم نظر آتا ہے، دو متضاد صفتوں کا مرکب تھا۔ وہ مسلسل غریبوں کی مدد کرتا تھا۔ وہ اپنی ماں کا بہت احترام کرتا تھا۔ اور اس کے ساتھ فرض شناس تھا۔ جب وہ پالکی میں جاتی تو وہ اسے اپنا کندھا بھی دے دیتا، وہ بہت پیار کرنے والا تھا، لیکن جب وہ غصے میں آتا تو لوگوں کو اونچی آواز میں سناتا، شراب کے نشے میں کبھی کبھار لوگوں کو بلا کسی جرم کے سزا دلواتا اور کوڑے بھی مرواتا تھا۔ یہی رویہ اس کے امیروں کا بھی تھا۔

بادشاہ کے لباس اور پوشاک کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ بادشاہ کے کپڑے بہت مہنگے ہوتے تھے۔ مہنگے ہونے کے باوجود بادشاہ کے کپڑے روزانہ دھوئے جاتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ پوری دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا فرد ہو جو روزانہ اتنے کپڑے اور اتنے ہیرے اور جواہرات بدلتا ہو۔ گنگا کا پانی فراہم کرنے کی بابت لکھتا ہے کہ بادشاہ جس مقام پر ہوتا تھا اس کے لیے وہیں پر گنگا کے پانی کا انتظام کیا جاتا تھا۔ گنگا کا پانی لانے کے لیے علاحدہ افسر مقرر کیے گئے تھے۔ گنگا کے پانی کو ایسے خوبصورت تانبے کے برتنوں اور گھڑوں میں لایا جاتا تھا جن کے اندرونی حصے کو قلعی کیا جاتا تھا۔ ان گھڑوں میں پانی بھرنے کے بعد پانی برداروں کے حوالہ کرنے سے پہلے انہیں ٹانکہ لگا کر سیل بند کیا جاتا تھا۔

چاندی کی درآمد و برآمد کے بارے میں ٹیری لکھتا ہے کہ جس طرح تمام ندیاں پانی کو لے جا کر سمندر میں انڈیل دیتی ہیں۔ اسی طرح چاندی ہر طرف سے آکر شاہی خزانے میں جمع ہو کر وہیں ٹھہر جاتی ہے دنیا کے کونے کونے سے تاجر اپنے سونے کے بدلے مطلوبہ سامان خرید کر لے جاتے ہیں۔ ایسے تاجروں کو "ہمیشہ خوش آمدید" کہا جاتا ہے۔ نہ جانے کیوں چاندی کی برآمد کو جرم سمجھا جاتا ہے۔ ہر ملک کے شناسا یا نا معلوم افراد کو کاروبار کرنے کی ترغیب دی گئی لیکن انہیں چاندی لے کر ملک سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ دراصل ہندوستان ہی وہ واحد ملک ہے جہاں سونے کے بدلے تجارت ہوتی ہے۔ لیکن اس کا منافع مزید صنعت و تجارت میں نہیں لگایا جاتا ہے بلکہ یہ زیوروں یا دفینوں کی شکل میں زمین کے اندر گاڑ دیا جاتا ہے۔

ٹیری نے اس وقت کے سکوں کے سائز، قسم اور قیمت کی تفصیلات بھی دی ہیں۔ جو سونا چاندی باہر سے آتا تھا، اسے پگھلا کر صاف کیا جاتا تھا اور اس پر شاہی مہر لگا دی جاتی تھی۔ ''یہاں کے سکے دنیا کے کسی بھی ملک کے سکوں سے زیادہ خالص ہیں۔'' اس سکے کو روپیہ کہا جاتا ہے۔ مختلف قسم کے سکے تھیں جن کی قیمتیں بھی مختلف ہیں۔ ایک سکے کی قیمت دو شلنگ تین پینس ہے۔ بہترین سکہ نو پنس کے برابر دو شلنگ کا ہے۔ چاندی کے سکے یا تو گول یا مربع ہیں۔ وہ ٹھوس اور موٹے، ہوتے ہیں جو گھستے اور ٹوٹتے بھی نہیں ہیں۔ سونے کے قیمتی سکے بھی رائج ہیں، لیکن وہ عام طور پر روزمرہ کے استعمال کے لیے عوام میں نظر نہیں آتے تھے۔ "محمودی" نام کا مشہور سکہ گجرات میں چلتا ہے، جس کی قیمت صرف دو پینس ہے۔

انتظامی اور جنگی امور کے متعلق ٹیری نے بیان کیا ہے کہ صوبیداروں کا کام فوجداری مقدمات کا تصفیہ کرنا تھا، جبکہ قاضی معاہدوں، قرضوں اور کاروبار سے متعلق معاملات نمٹاتے تھے۔ ٹیری نے مغل چھاؤنی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عام لشکریوں کے خیمے عموماً سفید

ہوتے تھے جو لوگوں کے لباس کے رنگ سے ملتا جلتا تھا۔ شاہی خیمے کا رنگ سرخ ہوتا تھا۔ بادشاہ ایک دن میں دس میل سے زیادہ سفر نہیں کرتا تھا۔ ٹیری نے فوجیوں کے ہتھیاروں کی تفصیل پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ مغل اچھے گھڑ سوار ہیں اور اپنے سامان کی اچھی طرح دیکھ بھال کرتے ہیں۔ ہاتھیوں کو لڑائی کی تربیت دی جاتی ہے۔ وہ تقریباً 6 فٹ لمبی لوہے کی توپ کھینچ کر لے جاتے تھے۔ توپ لکڑی کی مضبوط چوکور کھانچے پر جڑی رہتی تھی۔ توپ گاڑی مضبوط رسیوں سے ہاتھی کے جسم سے کس کر باندھ دی جاتی تھی۔ ان توپوں کو ضرورت کے مطابق اوپر نیچے کیا جا سکتا تھا۔ مہاوت ہاتھی کی گردن پر بیٹھتا تھا جب کہ توپچی لکڑی کے چوکور کھانچے پر بیٹھتا تھا۔ توپ کے گولے ٹینس کی گیند کے برابر ہوتے تھے۔ جنگی ساز و سامان میں تیر کمان، تلواریں، ڈھالیں، بلم اور نیزے وغیرہ استعمال ہوتے تھے۔ مغل سپاہی اچھے نشانہ باز تھے۔ توپیں داغنے کے لیے مشعلوں کا استعمال کیا جاتا تھا۔ اعلانِ جنگ کے لیے ڈھول، نگاڑے اور موسیقی کے آلات استعمال کرتے تھے۔ نگاڑے گھوڑوں کی پیٹھ سے بندھے ہوتے۔

ایڈورڈ ٹیری نے مغل عورتوں کے لباس اور ان کے پہناؤں کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ان کے شوق اور دلچسپیوں کے ساتھ محلوں میں استعمال ہونے والے فرنیچر، ان کی آرام گاہوں، محل کے اندر اور باہر تفریح طبع اور دل بستگی کے ذرائع بھی بیان کیے ہیں اس نے لوگوں کے رہن سہن عادات واطوار، طور طریقوں رویے اور سلوک وغیرہ کے بارے میں بھی لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہاں کے لوگ اکثر مہذب طریقے سے پیش آتے ہیں اور اپنے بزرگوں کی اطاعت کرتے ہیں۔ وہ نئے فیشن پر یقین نہیں رکھتے اور اکثر اپنے آباؤاجداد کے رسم و رواج کی پیروی کرتے ہیں۔ ہتھیاروں سے مسلح ہونے کے باوجود وہ فصاحت کا دامن نہیں چھوڑتے ہیں۔

ہندوستانی فنونِ لطیفہ خصوصاً فن تعمیر پر ٹیری نے بڑی عمدہ روشنی ڈالی ہے۔ اس نے بتایا کہ ہندوستانی امرا اور روؤسا اپنے مکانات کی تعمیر میں اچھے ساز و سامان استعمال کرتے تھے۔ جیسے لکڑی، اینٹیں، مختلف قسم کے پتھر اور اچھے معیار کا سنگِ مرمر استعمال کرتے تھے۔ ان کے گھر زیادہ اونچے نہیں تھے، یعنی دو منزلہ سے زیادہ نہیں تھے۔ ان کی چھتیں سپاٹ اور موٹی تھیں۔ چھت کی مضبوطی کے لیے شہتیروں کا استعمال کرتے تھے۔ لوگ صبح و شام چھتوں پر ہوا خوری کے لیے چہل قدمی کرتے تھے۔ دو منزلہ مکانوں کی اوپری منزل کے کمرے عموماً بڑے اور کشادہ ہوتے۔ ہوا اور روشنی کے لیے دو دو دروازے بنائے جاتے تھے۔ غریب طبقے کے افراد کچے مکانوں یا جھونپڑیوں میں رہتے تھے، ان کی حالت بہت خستہ ہوتی تھی۔ ان کے مکانات ایک دوسرے سے سٹے ہوتے تھے۔ ان کی دیواریں بھوسا ملی ہوئی مٹی سے بنی ہوتیں تاکہ یہ دیواریں مضبوط کھڑی رہ سکیں۔ چھتیں نیچی اور ہموار ہوا کرتی تھیں۔ ان میں شہتیر کی جگہ بلیوں کا استعمال کیا جاتا تھا۔

ٹیری نے اس عہد کے آمد و رفت کے وسائل اور ذرائع پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس نے بتایا کہ مالدار طبقہ کے لوگ اپنی آمد و رفت کے لیے گھوڑے، خچر، اونٹ، بھینسا یا دو پہیوں کی گاڑیوں کا استعمال کرتے تھے۔ بیل گاڑیوں میں کوچوان کے علاوہ مزید چار افراد بیٹھ سکتے تھے۔ ان میں گھوڑوں کی طرح دو بیل جوتے جاتے تھے۔ جو یومیہ تقریباً بیس میل کا سفر طے کرتے تھے۔ ہندوستانیوں کے کھان پان کا ذکر کرتے ہوئے اس نے تمباکو کی زراعت اور اس کے استعمال کا خوبصورت نقشہ کھینچا ہے ٹیری نے بتایا ہے کہ یہاں تمباکو خوب کاشت کی جاتی

ہے لیکن لوگ اس کے طبّی فوائد سے ناواقف ہیں۔ وہ تمباکو نوشی کے لیے چلم یا حقہ استعمال کرتے ہیں۔ حقہ مٹی کا ایک برتن ہے جس کی گردن تنگ اور اوپری حصہ گول ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک نلکی لگی ہوتی ہے۔ حقے کے نچلے حصہ میں پانی سے بھرا رہتا ہے۔ برتن میں تمباکو کے پتے ڈال کر ان پر انگارے ڈالتے ہیں۔ نلکی کی مدد سے حقہ کا کش لیتے تھے۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ پانی یہاں کا بنیادی مشروب ہے۔ بسا اوقات وہ اس میں ایک قسم کی بیج ڈال کر ابالتے اور پھر ٹھنڈا کر کے استعمال کرتے ہیں۔ کبھی کبھار وہ شکر لیموں کا رس ملا کر پانی پیتے ہیں جسے شربت کہا جاتا ہے۔

ایڈورڈ ٹیری نے ہندوستان کے لوگوں کے کام کاج کے طور طریقے پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس نے مسلمانوں کو آرام طلب اور سست بتایا ہے جو کام کے وقت بھی شراب پیتے ہیں۔ اس کے برعکس ہندوؤں کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا کہ ہندو محنتی اور ایماندار ہوتے ہیں۔ ان کا (ہندوؤں) کا ماننا تھا کہ محنت سے کمائی ہوئی روٹی میٹھی اور باوقار ہوتی ہے۔ ہندوؤں کی بہت سی برادریاں مختلف دستکاریوں اور ہنر مندیوں میں مصروف تھیں۔ وہ جو بھی کام کرتے پوری محنت، لگن اور دلچسپی سے کرتے تھے۔ جس کسی کے یہاں کام کا ذمہ لیتے محنت اور دل لگا کر اچھی طرح انجام دیتے تھے۔ وہ ہر کام میں صحیح اور غلط کا پورا خیال رکھتے تھے۔ اکثر افراد خصوصاً بنیا برادری کے لوگ اپنے کھانے میں جاندار چیزوں کا استعمال نہیں کرتے ہیں۔ وہ اپنے کھانوں میں شکر قندی جیسی جڑی بوٹیاں، روٹی، دودھ، مکھن، پنیر، مٹھائی وغیرہ استعمال کرتے ہیں۔ اس نے راجپوتوں کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ لوگ سور کا گوشت کھاتے تھے، لیکن وہ کبھی بھی گائے کا گوشت استعمال نہیں کرتے تھے۔

ایڈورڈ ٹیری نے مغل عہد میں ہندوستان کی مختلف برادریوں، خاص طور پر مسلمانوں، ہندوؤں اور پارسیوں کی اہم خصوصیات اور ثقافتی سرگرمیوں پر تفصیل سے تبادلہ خیال کیا ہے۔ انہوں نے پارسیوں کو خوبصورت چہروں کے حامل قرار دیا ہے۔ ان کے مطابق تاتاری مضبوط قد کاٹھی کے موٹے تگڑے اور بہادر ہوتے تھے۔ ان کے چہرے اور ناک چپٹی ہوتی تھی۔ ان کی پوشاکیں کمر تک جسم سے کسی اور چمٹی ہوئی اور اس کے نیچے ڈھیلی ڈھالی اور گھٹنوں تک لٹکی ہوتیں۔ ان کا زیر جامہ باریک سفید کپڑوں سے بنا ہوا تھا۔ اکثر وہ اسی طرز کے لباس زیبِ تن کرتے تھے۔ عام عورتیں انگ رکھا (چادر) شلوار یا چوڑی دار پاجامہ پہنتی تھیں۔ بناؤ سنگار میں وہ اپنے بالوں کو فیتے سے باندھ کر پیچھے اپنی پیٹھ پر ٹکا لیتی تھیں۔ ہندوستانی خوتیں چادر یا برقعہ بھی پہنتی تھیں جو سفید ململ یا چھینٹ سے بنے ہوتے۔ مذہبی مولویوں اور ملاؤں کے علاوہ باقی سب داڑھیاں منڈواتے تھے لیکن لمبی مونچھیں رکھنے کا عام رواج تھا۔ مسلمان اپنے سروں کو منڈواتے تھے اور سفید سوتی کپڑے کا ایک پٹہ گردن میں حمائل کرتے یا اپنی کمر کے گرد لپیٹ لیتے تھے۔

ٹیری نے ہندوستانی دستکاروں کی مہارت اور ہنر مندی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہندوستانی دستکار سوتی کے قالین بنانے میں ماہر تھے۔ یہ لوگ رنگین قالینیں بھی بناتے تھے جن کی چوڑائی تین گز اور لمبائی اس سے زیادہ ہوا کرتی تھی۔ یہاں ریشمی اور زری کی قالینیں بھی بنائی جاتی تھیں جن میں ریشمی بیل بوٹے ڈیزائن کیے جاتے تھے۔ ہندوستانی کاریگر قیمتی ساز و سامان کی ڈبیاں، باکس اور تشت (سینیاں) وغیرہ بنانے میں بھی بہت ماہر تھے جن میں اندر اور باہر ہاتھی دانت کے خوبصورت ڈیزائن بنے ہوتے تھے۔ وہ انگریزی طرز کے جوتے،

کپڑے اور چادر بنانے میں بھی بہت ماہر تھا۔ ٹیری نے ہندوستان میں پیدا ہونے والے پھل کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ یہاں خربوزہ، تربوز، انار، لیموں، سنترہ، کھجور، انجیر، انگور، ناریل، کیلے، آم، انناس، خوبانی اور سیب جیسے پھل پیدا ہوتے ہیں۔ الغرض ایڈورڈ ٹیری نے ہندوستانی تاریخ کے ان پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جن کے بارے میں درباری تاریخی زیادہ معلومات فراہم نہیں کرتی ہیں

16.12 پیٹر اڈیلا ویلے (Pietro Della Valle)

پیٹر اڈیلا ویلے (1660-1622) ایک اطالوی سیاح تھا جو 1622 میں ہندوستان آیا۔ وہ گجرات کے مشہور شہر سورت پہنچا اور وہاں سے وہ کھمبات، احمد آباد، چل، گوا، اکادی، منگلور ہوتا ہوا کالی کٹ پہونچا۔ ''پیٹر اڈیلا ویلے کا یہ سفر نامہ ''ہندوستان میں پیٹر اڈیلا ویلے کا سفر نامہ''*The Travels of Pietro Della Valle in India* کے نام سے معروف ہے۔ ان کے اس سفر نامے کا پہلا ایڈیشن اطالوی زبان میں 1663 میں شائع ہوا۔ ان کے سفر نامے کو ایڈورڈ گرے نے ایڈٹ کیا ہے۔ اس مسافر کی یادداشتیں ہندوستان کے صرف ایک محدود علاقے سے تعلق رکھتی ہیں، لیکن وہ اس علاقے میں رہنے والے لوگوں کے طور طریقوں کا ایک جیتا جاگتا احوال پیش کرتی ہیں۔ انہیں مغل ہندوستان کے صرف تین شہر سورت، احمد آباد اور کھمبائت دیکھنے کا موقع ملا۔ اس نے لکھا ہے کہ سورت کے چنگی گھر (کسٹم آفس) کو "ڈوگانا" کہا جاتا تھا۔ وہاں کے اہلکار ہر چیز کو باریکی اور غور سے چیک کرتے تھے۔ وہ کسی اجنبی کو اس وقت تک اندر نہیں آنے دیتے جب تک کہ وہ اس کے بارے میں مکمل معلومات حاصل نہ کر لیں۔ وہ بغیر لائسنس کے سامان لانے کی اجازت بھی نہیں دیتے ہیں۔

وہ جن شہروں میں بھی گیا وہاں کے بارے میں بڑی کارآمد معلومات فراہم کرتا ہے۔ احمد آباد کے کارواں سرائے کے بارے میں ان کی تفصیل قابل ذکر ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ احمد آباد اور ہندوستان کے دیگر شہروں کی سرائیں عام طور پر فارس اور ترکستان کے شہروں سے مختلف تھیں۔ ان کے مطابق فارس اور ترکستان کی سرائے چار دیواری میں گھرے ایک بڑے محلاتی بند مکان سے مشابہت رکھتی تھی جس میں مسافروں کے ٹھہرنے یا قیام کے لیے بہت سے الگ کمرے تھے، جب کہ یہاں شہر کی کچھ گلیاں تاجروں اور مسافروں کے لیے مخصوص تھیں۔ ان گلیوں میں واقع مکانوں میں مسافر اور تاجر قیام کرتے تھے۔ رات کے وقت ان گلیوں کے دروازوں کو تالے لگائے جاتے تھے تاکہ مسافروں کا سامان محفوظ رہے۔ احمد آباد میں کچھ سرائے فارسی طرز کی بھی تھیں۔ ان کے مطابق، کھمبات (کیمبے) میں جانوروں اور پرندوں کے کچھ اسپتال بھی تھے۔ جہاں لنگڑے اور بیمار پرندوں اور گائے اور بچھڑوں کا علاج کیا جاتا تھا۔

پیٹر اڈیلا ویلے نے گجرات کے اعلیٰ طبقے کے مردانہ اور زنانہ لباس کے بارے میں بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ہندو اور مسلمان سب اپنی اپنی حیثیتوں کے مطابق باریک یا موٹے سوتی کپڑے پہنتے تھے۔ یہ لباس کمر اور اس کے اوپر تنگ ہوتا تھا، لیکن اس کے نیچے گھٹنوں تک کئی موڑ کے ساتھ ڈھیلا اور لٹکا ہوتا تھا۔ وہ ایک ہی کپڑے سے بنا لمبا پاجامہ بھی پہنتے تھے۔ اسے چوڑی دار کہتے تھے۔ اس طرز کے پاجامے میں گھٹنوں سے نیچے نچلے حصہ میں جتنی زیادہ سلوٹیں ہوتی تھیں وہ اتنا ہی بہادر سمجھا جاتا تھا۔ وہ لوگ اکثر یا تو ننگے پاؤں رہتے ہیں یا جوتے پہنتے ہیں۔ ہندو لمبے بال رکھتے جبکہ مسلمانوں کے سر منڈے ہوئے ہوتے تھے۔ ہندو اور مسلمان دونوں سر پر چھوٹی مگر صاف

ستھری پگڑیاں باندھتے تھے جو دیکھنے میں چوکور لگتی تھی لیکن لمبی ہوتی ہے اور اوپر کی سطح چپٹی ہوا کرتی ہے۔ مسلمان خواتین یا تو سفید اور سادہ لباس پہنتی تھیں، یا ان پر سنہرے بیل بوٹے بنے ہوتے ہیں۔ ان کا اوپری لباس تقریباً مردوں جیسا ہی ہوتا ہے بسا اوقات وہ اپنے سر پر مردوں کی طرح پگڑی نما کپڑا لپیٹتی ہیں جس پر سونے اور چاندی کا رنگین اور مزین کام ہوتا تھا۔ ان کے کپڑے عام طور پر سرخ یا سفید ہوتے تھے۔ ان کی شلواریں یا پاجامے سفید یا دھاری دار رنگوں کے مختلف قسم کے ریشمی کپڑوں سے بنے ہوتے تھے۔ ہندو عورتیں زیادہ تر سرخ رنگوں کے کپڑوں پر ڈیزائن کیا ہوا لباس پہنتی تھیں۔ ان پر کئی رنگ کے چھینٹ چھپے ہوتے تھے۔ سرخ کے علاوہ اس میں ایسے رنگوں کا استعمال ہوتا جو دور سے سرخ نظر آتے تھے۔ وہ آدھی آستینوں کی چولیاں پہنتی تھیں جبکہ بقیہ کھلے بازوؤں میں سونے یا چاندی کے کنگن یا ہاتھی دانت کی چوڑیاں پہنتی تھیں۔ کمر سے نیچے پاؤں تک لمبا لہنگا بھی پہنتی تھیں۔ ڈیلا ویلا نے لکھا ہے کہ اسے ہندوستانی لباس بہت پسند آیا اور وہ ایک جوڑا اپنے ملک اٹلی بھی لے گیا اور وہاں اس نے لوگوں کو دکھایا۔ امرا اور غریبوں کے لباس کی کوالٹی اور قیمت میں فرق ہوتا تھا۔ علما صافہ، قبا اور پاجامہ پہنتے تھے۔

ڈیلا ویلے نے ہندوستانیوں کے مذہبی اعتقادات، عقائد، توہمات اور رسم و رواج کو مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ لوگ مہاویر سوامی کے مندر کے لیے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔ انہوں نے ناگور میں برہما کے مندر کا بھی ذکر کیا جس میں سنگ مرمر سے بنی ہوئی کئی مورتیاں نصب کی گئی تھیں۔ سب سے بڑے بت کے کئی ہاتھ اور کئی چہرے تھے۔ اس بت کی داڑھی لمبی اور نوکیلی تھی اس کا پیٹ (توند) بڑی تھی۔ اس بڑے بت کے دونوں جانب چھوٹی زنانہ مورتیاں رکھی گئی تھیں ڈیلا ویلے نے مزید لکھا ہے کہ اس نے سورت میں لوگوں کو بڑ کے درخت کی پوجا کرتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ چنانچہ ہندوستانی سماج اور معاشرے کا مطالعہ کرنے والے طلبا اور دانشوروں کے لیے دیلا ویلے کا سفر نامہ کافی اہمیت کا حامل ہے۔

16.13 فرانسسکو پلسارٹ (Francisco Pelsaert)

فرانسسکو پلسارٹ (1620-1627) ایک ڈچ (ولندیزی) سیاح تھا جو مغل بادشاہ جہانگیر کے زمانے میں ہندوستان آیا اور مغل راجدھانی آگرہ میں قیام کیا۔ اس کا سفر نامہ ''جہانگیر کا ہندوستان پر حجت'' کے نام سے معروف ہے۔ پلسارٹ نے ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کو جوائن کیا اور 1618 میں ہندوستان کا سفر کیا۔ اس نے برصغیر پاک و ہند کے سفر کے دوران کئی مقامات کی سیاحت کی اور ان کے سماجی اور معاشی حالات کی بڑی دلچسپ تفصیلات فراہم کی ہے۔ اس کی تفصیل ایک قسم کی رپورٹ ہے، جو اس کے تجربات اور اس ذاتی مشاہدات اور تحقیقات پر مبنی ہے۔ اپنی یہ رپورٹ اس نے اسے ڈچ کمپنی کے ڈائریکٹرز کو بھیجا تاکہ وہ جنوبی ایشیا اور یورپ میں تجارت میں ڈچوں کو فائدہ پہنچانے کے امکان کا جائزہ لے سکے اور ان کی بدد کر سکے۔ پیلسارٹ مسولی پٹنم کے راستے ہندوستان میں داخل ہوا اور پورے برصغیر کے شمالی اور مغربی حصوں میں پیداوار اور تجارت سے متعلق بیشتر اہم مقامات کا دورہ کیا۔ گجرات کے بارے میں بڑی اہم معلومات فراہم کیں۔ یہاں کی پیداوار کے اہم مراکز کے ساتھ دیگر مقامات کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اس نے سیہور جو ماضی میں وسطی ایشیا اور اس کے مضافات کے وسیع علاقے

میں ایک بڑا تجارتی مرکز تھا کا بھی ذکر کیا ہے۔ ملتان اور تھٹہ جو کپڑے کی صنعت، چینی، گندھک اور نیل کی پیداوار کے لیے مشہور تھا اس کے بارے میں بھی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس نے کشمیر کا بھی سفر کیا اور اس کے بارے میں دلچسپ معلومات فراہم کی ہیں۔ وہاں کے لوگوں کے رہن سہن، عادات واطوار، وہاں کی مصنوعات، گھروں، مکانوں کی بناوٹ اور طرز تعمیر اور وہاں کے لوگوں کے خراب حالات بیان کیے ہیں۔ اس نے وہاں پیدا ہونے والے زعفران اور مختلف اقسام کے پھلوں اور میووں کے بارے میں بھی لکھا ہے۔

فرانسسکو پلسارٹ نے مغل راجدھانی آگرہ کی بہت دلچسپ تفصیلات پیش کی ہیں۔ اس نے شہر کی ساخت، امیروں اور غریبوں کے مکانات، ان کے کھانے پینے کی عادات، مختلف اشیا کے بازار اور وہاں دستیاب اشیاء کی اقسام کے بارے میں لکھا ہے۔ اس نے ان تمام راستوں اور اہم شاہراہوں کا ذکر کیا جو آگرہ کو پیداوار کے اہم مراکز سے جوڑتے تھے۔ اس نے وہاں کی مشہور چیزوں کا بھی ذکر کیا ہے اس کے سفر نامہ میں جونپور، بنارس، اودھ، لکھاور، پٹنہ، سورت وغیرہ کے بارے میں تفصیلات ملتی ہیں۔ پیلسارٹ نے آگرہ میں گرم مصالحہ کی تجارت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نظر اور سمجھ کتنی تیز تھی۔ مسالوں کی تجارت میں ڈچوں کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے ہندوستانی تاجروں کے استعمال کے طریقے بیان کیے گئے ہیں۔ اس نے بتایا کہ آگرہ کے بازار میں کون سے مصالحوں کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد اس نے ڈچ کمپنی کے ڈائریکٹرز کو مشورہ دیا کہ وہ ہندوستان میں اپنی مسالوں کی تجارت کو کس طرح منظم کریں تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کر سکیں اور اس منافع کو ہندوستانی ٹیکسٹائل اور نیل کی تجارت اور کاروبار میں لگائیں۔ نیل کی پیداوار اور اس کے اہم مراکز کے بارے میں پیلسارٹ نے جو کچھ بھی لکھا ہے اس کا کوئی مقابلہ نہیں ہے نیل کی پیداوار کے طریقوں کے بارے میں دستیاب معلومات کو ہندوستان میں قرون وسطی اور برطانوی تکنیکوں کے مقابلے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ فرانسس پیلسارٹ کا یہ سفر نامہ مغل ہندوستان کے تاریخی مطالعہ کے لیے انتہائی اہم ہے۔

16.14 جین بپٹسٹ ٹورنیئر (Jean Baptiste Tavernier)

سترھویں صدی کا سب سے مشہور فرانسیسی سیاح جین بپٹسٹ ٹیورنئیر (1641-1687) مغل بادشاہ شاہ جہاں کے دور میں ہندوستان آیا تھا۔ پیشے کے اعتبار سے وہ ایک جوہری تھا ساتھ ہی وہ ایک تجربہ کار اور بہادر سیاح بھی تھا جو سفر کے خطرات سے نہیں ڈرتا تھا۔ اس نے پندرہ سال کی عمر میں اپنے سفر کا آغاز کیا۔ مشرق کے سات دورے کیے جن میں سے چھ بار وہ ہندوستان آیا۔ اپنے پہلے دو اسفار کے دوران اس نے تقریباً پورے ہندوستان کا چکر لگایا۔ اپنے دوسرے سفر کے دوران وہ سورت، آگرہ، برہان پور، گوا، ڈھاکہ اور گولکنڈہ کا دورہ کیا۔ گولکنڈہ میں اس نے یہاں کے ہیروں کے کانوں کے بارے میں معلومات اکٹھا کیں۔ ممکن ہے وہ یہاں ہیروں کی کانیں دیکھنے میں بھی کامیاب ہوا ہو۔ ہندوستان کے دوسرے سفر کے دوران وہ دولت آباد اور ناندیڑ کے راستے سے ایک بار پرگا لکنڈہ پہونچا اور ہیروں کی کانوں کا معائنہ کیا۔ گولکنڈا ہ کی ہیرے کی کانوں کے علاوہ اس نے دکھلا کونڈہ (جدید راملا کوٹہ) اور گنی یا کولور کی کانوں کا بھی دورہ کیا۔ اپنے تیسرے سفر کے دوران اس نے مشرقی ساحل پر مسولی پٹنم، مدراس، گندی کوٹ وغیرہ مقامات کا دورہ کیا اور وہاں سے اپنے زیورات بیچنے کے مقصد سے

ایک بار پھر گولکنڈہ کی طرف روانہ ہوا لیکن قیمت زیادہ ہونے کی وجہ سے سودا نہیں ہو سکا اور وہ جلد ہی وہاں سے سورت چلا گیا۔ سورت میں اسے گجرات کے صوبیدار شائستہ خان کی طرف سے احمد آباد آنے کی دعوت ملی۔ وہاں سے دوبارہ سورت واپس آیا اور گولکنڈہ اور آس پاس کی ہیروں کی کانوں میں کاروبار کرنے کے مقصد سے اورنگ آباد کے راستے پر گیا اور اسی سال سورت واپس آیا۔ 1657 میں اس نے ایک بار پھر ہندوستان کا دورہ کیا اور اس سفر کا مقصد شائستہ خان کے فرمائشی مطلوبہ اشیا کی فراہمی تھا۔ اس کے پاس بہت سی نایاب چیزیں تھیں جو اس نے شائستہ خان کو فروخت کیں۔ شائستہ خان اس وقت دکن کا محاصرہ کر رہے تھے۔ اپنا کام مکمل کرنے کے بعد، ٹورنیئر نے دوبارہ گولکنڈہ کا رخ کیا اور وہاں سے 1660 یا 1661 کے اوائل میں دوبارہ سورت پہنچا۔ اس وقت تک وہ کافی مال و دولت کما کر خوشحال ہو چکا تھا۔ اس کے اپنے وطن واپسی پر اس کی خدمات کے صلے میں لوئس XIV نے شرافت کے خطاب سے نوازا۔ اس نے جنیوا کے قریب واقع اوبون کا بیرونی علاقہ خرید لیا اور وہاں آرام و آسائش کے ساتھ رہنے لگا۔ یہیں پر اس نے امپیریل بلوتھک میں اپنے سفر نامہ کی روداد کی اشاعت کے بارے میں سوچا۔ 1675 میں اس کے سفر کی یہ روداد Relation du Searcilda Grand Signior Nouvelle کے عنوان سے شائع ہوئی۔ ''میگنم اوپس'' اور ''چھ اسفار'' اگلے سال شائع ہوئیں۔ کچھ ہی دنوں کے بعد یہ تینوں کتابیں انگریزی، جرمن اور اطالوی زبانوں میں شائع ہوئیں، جنہیں بے پناہ شہرت ملی۔

1686 میں 80 سال کی عمر میں ٹیورنئر نے ہندوستان کا آخری دورہ کیا۔ چونکہ اس کے پاس تجارت کے لیے بہت سی قیمتی چیزیں تھیں۔ چنانچہ وہ برہان پور، سرونج، گوالیار، آگرہ سے ہوتا ہوا وہ جہان آباد (موجودہ شاہجہان آباد یعنی دلی) پہنچا۔ اس وقت مغل بادشاہ اورنگ زیب حکمراں تھا۔ ٹیورنئیر نے اورنگ زیب کو تحائف پیش کیے اور اپنے سب سے قیمتی زیورات بادشاہ کے ہاتھ فروخت کیے۔ اس کے بادشاہ کے اہم امرا اور رئیسوں سے ملاقات بھی کی۔ چونکہ ٹیورنیئر نے ہندوستان میں ایک طویل عرصہ گزارا تھا، اس کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے تقریباً تمام اہم مقامات کا دورہ کیا تھا۔ اس لیے اس کا یہ سفر نامہ سترہویں صدی کے مغلوں اور ان کے دربار کی تاریخ کے لیے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ لیکن ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ان کا مقصد ہندوستان کے لوگوں اور خطوں کا مشاہدہ اور مطالعہ کرنا نہیں تھا۔ اس نے صرف اس چیز کا تذکرہ کیا جو وہ ایک تاجر کے نقطہ نظر سے اہم سمجھتے تھے۔ ہے ان کی توجہ سودے بازی کی کامیابی کے تذکرے میں زیادہ ہے، لیکن اس رجحان کی وجہ سے وہ یہاں کے تاجروں، ساہوکاروں، صرافوں کو چالوں اور طریقوں کے بارے میں اہم معلومات فراہم کرتے ہیں۔ وہ کچھ مخصوص تجارتی اجناس کی پیداوار اور فروخت کے طریقے بھی بیان کرتے ہیں جیسے گرم مسالہ، جھرموہرا، ناشتہ کا پتھر، کستوری، نیل، ہاتھی دانت وغیرہ جو مشرقی تجارت کی تاریخ کے علم کے نقطہ نظر سے بہت اہم ہیں۔ ایک تجربہ کار اور ماہر تاجر کے ہاتھ سے لکھے جانے کی وجہ سے اس تفصیل کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ جواہرات اور موتیوں کے بارے میں ان کی تفصیلات اہم، درست اور قابل اعتبار ہے۔

16.15 فرانسس برنیئر (Francois Bernier)

مشہور فرانسیسی سیاح برنیئر (1656-1668) کا تاریخی نوشت نامہ ٹریولس ان مغل انڈیا ایک معاصر دستاویز کی سی حیثیت رکھتا

ہے۔ یہ مواد اس سفر نامہ کے ترجمہ سے اخذ کیا گیا ہے جو شاہ جہاں کے ایام اسیری اور اورنگزیب کی تخت نشینی کے دوران لکھا گیا۔ برنیر اپنے پیشہ کے اعتبار سے ایک طبیب تھا۔ اپنے ذوق سفر کی تسکین اور جہاں بینی کی خواہش کی تکمیل کے طور پر اس نے 1656 تا 1668ء کے دوران ہندوستان کا سفر کیا اور بیشتر وقت مغل دربار سے وابستہ رہا۔ یہی وہ دور تھا جب ظلِ سبحانی صاحب قرآن ثانی شاہ جہاں نظر بند کر دیے گئے اور ان کے بیٹے اورنگ زیب عالم گیر بادشاہ غازی کا دور حکمرانی تھا۔ برنیر نے جو واقعات اپنے سفر نامہ میں درج کیے ہیں ان میں بہت سے واقعات اس کے چشم دید اور بعض واقعات کو اس نے اپنے سفر کے دوران سنا اور قلم بند کیا۔

برنیئر کی ہندوستان آمد ایسے وقت میں ہوئی جب شاہ جہاں کے بیٹوں میں جانشینی کی جنگ جاری تھی۔ اورنگ زیب کی تخت نشینی ہندوستان میں قیام کے دوران ہوئی۔ اس طرح برنیئر کو دو بااثر مغل حکمرانوں کے دور کے واقعات کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ شاہ جہاں کا انتقال اس وقت ہوا جب وہ مسولی پٹنم میں تھا۔ اس کا سفر نامہ ٹریولس اِن مغل انڈیا 1670 کے آس پاس شائع ہوا۔ برنیئر کا سفر نامہ بہت دلچسپ اور جامع ہے۔ انہوں نے نہ صرف ہندوستانیوں اور مغلوں کے طور طریقوں اور سماجی اور تہذیبی سرگرمیوں، مذہبی روایات، حصول علم کے ذرائع اور ان کی زندگی کے مقاصد اور سرگرمیوں کو بیان کیا ہے، بلکہ مختلف قسم کے حکایات سے انھیں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ برنیئر نے انقلاب، خانہ جنگی اور جانشینی کی جنگ کو واضح طور پر بیان کیا اور ساتھ ہی خانہ جنگی کے خاتمے اور ہندوستان چھوڑنے کے وقت پیش آنے والے واقعات کو بھی بیان کیا ہے۔

برنیئر کا سفر نامہ بہت اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس نے نہ صرف مختلف شہروں اور علاقوں کا دورہ کیا بلکہ ان مقامات کے باشندوں اور پیداوار کے بارے میں بھی معلومات اکٹھی کیں۔ اس طرح وہ ٹیورنیر سے بالکل مختلف ہے، جو صرف اپنے زیورات کی سودے بازی سے متعلق تھا۔ اس کے علاوہ برنیئر طویل عرصے تک ہندوستان میں رہنے کی وجہ سے یہاں کے انتظامی نظام یہاں کے لوگوں کی دلچسپیوں اور روایات کو سمجھنے میں کامیاب ہوا۔ اس وقت کے فرانسیسی سیاست دان اور مصنف ڈی مونسیو کے مطابق، ''یہاں (فرانس) سے کبھی بھی کوئی ایسا سیاح نہیں آیا جو مشاہدے کی اتنی صلاحیت رکھتا ہو اور نہ ہی کسی نے اتنی معلومات، سادگی اور دیانت داری سے لکھا ہے۔

برنیئر نے اس وقت کی اہم شخصیات کو تفصیل سے پیش کیا ہے۔ دارا کے بارے میں وہ کہتے ہیں دارا میں خوبیوں کی کمی نہیں تھی اور وہ بہت فیاض تھا؛ لیکن وہ اپنے بارے میں بہت اعلیٰ رائے رکھتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اپنے دماغ کی طاقت سے ہر کام کر سکتا ہے۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ بہت بدتمیز تھا۔ جس نے اسے مشورہ دینے یا حالات سے آگاہ کرنے کی کوشش کی، اسی لیے اس کے سب سے پیارے دوستوں نے بھی اسے اپنے بھائیوں کی سازشوں اور چالوں سے آگاہ نہیں کیا۔ شجاع کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ ''سازش سازی میں بہت ماہر تھا اور وہ بڑے امیر کی دوستی حاصل کرنے کا ایک طریقہ بھی تھا۔ لیکن یہ مزہ ہے ایک غلام تھا۔"

اورنگ زیب میں دارا کی طرح شائستگی اور شائستگی کا فقدان تھا لیکن اس میں فیصلہ سازی کی حیرت انگیز صلاحیت تھی اور اس کی نظر اپنے معاونین اور خیر خواہوں کے انتخاب میں بہت تیز تھی۔ وہ سنجیدہ، تیز عقل اور اپنے خیالات اور منصوبوں کو خفیہ رکھنے میں بہت ماہر تھا۔

مراد کے بارے میں برنیئر کی رائے یہ تھی کہ وہ ہر لحاظ سے اپنے تین بھائیوں سے برتر ہے۔ کم تھا، لیکن "وہ سخی اور عاجز اور بہادر تھا۔" جہاندار بیگم صاحبہ اپنے والد کی بہت پیاری اولاد تھیں۔" اس حوالے سے برنیئر نے کہا ہے کہ افواہوں کے مطابق شاہ جہاں کی وابستگی اس حد تک پہنچ چکی تھی جس پر یقین نہیں کیا جا سکتا تھا--- جہاں آرا کا شاہ جہاں پر لامحدود اثر و رسوخ تھا اور وہ اہم معاملات میں مکمل مداخلت کرتی تھی۔ ''شہزادوں کی شادیاں ہندوستان میں شاذ و نادر ہی ہوتی تھیں، کوئی آدمی ان کے لائق نہیں ہوتا۔'' اس کے بعد وہ شخص شاہی عہدے کا دعویدار بننے کی جرأت بھی کر سکتا تھا، اس لیے یہ صورت حال نہ آنے دی گئی۔ خانہ جنگی کے دوران ہونے والے واقعات کی ایک جھلک دیتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ شاہ جہاں دراصل دارا کا خادم تھا۔ اس طرح برنیئر نے واقعہ اور کردار دونوں کا صحیح اندازہ لگایا ہے۔

راجپوتوں کے حوالے سے وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے نسل در نسل اسلحہ کی تعلیم حاصل کی۔ انہیں ان کے بادشاہوں کی طرف سے زمینیں دی جاتی ہیں --- بچپن سے ہی وہ افیون کے عادی ہو جاتے ہیں۔ برنیئر اس ملک کے گھڑ سواروں سے بہت متاثر تھا۔ ان کے الفاظ میں "اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس ملک میں گھڑ سواروں اور تیر اندازوں کا آپریشن بہت آسان ہے، تیر چھوڑنے میں ان کی رفتار حیران کن ہے۔ جتنے وقت میں ایک بندوق بردار دو بار فائر کرتا ہے اتنے ہی وقت میں گھڑ سوار چھ تیر چلاتا تھا۔ تقریباً پینتیس سے چالیس ہزار گھڑ سوار اور 15000 پیدل ہر وقت بادشاہ کی خدمت میں رکھے جاتے تھے۔ یہ سپاہی مغل رئیسوں کے ماتحت تھے۔

کولبرٹ کو لکھے گئے خط میں، برنیئر نے یہاں کاروبار کی حالت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ان کے مطابق باہر کے ممالک سے کئی طرح کی اشیا ہندوستان میں لائی جاتی ہیں لیکن "ان اشیا کی درآمد کے لیے سونا یا چاندی برآمد کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ باہر کے تاجروں کے لیے یہاں سے بہترین مصنوعات لے جانا نسبتاً زیادہ ہوتا ہے۔'' منافع بخش، جو وہ اپنے ملک کی پیداوار کے بدلے لیتے ہیں۔ اس طرح، غیر ملکی اشیاء اور مصنوعات کی فراہمی کے بعد بھی، دنیا کے سونے اور چاندی کا ایک بڑا حصہ ہندوستان میں "جذب" ہو جاتا ہے، جس کی آمد کے ذرائع بہت ہیں جبکہ پیداوار کے ذرائع شاید ہی کوئی ہوں گے۔

برنیئر کا یہ قول درست ہے کہ مغل شہنشاہ امیروں، اعلیٰ 'منصبداروں' اور چھوٹے طبقے کے افسروں کا مالک ہے اور یہ بھی کہ وہ اس کے اجرت والے ہیں۔ لیکن، ان کا درج ذیل بیان بہت گمراہ کن ہے: "ہندوستان میں، بادشاہ پوری زمین کا مالک ہے۔'' اس میں مستثنیات ہیں ، کچھ عمارتیں اور باغات ہیں، جنہیں بعض اوقات بادشاہ نے خرید و فروخت کرنے کی اجازت دی ہے۔ اس طرح بادشاہ سلطنت کی پوری زمین کا مالک ہے۔ یہ واضح ہے کہ برنیئر کا مذکورہ بالا بیان درست نہیں ہے۔ ہندوستان میں ہر شخص کو ذاتی جائیداد کا حق حاصل تھا۔ خاص طور پر وہ شخص اپنی جائیداد کی خرید و فروخت یا رہن رکھنے میں بالکل آزاد تھا جس میں بادشاہ کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ ذاتی جائیداد کا تصور ہندوستان میں قدیم زمانے سے رائج تھا۔ برنیئر نے غیر دعویدار جائیداد کے اصول (غلام بنائے جانے کا اصول) کا ذکر کیا ہے، لیکن اس اصول پر بھی سختی سے عمل نہیں کیا گیا۔ درحقیقت، مندرجہ بالا قواعد بہت مشکل تھے، جنہیں برنیئر اچھی طرح سمجھ نہیں سکتا تھا۔ برنیئر نے کاشتکاروں اور کاشتکاروں کی زمین کے بارے میں اہم تفصیلات پیش کی ہیں، جن سے اس دور کی زراعت کی حالت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے، اس کے مطابق اچھی

زمین کا ایک بڑا حصہ مزدوروں کی کمی کی وجہ سے غیر کاشت پڑا ہے۔ کیونکہ ان میں سے اکثر صوبیدار وغیرہ کے برے رویے کے نتیجے میں مر جاتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ زیادہ تر کاشتکار پیداوار اور جبر سے مایوس ہو کر اپنی جگہ چھوڑ کر شہروں یا چھاؤنیوں میں چلے جاتے ہیں تاکہ رزق کا کوئی اور قابل رسائی ذریعہ تلاش کیا جا سکے۔ بایسے تعلقات ہیں جن میں کرایہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی تلقین کی گئی ہے -تاکہ کرایہ دار دوبارہ کرایہ داری کرنے آئیں۔ اس نے کاشتکاروں اور دستکوں کا حال بھی بیان کیا ہے۔

برنیئر کی امیر طبقے کی ساخت اور حالت پر بھی گہری نظر ہے، ان کے مطابق، عمرورگہ بہت سے مختلف ممالک کے مہم جوؤں پر مشتمل ہوتا ہے جو دوسروں کو لالچ دیتے ہیں۔ بھاری تنخواہ ملنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔ جہاں دوسرے ملکوں کے امرا کی طرح اور اپنے کھانے پینے، ضیافت وغیرہ کے اخراجات کی وجہ سے برباد ہو جاتے ہیں، وہاں ان کی بربادی کی وجہ بعض تہواروں اور موقعوں پر بادشاہ کے لیے قیمتی تحائف اور اس کے حرم کا اہتمام کرنا ہے۔ ان کے بیوی بچے، نوکر، ہاتھی، گھوڑے وغیرہ رہنے کا انتظام کرنا ہے۔ انہوں نے عمرورگہ کی شان بھی بیان کی ہے۔ ان کی تفصیل کے مطابق "صوبوں میں فوج اور دربار میں امیروں کی تعداد بہت زیادہ ہے، انہیں ریاست کا اعلیٰ ترین اعزاز اور مقام حاصل ہے۔ انہوں نے مختلف افسروں اور سپاہیوں کی تنخواہوں کا بھی ذکر کیا ہے۔

بقول اُن کے، "اگرچہ مغل سلطنت سونے اور چاندی کی آمیزش کے لیے ایک گہرے کنویں کی مانند ہے، لیکن یہ قیمتی دھاتیں دوسری جگہوں کے مقابلے زیادہ گردش میں نہیں ہیں۔ اس کے برعکس یہاں کے لوگوں کا معیار زندگی بلند ہوا ہے۔ "خوشحالی دنیا کے دیگر حصوں کے مقابلے میں کم نظر آتی ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں: پہلی، خواتین کے زیورات بنانے کے لیے ہر بار سونے اور چاندی کی ایک بڑی مقدار کو بار بار گلایا جاتا ہے۔ زیورات وغیرہ کی تیاری میں ایک بڑی رقم خرچ کی جاتی ہے۔ اس طرح سونے اور چاندی کی بلا تعطل آمد کے باوجود ہندوستان کو کوئی فائدہ نہ ہو سکا۔

Monsieur de la Moy lo Ware کے نام ایک خط میں، برنیئر نے مغل سلطنت کے اہم شہروں، خاص طور پر آگرہ اور سلطنت کے دارالحکومت دہلی کی تفصیل دی ہے۔ اس کے ساتھ یہاں کی شاہی زندگی کی وسیع اور عظیم الشان تصویریں بھی پیش کی گئی ہیں۔ وہ آگرہ اور دہلی کے بازاروں، امیروں اور غریبوں کے رہائشی مکانات اور دیگر شاندار عمارتوں کی تفصیلات دیتا ہے۔ ان کے مطابق یہاں کی عمارتیں مغرب کی کسی بھی جگہ سے کم نہیں ہیں۔ انہوں نے ان شہروں کی ساخت کو بھی تفصیل سے بیان کیا اور ساتھ ہی دستکاری کی مصنوعات، فنکاروں، تہواروں وغیرہ، تفریح کے ذرائع، ملبوسات کے بارے میں بھی اہم تفصیلات فراہم کیں۔ دہلی کے اندرونی حصے کے بارے میں وہ کہتے ہیں: "دہلی کے ارد گرد کا علاقہ انتہائی زرخیز ہے۔ یہاں مکئی، گنا، نیل، چاول، باجرہ کے علاوہ تین چار قسم کی دالیں پیدا ہوتی تھیں۔ چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عام لوگوں کی گزر بسر کی تمام اشیا یہاں پر وافر مقدار میں دستیاب تھیں۔

فرانسس برنیئر نے آگرہ کے جیسوٹ چرچ اور کالج، ڈچ فیکٹری کی تفصیلات بھی دی ہیں۔ آگرہ میں ڈچوں نے کپڑوں کی خریداری کا ایک ڈپو بنایا تھا۔ اس کے علاوہ کپڑوں کی خریداری کا دوسرے اہم مراکز جلال پور اور لکھنؤ تھے۔ جہاں سے بڑے پیمانے پر کپڑا خرید کر

بیرونِ ممالک بھیجا جاتا تھا۔ برنیئر نے مغل چھاؤنی کی شان و شوکت کی تصویری تفصیل بھی دی ہے۔ مغل چھاؤنی میں کس قسم کی سرگرمیاں ہوتی تھیں اور ٹریفک کا انتظام کیسے کیا جاتا تھا وغیرہ پر اس نے حقائق پر کافی روشنی ڈالی ہے۔

برنیئر نے ہندوستان کے ہندو سماج اور خاص کر برہمنوں کے بارے میں بہت درست اور دلچسپ باتیں کہی ہیں۔ ان کے مطابق برہمنوں کا طبقہ توہمات اور غلط فہمیوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے جس کی وجہ سے ان کی خوشحالی باقی رہتی ہے۔ اس نے ستی کی رسم اور جگن ناتھ کی مورتی سے معصوم لڑکیوں کی شادی کے رواج کو بھی بیان کیا ہے جس کا فائدہ پجاری اٹھاتے تھے۔ برنیئر نے کشمیر کی شال کی صنعت کی ایک واضح وضاحت کی ہے، جسے وہ زمین پر بے مثال قرار دیتے ہیں۔ ان کے مطابق شال کی بنائی دراصل کڑھائی کی ایک قسم ہے جو کرگھے پر کی جاتی ہے۔ یہاں دو قسم کی شالیں بنتی ہیں ایک وہ جو سپین کی اون سے زیادہ نرم ہوتی ہے اور دوسری جو تبت میں پائی جانے والی بکریوں کے سینے کے اون سے بنائی جاتی ہے جسے تونج کہتے ہیں۔ تونج شالوں کو دیسی اون سے بنی شالوں سے زیادہ قیمتی سمجھا جاتا ہے اور خاص طور پر امیروں کے لیے بنایا گیا ہے۔ ہر شال کی قیمت ڈیڑھ سو کے لگ بھگ ہے۔ اود بلاؤ کا فر بھی اتنا ملائم نہیں ہوتا ہے جتنا کہ ان بکریوں کے سینے کے بالوں کی اون ہوتی ہے۔ پٹنہ، آگرہ اور لاہور میں بھی ایسی شالوں کی تعمیر میں بہت احتیاط برتی جاتی ہے۔ لیکن کشمیری شالوں کی خوبصورتی اور ملائمت ان میں نہیں ہے جس کی وجہ سے اس ملک (کشمیر) کا پانی اثر کر رہا ہے۔ مسولی پٹنم کے چھینٹے کے رنگوں کی فضیلت کی وجہ اس پانی کی انفرادیت بھی مانی جاتی ہے کہ وہ اس شہر کے پانی میں بہہ جاتے ہیں اور کھلتے ہیں۔ یہ پرنٹس ہاتھ سے چھاپے گئے تھے۔ اس طرح برنیئر کی تفصیل بہت جاندار، جامع اور درست ہے۔ چند مقامات کو چھوڑ کر ان کے بیان کی صداقت کو حقائق اور حوالوں سے ثابت کیا جاتا ہے۔

16.16 پیٹر منڈی (Peter Mundi)

پیٹر منڈی (1630-1634) ایک اطالوی سیاح تھا۔ اس نے انگلینڈ سے سورت کا رختِ سفر باندھا اور ستمبر 1628 میں کو سورت پہنچا۔ 1630 میں پیٹر منڈی کو آگرہ منتقل کرنے پر اتفاق ہوا۔ اس نے 11 نومبر کو اپنا سفر شروع کیا اور 3 جنوری 1631 کو آگرہ پہنچا۔ اس نے اپنے اعلیٰ افسران کی خدمت کی لیکن پھر اسے کہا گیا کہ وہ پٹنہ جا کر کپڑے پر سرمایہ کاری کیجیے۔ 6 اگست 1632 کو وہ پٹنہ کے لیے روانہ ہوئے۔ اس نے 500 میل کا سفر کیا اور پھر 20 ستمبر 1632 کو پٹنہ پہنچا۔ اسے پٹنہ میں کوئی اچھا فائدہ نہیں ہوا۔ اس نے 16 نومبر 1632 کو آگرہ واپس آنے کا فیصلہ کیا۔ وہ 22 دسمبر کو آگرہ پہنچا اور وہاں دو ماہ رہا، جہاں اس نے شاہ جہاں کے 2 بڑے بیٹوں کی شادی دیکھی۔ انہیں فتح پور سیکری جانا پسند تھا جو اکبر نے ویران کر دیا تھا۔

16.17 منوچی (Niccolao Manucci)

منوچی (1656-1687) اٹلی کا رہنے والا وہ عظیم سیاح ہے جو مغل بادشاہ اورنگ زیب کے عہدِ حکومت میں ہندوستان آیا تھا۔ اس کا سفر نامہ ''اسٹوریا ڈی موغور'' (Storia Do Mogor) مغل بادشاہ اورنگ زیب کے عہد کا ایک اہم دستاویز ہے۔ جس کا انگریزی ترجمہ ولیم ارون نے کیا ہے۔ منوچی نے (Manucci) ہندوستان میں ایک طویل عرصہ گزارا۔ 1653-1708 کے دوران

اتنے برسوں پر پھیلے ہوئے ایک نہایت اہم تاریخی دور میں اس نے ہم عصر معلومات جمع کیں۔ یہاں کے مذہبی، تہذیبی اور تاریخی رویوں کے بارے میں جن حالات و معاملات تک اس کی براہ راست یا بالواسطہ رسائی ہوئی انھیں ان تمام تفصیلات کے ساتھ ریکارڈ کیا جو اس کی نگاہ میں زیادہ اہم اور ضروری تھیں۔ کچھ اہم تصویریں بھی اس میں موجود ہیں۔ اورنگ زیب کے عہد کے امرا، صوبے، ان کی آمدنی کا گوشوارہ، سواریاں خاص کے ہاتھیوں، شاہی گھوڑوں کی تعداد جیسی ضروری اور نیم ضروری باتوں کی تفصیلات اس میں موجود ہیں جن کی مدد سے اس دور کو بہت کچھ سمجھا جاسکتا ہے۔

صوبہ دہلی مغل سلطنت کے شمال مغربی حدود کے اعتبار سے وسط میں واقع ہے۔ اس کے دارالریاست کا نام بھی یہی (دیلی) ہے۔ یہ وہ شہر ہے جہاں مغل شہنشاہ کا قیام اس کی سیر و سفر کا منطقہ اور خبر و نظر کا حلقہ مغل سلطنت سے لے کر بیجاپور اور گول کنڈہ کی عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں شیواجی سے متعلق مغل مہمات اور فتح و شکست کے وقوعات کو بھی شامل رکھیے کہ ان کے بغیر اس عہد کے سیاسی امور اور بدلتے ہوئے نقوش و آثار پر تاریخی اعتبار سے نظر واری ممکن نہیں۔ تاریخی شخصیتوں، تاریخی اداروں اور تہذیبی رویوں سے متعلق منوچی نے بعض نہایت اہم تصویر میں بھی اپنی اس تاریخی کتاب میں شامل کی ہیں۔ یہ تصاویر زیادہ تر مغل، و قلم کی پیش کش ہیں اور عہد اورنگ زیب اور کچھ بعد کے زمانے سے تعلق رکھتی ہیں۔

اسی جگہ ہندو راجاؤں کا قیام رہتا تھا۔ یہیں پٹھان اور غلام خاندان کے انیتس سلاطین اپنے اپنے دور حکومت میں رہے۔ ان کے مغل امرا اور صوبے دار بھی یہیں قیام کرتے تھے جنھوں نے دہلی اور اس ملک کے بڑے حصہ پر حکومت کی ہے۔ اس میں سید اور مسلمانوں کے دور حکومت سے پہلے کے راجپوت راجا بھی قیام فرمار ہے۔ قصہ کوتاہ تمام مسلمان شرفا رواؤں کا یہی مستقر رہا۔ اگرچہ یہ مرکزی دربار کا شہر ہے پھر بھی یہاں صنعت کار زیادہ نہیں ہیں لیکن یہ علاقہ زرعی پیداوار کے لحاظ سے بہت زرخیز ہے اور جن شاہی پارچہ جات کے بارے میں میں نے لکھا ہے وہ یہیں سے حاصل کیے جاتے ہیں۔ اس کے اطراف و جوانب میں ہنوز ان آثار کو دیکھا جاسکتا ہے۔ ہندو اور مسلمان حکمرانوں کے دور حکومت کے آثار باقیہ اور ان کے تعمیر کردہ محلات اور قلعوں کے کھنڈر ہیں۔

انہی میں ایک تغلق آباد ہے جو نویں پٹھان بادشاہ نے بنوایا تھا اور جس کا بڑا حصہ ابھی باقی ہے۔ وہ سلطان زادہ جو تغلق شاہ کہلاتا تھا اس نے نو سال اور نو دن حکومت کی۔ وہ اس وقت اچانک موت کا شکار ہو گیا جب وہ مذکورہ ایک مصنوعی شاہی محل کے دروازہ سے گزر رہا تھا اور اس سانحہ میں اس کے بیٹے محمد بن تغلق کی فریب کارانہ تدبیر کو دخل تھا۔ اس کے بیٹے نے اس کے لیے موت کا جال تیار کیا تھا جو اس کے قدم رکھتے ہی اس پر آپڑا اور وہ اجل رسیدہ و بے گناہ سلطان موت کے چنگل میں پھنس گیا۔ اس واقعہ یا پھر بعض وجوہ کے باعث یہ صورت تھی کہ سلاطین اپنے بیٹوں پر اعتبار نہیں کرتے تھے۔

اس صوبہ میں دوسرے کہنہ آثار بھی ہیں جہاں مسلمان گاہ گاہ اپنی روحانیت پسندی اور پر تقدیس جذبات کے تحت جاتے اور قیام کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر جہاں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کا مزار ہے یعنی قطب صاحب کا ذکر کیا جاسکتا ہے جو اہل عقیدت کی نگاہ

میں بڑی عظیم روحانی شخصیت تھے۔اس کے علاوہ حضرت سلطان المشائخ کا روضہ شریف ہے۔ میں نے ان مزارات پر ایسی باتیں ہوتی ہوئی دیکھیں جن کے ذریعہ بھولے بھالے عقیدت مندوں کو (نذر و نیاز پر) اکسایا جاتا ہے جو توہم پرستی کے ماسوا کچھ نہیں۔ عام طور سے بادشاہ اپنے سلطانی اصطبل میں پچاس ہزار گھوڑے رکھتا ہے اور یہ تعداد ان گھوڑوں کے علاوہ ہے جو روزمرہ کے شاہی اور اس کے معمولات میں کام آتے ہیں اور وہ بھی تقریباً اتنے ہی ہوتے ہیں۔ مغل شہنشاہ کے پاس میں ہزار پیدل فوج ہے جو سب کے سب راجپوت ہیں۔ان میں بارہ ہزار کے قریب لشکری توپ خانے سے وابستہ میں باقی آٹھ ہزار شاہی قلعہ کی حفاظت کے لیے مقرر ہیں۔ گھوڑ سوار سنتری وغیرہ اس کے علاوہ ہیں۔

جہاں تک شاہی امورات (royal establishment) کا تعلق ہے ان میں ایک چوکی خاص کا داروغہ ہوتا ہے اور یہی اس کا رسمی نام (داروغہ چوکی خاص) بھی ہے۔ یہ افسر منتخب سپیداروں میں سے ہوتا ہے یہ اس لیے کہ اس کا تعلق معتمد سپاہیوں سے ہوتا ہے اور ان کا انتخاب معزز خاندانوں یا اشراف میں سے کیا جاتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ چار ہزار گھوڑ سوار ہوتے ہیں۔ یہ افسر غسل خانہ کا بھی انچارج ہوتا ہے۔ اس کے زیر احکام کچھ مملوک افسران بھی ہوتے ہیں جو اس کے اپنے آدمی ہوتے ہیں اور انھیں پیلا کہا جاتا ہے۔ایک اور افسر بھی ہوتا ہے جس کے تحت پانچ سو نیزہ بردار (Halberdiers) ہوتے ہیں جو طلائی گرز (maces) اٹھا کر چلتے ہیں، ان کی تنخواہ تین سو روپے ماہانہ سے لے کر ایک ہزار ماہانہ تک ہوتی ہے اور یہ ان کے منصب کے مطابق ہوتا ہے۔ وہ شہزادوں کے پاس خبر رسانی کے لیے ملازم رکھے جاتے ہیں یا پھر ایسی کوئی دوسری کوئی اہم خدمت ان کے سپرد ہوتی ہے۔

اسی طرح ایک اور آفیسر ہوتا ہے ایک ہزار Halberdiers جس کی کمان میں ہوتے ہیں یہ چاندی کے گرز اٹھا کر چلتے ہیں۔ یہ بھی منصب دار ہوتے ہیں اور ان کی ماہانہ تنخواہ دو سو روپے سے پانچ سو روپے تک ہوتی ہے۔ان کے ذمہ یہ خدمت ہوتی ہے کہ یہ خطوط اور احکامات مغل سپاہ سپہ سالاروں اور کپتانوں کے پاس لے جاتے ہیں۔ جب دوسرے ملکوں کے سفیر آتے ہیں تو یہ ان کے درباری استقبال میں بھی شریک رہتے ہیں اور بعض دوسرے نسبتاً کم اہمیت کے کام انجام دیتے ہیں۔ ایک اور افسر دو ہزار منصب داروں کا افسر ہوتا ہے۔ منصب داروں کا افسر اس لیے ہوتا ہے کہ ان کے نیزے لوہے کے ہوتے ہیں۔ان کی تنخواہ سپاہیوں کی تنخواہ کے برابر ہوتی ہے۔ وہ مذکورہ ملازموں کے مقابلہ میں کم تر درجہ والے کام انجام دیتے ہیں۔

16.18 جین تھیوناٹ (Jean Thevenot)

جین تھیوناٹ (1668-1666) ایک فرانسیسی سیاح تھا جو دنیا کے مختلف ممالک کا سفر کرتے ہوئے اورنگزیب کے عہدِ حکومت میں ہوپ ول نامی جہاز کے ذریعہ 1665 کو سورت کی بندرگاہ سے ہندوستان میں داخل ہوا۔ اور تقریباً تیرہ مہینے تک ہندوستان میں مقیم رہا۔ اس دوران اس نے ہندوستان کے کیے علاقوں کا سفر کیا۔ گول کنڈہ اور مسولی پٹم ہوتے ہوئے دوبارہ سورت واپس پہونچ گیا۔ ہندوستان میں قیام کے دوران اس نے جو کچھ بھی نیا دیکھا اسے اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا۔اس کی پیش کردہ معلومات نہایت اہم اور لابدی ہے۔

16.19 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی میں ہم نے جانا کہ دنیا کے مختلف خطوں اور علاقوں سے لاکھوں لوگوں نے بہتر مواقع اور کام کی تلاش میں دور دراز کا سفر کیاان میں مرد اور خواتین دونوں شامل تھے۔ان میں سے کچھ نے قدرتی آلام و مصائب سے بچنے کی خاطر دور دراز کا سفر کیا۔کچھ نے تاجروں ،فوجیوں، مذہبی مبلغوں اور زائرین کے طور پر رختِ سفر باندھا۔کچھ ایسے سیلانی بھی تھے جنہوں نے مہم جوئی کے شعور واحساس سے سرشار ہو کر سیاحت کی۔یہ تمام سیاح جہاں بھی گئے انہوں نے اپنے سامنے ایک ایسی نئی دنیا، کے مادی ماحول اور قدرتی مناظر کا مشاہدہ کیا جس سے وہ پہلے آشنا نہیں تھے۔ان کا واسطہ ایسے لوگوں سے پڑا جن کا رہن سہن، عادات واطوار، بول چال، رسوم ورواج، مذہب واعتقادات اور سلوک و عمل یکسر ان سے مختلف تھا۔ان میں سے بیشتر نئے رنگ میں ڈھل گئے۔لیکن ان میں سے کچھ خاص تھے جنہوں نے غیر معمولی واقعات اور قابل ذکر باتوں کو جو انہیں قابل توجہ نظر آئیں اپنی یادداشتوں میں نہ صرف محفوظ کیا بلکہ اسے قلم بند بھی کیا۔

آج دنیا میں بہت سے تذکرے اور سفر نامے موجود ہیں جن میں انتہائی اہم اور گراں قدر معلومات موجود ہیں۔بہت سے سفر نامے امتداد زمانہ کی نذر ہو گئے۔جو کچھ بچے ہیں وہ موضوع اور مواد کے اعتبار سے مختلف النوع ہیں۔ان تذکروں اور سفر ناموں میں مغل بادشاہوں کی درباری سرگرمیوں، سماجی مسائل، مذہبی صورت حال، فنون لطیفہ، اور تجارتی معاملات وغیرہ سے متعلق اہم معلومات موجود ہیں۔

برصغیر ہند میں عہدِ قدیم سے ہی مذہبی مبلغ، زائر اور سیاح آتے رہے ہیں۔آج کے ترقی یافتہ دور میں تو پوری دنیا ایک عالمی گاؤں بن گئی ہے۔چنانچہ سفارت کاروں، زائریں کا ان کی آمد و رفت کا سلسلہ تاہنوز جاری ہے۔یوروپی تاجروں، سیاحوں اور زائرین نے ہندوستان کے بارے میں معلومات کا وہ بیش قیمتی ذخیرہ چھوڑا ہے جس پر ہماری تاریخی معلومات منحصر ہے۔کچھ سیاحوں اور زائرین نے تو اپنی آپ بیتی اور سوانح عمری بھی لکھی ہے جو ہندوستان کی تاریخ کا اہم ماخذ ہیں۔عہد سلطنت میں ترک فاتحین کے ساتھ بھی کئی نامور علما، دانشور اور صوفیا ہندوستان آئے۔علاوہ ازایں کئی سیاح، مبلغ اور زائر بھی آئے جن میں البیرونی، ابن بطوطہ اور عبدالرزاق وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ہندوستان کے لوگ یہاں کے رسم ورواج کو اہمیت نہیں دی کیوں کہ وہ ان سے بخوبی واقف تھے اور ان کے لیے اس میں کوئی کاص دلچسپی نہیں تھی لیکن یوروپ کے سیاحوں کے لیے یہ ملک اور ملک کی ہر شے اجنبی تھی وہ یہاں کے رسم ورواج سے آشنا نہیں تھے۔اس لیے انہوں نے ہندوستان کے رسم ورواج، رہن سہن، تجارت و معشت کے بارے میں بڑی دلچسپی لی اور ان پر تفصیل سے لکھا۔ مغل عہد کے یوروپی سیاحوں میں منوچی، ولیم فنچ، ٹیورنیر، ٹیری، ولیم ہاکنس، ٹامس رو اور برنیئر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ جنہوں نے مغل ہندوستان کے بارے میں اہم معلومات فراہم کی ہیں۔ برنیئر اور ٹامس رو کے سفر نامے معاشی سرگرمیوں سے واقفیت کے لیے انتہائی گراں قدر اور اہم ہے۔اس طرح غیر ملکی سیاحوں کے احوال میں سولہویں اور سترہویں صدی میں ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالت پر بہت تفصیل موجود ہے۔ اس تفصیل کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ ہندوستان کی تاریخ نویسی میں لوگوں (عام لوگوں) کی حالت کے بارے میں کوئی خاص تفصیلات نہ دینے کا رجحان پایا جاتا ہے اور تاریخ صرف عظیم شخصیات کی سرگرمیوں کے گرد مرکوز تھی۔

16.20 کلیدی الفاظ (Keywords)

رسد	:	جنگی ساز و سامان
ستی	:	ہندو عقیدے کے مطابق شوہر کے انتقال کے بعد اگ میں جل کر مرنے کی رسم
بلند دروازہ	:	گجرات کی فتح کی یادگار کے طور پر اکبر بادشاہ کے ذریعہ فتح پور سیکری میں بنوایا دروازہ
فرسکو	:	چھوٹی تصویریں
زری	:	کپڑوں پر سنہرے تاروں کا کام
زربفت	:	قیمتی پوشاک
تول دان	:	بادشاہ کو روپئے پیسے میں تول کر اس رقم کو عوام میں تقسیم کرنا
سرکنڈہ	:	پانی کے کنارے اگنے والا ایک پودا
بینت	:	لکڑی کی ایک قسم
قلعی	:	برتنوں کو چمکدار بنانا۔
ہندوی	:	اردو کی ابتدائی شکل

16.21 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

16.21.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. اینتھونی مونسریٹ کہاں کا رہنے والا سیاح تھا؟
2. رولف فیچ کس مغل بادشاہ کے عہد میں ہندوستان آیا تھا؟
3. ولیم ہاکنس کہاں کون سا جہاز لے کر ہندوستان آیا تھا؟
4. جہانگیر کے عہد میں ہندوستان آنے والے کسی پرتگالی سیاح کا نام بتایئے۔
5. تھامس رو کون تھا؟
6. پیٹر منڈی کہاں کا رہنے والا تھا؟
7. اسٹوریادی موغور کس کی لکھی کتاب ہے؟
8. اورنگ زیب کے دور میں ہندوتان آنے والے کسی ایک سیاح کا نام بتایئے۔
9. ٹریولس ان مغل انڈیا کس کی تصنیف ہے؟
10. ٹیورنیر کس پیشے سے منسلک تھا؟

16.21.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. اینتھونی مونسریٹ کون تھا اور وہ اکبر کے دربار میں کیسے پہونچا تھا؟
2. رالف فیچ نے اکبر کے دورِ حکومت کے بارے میں کیا لکھا ہے؟
3. ٹیری نے مغل عہد میں عورتوں کے پہناوے کے بارے میں کیا بتاتا ہے؟
4. تھامس کورات پر ایک نوٹ لکھیے۔
5. پیٹرڈیلا دیلا کون تھا؟ وضاحت کریں؟

16.21.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. مونسریٹ اکبر کے عہد کے بارے میں کیا بتاتا ہے وضاحت کریں؟
2. برنیئر کے سفر نامہ کا خلاصہ بیان کریں؟
3. ٹیورنیر کے سفر نامے کی اہمیت کا جائزہ لیں؟

16.22 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

فوسٹر : ارلی ٹریویلس ان انڈیا

ایڈورڈ ٹیری : اے ویوگا ٹو ایسٹ انڈیا

برنئیر : ٹریولس ان مغل انڈیا

نمونہ پرچہ امتحان

نظامت فاصلاتی تعلیم Directorate of Distance Education

ماسٹر آف آرٹس Master of Arts

Subject Code : MAHS103CCT

Paper III : Historiography: Ancient and Medieval World

پرچہ سوم: تاریخ نویسی: قدیم اور وسطی دور کی دنیا

1st Semester Examination ، پہلا اسمسٹر امتحان

نشانات : 70 Marks : 70 وقت : 3 گھنٹے Time : 3 hours

ہدایات

یہ پرچہ سوالات تین حصوں پر مشتمل ہے: حصہ اول، حصہ دوم، حصہ سوم۔ ہر جواب کے لیے لفظوں کی تعداد اشارۃً ہے۔ تمام حصوں سے سوالوں کا جواب دینا لازمی ہے۔

1۔ حصہ اول میں 10 لازمی سوالات ہیں جو کہ معروضی سوالات ہیں۔ ہر سوال کا جواب لازمی ہے۔ ہر سوال کے لیے 1 نمبر مختص ہے۔ (1 0 x 1 =10 Marks)

2۔ حصہ دوم میں 8 سوالات ہیں۔ اس میں سے طالب علم کو کوئی پانچ سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کا جواب تقریباً دو سو (200) لفظوں پر مشتمل ہے۔ ہر سوال کے لیے 6 نمبرات مختص ہیں۔ (5x6=30 Marks)

3۔ حصہ سوم میں پانچ سوالات ہیں۔ اس میں سے طالب علم کو کوئی 3 سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کا جواب تقریباً پانچ سو (500) لفظوں پر مشتمل ہے۔ ہر سوال کے لیے 10 نمبرات مختص ہیں۔ (3x10=30 Marks)

حصہ اول

سوال : 1

i. پہلی بابلی سلطنت میں ہر سال کا نام کس کے اوپر رکھا جاتا تھا۔

ii. ریلیف کسے کہتے ہیں۔

iii. عبرانی صحیفوں میں کتنی کتابوں میں تاریخی معلومات درج ہے۔

iv. مائیسینی تہذیب کہاں واقع تھی۔

v. الیاڈ اور اڈیسی کس کی تصنیف ہیں۔

vi. ابو لفضل کی تصنیف کا نام بتایئے۔

vii. ٹرائے شہر کا ذکر کس کی تصنیف میں کیا گیا۔

viii. اپامیہ کہاں واقع تھا۔

ix. 'سوانح شرفاءروم' کس کی تصنیف ہے۔

x. تھوسی ڈائڈیز کی تصنیف کا کیا نام ہے۔

حصہ دوم

2. ہومر پر ایک مضمون لکھیے۔

3. ہیکاٹس پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

4. مختصر وقائع نگار کون تھے، بیان کیجیے۔

5. تھوسی ڈائڈیز کے بارے میں بتایئے۔

6. پلوٹارک پر ایک مضمون لکھیے۔

7. جولیس سیزر پر ایک نوٹ لکھیے۔

8. کرٹیس روفس پر ایک نوٹ لکھیے۔

9. پولی بیس کے بارے میں ایک مضمون لکھیے۔

حصہ سوم

10. ماقبل کلاسیکی یونان میں تاریخ نویسی کے پس منظر پر ایک تفصیلی مضمون قلمبند کیجیے۔

11. یونانی تاریخ نویسی پر اثرات کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔

12. ہیروڈوٹس کی تاریخ نویسی کی خصوصیات بیان کیجیے۔

13. لیوی کے بارے میں ایک تفصیلی مضمون قلمبند کیجیے۔

14. ٹیسی ٹس کے بارے میں ایک تفصیلی مضمون قلمبند کیجیے۔

اہم نکات